دل کی گہرائیوں سے عرش کی بلندیوں تک ....ایک سفر

کشف المودّة

سید باقر نثار زیدی

نام کتاب	کشف المودّۃ
مؤلف	سید باقر نثار زیدی
ناشر	سید باقر نثار زیدی
کمپوزنگ	سید آفتاب حسین رضوی
ٹائٹل ڈیزائننگ	سید صفدر عباس زیدی
طبع اوّل	جنوری ۲۰۰۸ء
قیمت	Rs. 120
موبائل نمبر	0333-2120721
ملنے کا پتہ	علمدار بک ڈپو۔امام بارگاہ شہدائے کربلا۔انچولی کراچی
	اسد بک ڈپو۔قدمگاہ مولا علی۔حیدرآباد
	کوہاٹ بک سینٹر۔کوہاٹ
	القائم بک ڈپو۔بالمقابل امام بارگاہ بھون روڈ۔چکوال
	بخاری بک ڈپو۔کروڑ لال عیسن۔لیہ

سید عمران حیدر نقوی۔راولپنڈی ۔موبائل نمبر 0333-5231475

ہدیہ

میں اس ادنیٰ کوشش کو ہدیہ کرتا ہوں

''قُربیٰ'' کی بارگاہِ اقدس میں

جو مرکزِ مودت اور معدنِ عصمت ہیں

جو اللہ کا وہ راز ہیں جو افشاء ہو نہیں سکتا

جو اللہ کا وہ روپ ہیں جو سوائے علیؑ کے کسی پر نہ کھلا

جو ایسی مظلومہ ہیں جنکو اس امت نے دکھوں اور آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دیا

اس التجاء کے ساتھ کہ وہؑ قیامت تک تمام مومنین و مومنات پر اپنی چادرِ رحمت کا سایہ قائم رکھیں اور بروزِ محشر ہم سب کو اپنے مظلوم بیٹے کے ماتم داروں اور عزاداروں کے ساتھ اٹھائیں۔ وہ ماتم دار اور وہ عزادار جن میں تمام انبیاءؑ و اوصیاءؑ و اولیاءؑ و ائمہؑ شامل ہیں۔

انتساب

اس کتاب کا انتساب میرے پیاروں کے نام۔
جن میں میرے اہلِ خانہ، میرے احباب اور ہر وہ مومن شامل ہے جو محبتِ اہلبیتؑ
میں کسی غیر کو شریک نہ کرتا ہو۔

ماخذ

کتاب	مولف
القرآن الحکیم	
تفسیر المتقین	سید امداد حسین کاظمی
اصولِ کافی	محمد بن یعقوب کلینی
معجزاتِ آلِ محمدؐ	محمد ہاشم البحرانی
مناقبِ امیرالمومنینؑ	محمد ہاشم البحرانی
معانی الاخبار	شیخ صدوق
جامع الاخبار	شیخ صدوق
التوحید	شیخ صدوق
علل الشرائع	شیخ صدوق
عیونِ اخبار الرضاؑ	شیخ صدوق
الخصال	شیخ صدوق
کمال الدین وتمام النعمہ	شیخ صدوق
تفسیرِ نور الثقلین	عبد علی بن جمعۃ
تجلیاتِ حکمت	سید اصغر ناظم زادہ قمی
نہج الاسرار	غلام حسین رضا آقا

ماخذ

کتاب	مولف
حکمتِ بوتراب ؑ	علامہ آمدی
تفسیرِ فرات	فرات بن ابراہیم کوفی
القطرۃ من بحار	سید احمد مستنبط
محبت	محمدی رے شہری
نہج البلاغہ	سید رضی شریف
ریاض القدس	آقائی صدر الدین قزوینی
عروج السعادت	ملّا احمد نراقی
آئینۂ معرفت	سید اعجاز حسین اعجاز
انوارِ قرآنی	محمد ہادی معرفت
کوکبِ درّی	سید محمد صالح کشفی ترمذی
ینابیع المودۃ	شیخ سلیمان قندوزی
بحار الانوار	محمد باقر مجلسی

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

فہرستِ مضامین

دیارِ محبت

ایک وسیع وعریض میدان تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔میں نے اُس میدان میں خود کو ایک ذرّے کی صورت میں پایا،ایک ایسا ذرّہ جسے چند لمحوں کیلئے قوتِ باصرہ،قوتِ سامعہ، قوتِ تکلم،قوتِ عقلیہ اور قوتِ فیصلہ عطا کردی گئی تھی۔مجھ جیسے لاتعداد ذرّے وہاں موجود تھے جن سے وہ میدان پاٹوں پاٹ بھرا ہوا تھا اور تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ تمام ذرّے حیران تھے کہ وہ کون ہیں اور انہیں یہاں کیوں جمع کیا گیا ہے۔پھر سننے میں آیا کہ ہم سب وہ ہیں جنہیں کسی نہ کسی زمانے میں ذرّیتِ آدمؑ سے نکال کر ایک کرۂ زمین پر بھیجا جائے گا۔کیوں بھیجا جائے گا؟،یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔پھر اطلاع آئی کہ ہم سے کوئی عہدو پیان لیا جانے والا ہے اور اُسی عہد کی پاسداری کیلئے ہمیں دنیا میں بھیجا جائے گا اور اسی ایفائے عہد پر ہمیں جانچا اور پرکھا جائے گا اور اسی پر ہماری جزا موقوف ہوگی۔اس عہد کے بارے میں ہر ذرّہ اپنی اپنی بساط کے مطابق رائے زنی کررہا تھا اور پورا میدان ان کی بھنبھناہٹ سے گونج رہا تھا کہ اچانک ایک آواز بلند ہوئی جس کی ہیبت سے سانسیں رک گئیں،نظریں جھک گئیں اور دل کسی کنویں میں لٹکی ہوئی رسّی کیطرح تھرتھرانے لگے۔کوئی تھا جو کہہ رہا تھا۔ **"الستُ بربکم"**۔دلوں نے گواہی دی اور زبانوں سے بے ساختہ نکلا کہ "ہاں!

تُو ہی ہمارا رب ہے''۔ اُس آواز میں ہیبت و جبروت کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی محبوبیت تھی کہ پلکیں خودبخود اُٹھتی چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ نگاہوں کو خیرہ کرتا ہوا اک پیکرِ جمال سامنے تھا۔ جلال و جمال کے اس حسین امتزاج نے دلوں کو بے خود کر دیا اور آنکھیں اس پر کچھ اس طرح ٹھہریں کہ پلکیں جھپکنا بھول گئیں اور ہر نظر بھیک مانگنے لگی کہ ''اے خالقِ حُسن! ایک نظر اِدھر بھی''۔ تب اُس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور یہی وہ لمحہ تھا جب میری قوتِ عقلیہ نے اس نظر کو تخمِ محبت جان کر قبول کیا اور میری طینت میں بو دیا۔ تب میرے کانوں میں کسی نے سرگوشی کی۔ ''تجھے مبارک ہو! اب علم سے اس تخم کی آبیاری کرنا، ایمان کے ذریعے اس کی حفاظت کرنا اور معرفت کے ذریعے اسے پروان چڑھانا اور جب یہ درخت پھل دینے لگے تو سمجھنا کہ تمھیں میری قربت مل گئی کیونکہ شجرِ محبت کا پھل قربِ محبوب ہی ہوا کرتا ہے''۔ اُس کے جمال اور اس کی دلپذیر آواز میں ایک نشہ تھا جو میرے پورے وجود میں اترتا چلا گیا اور آج بھی یہ نشہ میری روح اور میرے بدن میں گھلا ہوا ہے۔ نشے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عقل کو معطّل کرتا ہے لیکن یہ نشہ ایسا ہے کہ جتنا جتنا گہرا ہوتا چلا جائے گا اتنی اتنی عقل بھی نکھرتی چلی جائے گی۔

جُرمِ گویائی

دل اور زبان میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے اکثر و بیشتر دل کی بات زبان پر

آجایا کرتی ہے۔ لیکن محبت کی تو بات ہی کچھ اور ہے جیسا کہ میرے مولا امیرؑالمومنین نے فرمایا۔ "انسان جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کا بہت زیادہ ذکر کرتا ہے"۔ ایک محبت کرنے والے کیلئے دل کی بات دل تک محدود رکھنا اکثر حالات میں ناممکن ہوتا ہے۔ عام زندگی میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ مبتلائے محبت شخص جہاں بھی بیٹھتا ہے اپنے محبوب ہی کا ذکر کرتا ہے، چاہے سامنے والا محرمِ راز ہو یا نہ ہو، اس کی بات میں دلچسپی لے رہا ہو یا نہ لے رہا ہو، اس کی بات کو غور سے سن رہا ہو یا نہ سن رہا ہو۔ یہ اُس صورت میں ہوتا ہے جبکہ اس کا محبوب ایک حسنِ عارضی وفانی ہوتا ہے۔ پھر بھلا وہ شخص جس کا محبوب جمالِ ازلی وابدی کا مالک ہو، کیونکر اپنی زبان پر تالے ڈال سکتا ہے؟۔ وہ تو اگر خاموش بھی رہے تب بھی س کا رُواں رُواں اعلانِ محبت کرتا رہے گا۔ لیکن علیؑ کے چاہنے والوں کے لئے جہاں اور امتحانات ہیں وہیں ایک کڑا امتحان یہ بھی ہے کہ وہ ہر کس و ناکس کے سامنے اپنی محبت کو بیان نہیں کر سکتے۔ محبت دلیل سے ماوراء ہے لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم جب اپنی کیفیاتِ محبت بیان کرتے ہیں یا تحریر کرتے ہیں تو ہمیں لازماً دلیل کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اس دنیا کے اندھے بہرے گونگے لوگ محبت کو بھی "دو اور دو چار" کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر جنابِ امیرؑالمومنین نے فرمایا۔ "عاقل کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کبھی ایسی چیز کے بارے میں بات نہیں کرتا جس میں اسے

جھٹلا دینا ممکن ہو"۔ (تجلیاتِ حکمت صفحہ ۳۴۲)۔اسی لے جو لوگ کتابوں کو فقط لذّتِ ذہنی حاصل کرنے کیلئے پڑھتے ہیں انہیں شاید ہماری مجبوریوں اور مشکلات کا احساس نہ ہو سکے لیکن جو صاحبانِ نظر ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ علیؑ پر گفتگو کرنا کانٹوں پر چلنے سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ ڈر رہتا ہے کہ کسی کم ظرف کا پیالہ چھلک نہ جائے اور یہ احساس بھی رہتا ہے کہ بلند حوصلہ لوگ پیاسے نہ رہ جائیں۔ کتنا مشکل ہے اظہارِ محبت کرنا !اور کتنا بے بس ہوتا ہے ایک محبت کرنے والا !

درد ایسا ہے کہ اظہار کے رستے ڈھونڈے
بات ایسی ہے کہ خود سے بھی چھپالی جائے

ادراک بیان سے پہلے ہے۔یعنی پہلے ادراکِ حقیقت کرنا ہوتا ہے اور نہ صرف ادراک بلکہ اُن رموز کو سمجھنا پڑتا ہے جو اس حقیقت میں مضمر ہوتے ہیں اور اس کیلئے عقل کے ساتھ ساتھ فہم کی ضرورت پڑتی ہے جیسا کہ امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں۔"ایک ایسی روایت جسے اچھی طرح سمجھ لو اور اس کی گہرائی تک علم حاصل کرلو، وہ ایسی دس روایتوں سے بہتر ہے جسے فقط نقل کرو۔ بے شک ہر حق کیلیے ایک حقیقت اور ہر سچ کیلئے ایک نور ہے۔خدا کی قسم ہم اپنے شیعوں میں سے کسی ایک کو بھی اس وقت تک فقیہ(گہری سمجھ رکھنے والا) نہیں سمجھتے جب تک وہ ہماری گفتگو کے رموز نہ سمجھ لے اور ہمارے مقصد کو حاصل نہ کرلے۔ (القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۸۶)۔اور ادراک حقیقت کیلئے کسی ایک شخص یا کسی ایک گروہ تک خود کو محدود کرلینا انسان کو نیم

حکیم بنا دیتا ہے اور وہ کبھی بھی ترقی کے زینے پر قدم نہیں رکھ سکتا اور اسی بات کو ائمہؑ معصومین نے انتہائی تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے جیسے امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

''حکمت مومن کا گمشدہ خزانہ ہے۔ مومن کو چاہیئے کہ اسے حاصل کرے چاہے منافق سے ہی کیوں نہ لینا پڑے''۔ اس سلسلے میں مزید دو احادیث آپ کی خدمت میں ہدیہ کی جارہی ہیں جس کے بعد ہم سلسلۂ کلام کو آگے بڑھائیں گے۔

۱۔ القطرۃ من بحار۔ ج ۴ صفحہ ۲۰۶ ۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:۔

''جو کوئی بھی اچھی بات کرے اسے محفوظ کرلو، اگر چہ کہنے والا خود اس پر عمل نہ کرتا ہو''۔

۲۔ حکمتِ بوتراب ج ۲ صفحہ ۶۲ ۔ حضرتِ امیرؑ المومنین نے فرمایا:۔

''اللہ کی خاطر اس سے محبت کر جو دین کی اصلاح کیلئے تجھ سے جنگ کرے اور تجھ کو حسنِ یقین عطا کرے''۔

یہ بات واضح ہوگئی کہ ادراکِ حقیقت کیلئے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاک طینت، عقل، فہم اور غور وتدبر۔ جب ان مرحلوں سے گزر کر انسان منزلِ یقین پر پہنچ جائے اُس وقت بیان کی ابتدا ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ انسان بزعمِ خود علم کا پہاڑ بن جائے اور ہزاروں لاکھوں کتابیں چاٹ جائے۔ بلکہ علم اگر چہ تھوڑا ہو لیکن جو چیز معنی رکھتی ہے وہ اس علم پر انسان کا یقینِ کامل ہے۔ یعنی جو کچھ بھی

وہ بیان کرے وہ مکمل یقین کے ساتھ بیان کرے۔ ''میرا خیال ہے''، ''میں سمجھتا ہوں''، ''علماء کہتے ہیں''، یہ ایسے جملے ہیں جن سے کسی بھی بات کی ابتداء کی جائے گی تو وہ بات ہرگز یقینی نہیں ہوگی بلکہ ظنّی اور قیاسی ہوگی۔ آپ کو احساس ہوگیا ہوگا کہ بیان کا پہلا مرحلہ ہی کس قدر مشکل ہے۔ جب ہم اس مرحلے سے گزر جاتے ہیں تو اب ہمیں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ہمارے مخاطب کون ہیں؟۔ جب ہم نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں تین قسم کے لوگ نظر آتے ہیں:۔

۱۔ وہ لوگ جو بد باطن ہیں، کم ظرف ہیں اور ذکرِ اہلبیتؑ سننا ہی نہیں چاہتے۔ ایسے لوگ پہلے ہی اپنا ذہن بنا کر بیٹھے ہوتے ہیں کہ فضیلتِ اہلبیتؑ میں جو بھی کہا جائے گا وہ غلو ہوگا۔

۲۔ وہ لوگ جو اہلبیتؑ سے محبت کرتے ہیں اور ان کا ذکر سننا بھی چاہتے ہیں مگر اُن کے کلیجے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ اپنے آقاؤں کے حقیقی فضائل سن کر برداشت کرسکیں۔ وہ صرف سطحی قسم کے فضائل پر اکتفاء کرلینے والے لوگ ہوتے ہیں۔

۳۔ وہ لوگ جو گہرے سمندروں میں اتر جانے کے عادی ہیں اور ان کی تہ تک پہنچنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سمندر کی تہہ انہیں کبھی نہیں ملے گی لیکن وہ اپنے سفر کو ختم نہیں ہونے دیتے۔

یہ ہیں وہ تین طبقات جن کے سامنے ہمیں اپنا مدعا بیان کرنا ہوتا ہے۔ جو محتاط لوگ ہیں وہی ہماری مشکل کو سمجھ سکتے ہیں کیونکہ آمنے سامنے بات کرنا اور چیز ہے لیکن کتاب

کے بارے میں آپ یہ قید نہیں لگا سکتے کہ فلاں شخص اسے خریدے اور فلاں شخص نہ خریدے کیونکہ ان تینوں طبقات کیلئے احکام جداجدا ہیں۔ پھر ہم کیا کریں؟۔ کس طرح لکھیں کہ تینوں طبقات مطمئن ہوجائیں؟ کون سا اسلوب اختیار کریں کہ اہلبیتؑ کے ساتھ خیانت بھی نہ ہو، احکام کی خلاف ورزی بھی نہ ہو اور پڑھنے والے بھی کسی پریشانی کا شکار نہ ہوں؟۔ اسی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عرضِ مدعا کیلئے ہمیں کیا کیا جتن نہ کرنے پڑتے ہوں گے؟۔ پھر بھی ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ کہیں کہیں ہم سے بے احتیاطی ضرور ہوجاتی ہے جو ہماری محبت کا تقاضا ہے اور اس کا خمیازہ بھی ہمیں بھگتنا پڑتا ہے جب بھانت بھانت کے ٹیلیفون ہمیں موصول ہوتے ہیں لیکن اس بارے میں ہم مجبور ہیں۔ ہماری طاقت سے باہر ہے کہ ہم اپنے محبوب کے لئے ایسے فضائل تجویز کریں جو مخلوق کیلئے بھی جائز ہوں اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارا کریم آقا ہماری بے طاقتی کو دیکھتے ہوئے ہماری معذرت کو قبول فرمائے گا۔

پہلے طبقے کے بارے میں امام جعفر صادقؑ ارشاد فرماتے ہیں۔ ''پروردگارِ عالم منافق اور فاسق میں کبھی تین باتیں پیدا نہیں کرے گا۔ ایک حسنِ سماعت، دوسرے حسنِ فہم اور تیسرے حسنِ خُلق'' (الخصال صفحہ ٦٩)۔ لہٰذا جس شخص میں نہ تو سننے کی صلاحیت ہے اور نہ سمجھنے کی تو ایسے آدمی کے سامنے حقائق بیان کرنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے بلکہ الٹا دشمنی مول لینا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو نااہل کہا جاتا ہے جن کے سامنے حقائق کے موتی بکھیرنے کی ممانعت کی گئی ہے جیسا کہ جناب امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔ ''جو

بات معلوم نہ ہو وہ نہ کہو بلکہ ہر معلوم بات بھی نہ کہو''۔ (تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۲۶۲)

ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہماری تحریرات کے مخاطب ایسے لوگ ہرگز نہیں ہوتے۔ وہ اگر ہماری کتابیں پڑھتے ہیں تو اپنی ذمہ داری پر پڑھیں اور ہماری شان میں جو جو قصیدے وہ پڑھنا چاہیں وہ شوق سے پڑھیں، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ ہمارے مولا امیر المومنینؑ نے فرمادیا ہے کہ ''کسی مسلمان کیلئے یہ عیب نہیں ہے کہ وہ مظلوم رہے جبکہ وہ اپنے دین میں شک نہ کرتا ہو اور اپنے یقین کے متعلق شبہ میں مبتلا نہ ہو''۔ (تجلیاتِ حکمت صفحہ ۲۵۸)

دوسرے طبقے کے سلسلے میں بڑا محتاط رویہ رکھنا پڑتا ہے۔ انہیں آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم اوپر لانا پڑتا ہے، سمجھانا پڑتا ہے۔ ان سے ضد نہیں کی جاتی۔۔ ائمہ طاہرینؑ نے بھی ایسے لوگوں کو بڑے پیار اور نرمی سے سمجھایا ہے جیسا کہ القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۳۹ پر امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''جب بھی تو ہمارے امر میں سے کوئی چیز سنے اور تیرا دل اسے قبول کر لے تو اللہ کی حمد بجالایا کرو۔ اور اگر تمھارا دل انکار کردے تو اسے ہماری طرف پلٹا دیا کرو (اور کہا کرو کہ وہ خود بہتر جانتے ہیں) اور یہ نہ کہا کرو کہ یہ حدیث کس طرح جاری ہوئی تھی؟۔ کیسے تھی؟۔ اور کس طرح ہے؟۔ کیونکہ ایسا کرنا ہمارے کلام کو رد کرنے کے مترادف ہے اور خدا کی قسم یہ خداوندِ عظیم کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ اور یہ سب اہلبیتؑ کے اسرار کی بلندی اور عظمت کی خاطر ہے''۔ چنانچہ ایسے لوگوں کو کوئی بھی

بات سن کر جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے اور وہی کرنا چاہیئے جو امامؑ نے فرمایا ہے۔
تیسرا طبقہ عظیم لوگوں پر مشتمل ہے اور یہاں ہر احتیاط معدوم ہو جاتی ہے اور ان سے کوئی بات چھپانا جرم قرار پاتا ہے اور زبان کو اذنِ گویائی مل جاتی ہے۔ اس موقع کیلئے جنابِ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔ ''علم وہ شجر ہے جو دل میں اُگتا ہے اور زبان پر پھل دیتا ہے''۔ (حکمتِ بوتراب ج ا صفحہ ۳۵۵)۔ ظاہر ہے کہ جو درخت پھل نہ دے وہ بے فیض کہلاتا ہے لہٰذا ایسے لوگوں کے سامنے خاموش رہنا اپنے علم کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ امام جعفر صادقؑ نے سورۂ بقرہ کی آیت **''ومما رزقناھم ینفقون''** کے بارے میں فرمایا۔ ''اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ہم نے جو انہیں علم عطا کیا ہے وہ اسے پھیلاتے ہیں''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ا صفحہ ۲۷)۔ نیز مولا امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے کہ ''علم کا چھپانے والا درحقیقت اپنے علم کی صداقت پر یقین نہیں رکھتا''۔ (حکمتِ بوتراب ج ا صفحہ ۲۶۲)
ہم نے اپنی عملی دشواریاں کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیں۔ ہماری مجبوری ہے کہ ہر بات ہم کھُل کر بیان نہیں کر سکتے اور امید رکھتے ہیں کہ ہماری اس معذرت کو قبول کیا جائے گا۔

محبت کی تعریف

قدیم فلاسفہ اور صاحبانِ تصوف نے محبت کے موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن میں کبھی

بھی ان سے متفق نہیں رہا کیونکہ ان کا بیان وارداتی نہیں بلکہ اختراعی ہے۔ ہر شخص ایک نیا نظریہ ایجاد کرتا ہے اور لفظِ ''محبت'' سے کھیلتا ہے۔ بات ایسی ہونی چاہیئے جو لوگوں کی سمجھ میں آئے کیونکہ ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملے گا جو جذبۂ محبت سے خالی ہو۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ محبت کے ان پردوں کو اٹھایا جائے جن کیوجہ سے انسان اس کی حقیقتوں کا صحیح ادراک نہیں کر پاتا اور اس بیش بہا جنس کو اپنی خواہشاتِ نفسانی کی بھینٹ چڑھاتا رہتا ہے۔ جب تک محبت کا عقلی تصور اور اس کی صحیح سمت واضح نہیں کی جائے گی اُس وقت تک اس کے فوائد حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

جہاں تک محبت کی تعریف کا تعلق ہے تو انتہائی سادہ لفظوں میں ''کسی کے قرب کی چاہت دل میں پیدا ہونا'' محبت کہلاتی ہے۔ اس کا تعلق براہِ راست عقل سے ہوتا ہے۔ یہ ایک جذبۂ عقلانی ہے نہ کہ جذبۂ حیوانی اور عقل کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کمال کیطرف متوجہ ہوتی ہے، نقص سے وہ ہمیشہ کراہت کرتی ہے لہٰذا جیسے جیسے کمال کے حجابات اٹھتے جائیں گے ویسے ویسے محبت کی شدت بھی بڑھتی جائے گی۔ اس کی ایک عملی مثال چاند اور سمندر کی ہے۔ جیسے جیسے چاند کامل ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے سمندر ایک طوفان کی شکل اختیار کرتا جاتا ہے اور چاند کو چھونے کی تمنا عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ یہی حال عقل کا ہے کہ کمال کو دیکھتے ہی اس میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ابتداء ہے۔ اس کے بعد جیسے جیسے کمال کی معرفت میں

اضافہ ہوتا رہا ہے ویسے ویسے محبت بھی اپنے کمال کو پہنچتی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ محبت صرف وہی کر سکتا ہے جو صاحبِ عقل ہو۔ بے عقل لوگ ہوس رانی کو ہی محبت کا نام دے کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ حکیم جالینوس نے محبت کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''محبت دو عقلمندوں کے درمیان، ان کی عقلوں میں مشابہت کیوجہ سے پیدا ہوتی ہے''۔ یہ ایک ایسا مقولہ ہے جسے سونے کے حروف سے لکھنا چاہیئے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ حکمت کی بات ہے اور دوسرے یہ کہ کلامِ معصومینؑ سے اس کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ حکمتِ بوتراب میں جنابِ امیرؑالمومنین فرماتے ہیں۔ ''صاحبِ عقل اپنے جیسے ہی کو پسند کرتا ہے'' نیز فرمایا۔ ''عقل مند کمال کا طالب ہوتا ہے''۔ اسی کتاب میں ایک مقام پر فرماتے ہیں۔ ''تیسرا دوست بالکل تجھ جیسا انسان ہے مگر یہ کہ وہ تیرے علاوہ کوئی اور ہے''۔ کتاب ''محبت'' میں بھی آپ کا ارشاد محفوظ ہے کہ ''ہر شخص اپنے جیسے ہی کو چاہتا ہے''۔

یہ بات واضح ہوگئی کہ محبت دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔ محبّ کیلئے عقل اور محبوب کیلئے کمال۔ عقل پر گفتگو ہم انشاءاللہ آئندہ صفحات میں کریں گے، یہاں ہم کمال کے بارے میں کچھ اشارات دیتے ہیں۔ زبانِ محبت میں کمال کو حُسن کہتے ہیں اور اس کی چار صورتیں ہیں۔ عدل، حسن، جمال اور لطف سب سے پہلے عدل ہے جس پر باقی تین چیزوں کا دارومدار ہوتا ہے لیکن یہ بذاتِ خود حسن نہیں ہوتا۔ عدل کے معنی ہیں شے کا اپنے محل و مقام پر ہونا۔ پوری کائنات میں آپ جدھر بھی نظر دوڑائیں گے

آپ کو عدل ہی عدل ملے گا لیکن حسن ہر جگہ نہیں ملتا۔ کیونکہ تخلیق کی بنیاد عدل پر ہے نہ کہ حسن پر۔ خود انسان کو دیکھیں تو اس کا ایک ایک عضو اسی مقام پر ہے جہاں اسے ہونا چاہیئے لیکن ہر انسان حسین نہیں ہوتا۔ حسن کا مطلب ہے اجزاء یا اعضاء کا باہمی تناسب جسے انگریزی میں Matching کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے معاشرے میں بڑی آنکھیں حسن کی علامت سمجھی جاتی ہیں اور بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جن کی آنکھیں بڑی ہوتی ہیں اور وہ بہت حسین لگتے ہیں۔ لیکن یہی بڑی آنکھیں اگر کسی اور کے چہرے پر لگا دی جائیں تو عجیب وحشتناک لگیں گی۔ سبب یہ ہے کہ یہ آنکھیں دوسرے شخص کے چہرے سے مناسبت نہیں رکھتی تھیں اسلیئے بری لگنے لگیں۔ جمال اُس حسن کو کہتے ہیں جس کی طرف دل بے ساختہ طور پر کھنچنے لگے اور قابو میں نہ رہے۔ اسی لئے پیغمبرِ اسلام نے اللہ کے لئے لفظِ حسن استعمال نہیں فرمایا بلکہ جمال کا لفظ استعمال کیا۔ چنانچہ تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۳۴۸ پر آپ ارشاد فرماتے ہیں۔ **"اللہُ جمیل ویُحبُّ الجمال"** یعنی اللہ خود صاحب جمال ہے اور جمال سے ہی محبت کرتا ہے۔ اب یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ وہ کون اللہ ہے جو جمیل ہے؟۔ کیونکہ جمال کیلیئے ظاہر ہونا لازمی ہے اور اللہ مرتبۂ اظہار میں آ نہیں سکتا۔ بس جب آپ اُس اللہ کو ڈھونڈ لیں گے تو جمال بھی آپ کو سمجھ میں آ جائے گا اور محبت بھی۔

جمال کے بعد لطف ہے اور یہ جمال کا وہ مقام ہے جہاں سے فیض جاری ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نہ صرف یہ کہ دل کھنچتے ہیں بلکہ سر اور دل دونوں جھک پڑتے ہیں، گردنیں خم ہو جاتی ہیں، دامنِ سوال دراز ہو جاتا ہے، نظریں بھیک مانگنے لگتی ہیں اور نظارۂ جمال کیلئے ہزار زندگیاں بھی کم پڑتی دکھائی دیتی ہیں

سَو بار نگاہوں سے گزر جائے وہ چہرہ
آنکھوں کو مگر حسرتِ دیدار میں رہنا

عدل سے سکون ملتا ہے، حسن کا تقاضا پسندیدگی ہے، جمال محبت کو کھینچتا ہے۔ اور لطف کا مطالبہ مودّت ہے۔ بہت سے لوگ محبت اور مودّت میں فرق کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ شدید ترین محبت کو مودّت کہتے ہیں، ایسی محبت جو وجود کا حصہ بن جائے۔ دوسرے یہ کہ محبت وہ ہوتی ہے جو دل میں ہو اور ضروری نہیں کہ اس کا اظہار بھی کیا جائے۔ جبکہ مودّت وہ ہوتی ہے جو دل میں ہو اور لازماً اس کا اظہار بھی کیا جائے۔ محبت کی ضد بُغض ہے اور مودّت کی ضد عداوت ہے۔ بُغض اُس دشمنی کو کہتے ہیں جو دل میں ہو مگر ظاہر نہ کی جاتی ہو اور عداوت اُس دشمنی کو کہتے ہیں جو دل میں ہو اور اُس کا اظہار بھی کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خطبۂ غدیر میں رسولؐ اللہ نے اللہ سے دشمنِ علیؑ کیلئے بغض نہیں مانگا بلکہ عداوت مانگی اور فرمایا۔ **"وَعادِ مَن عاداہُ"**۔ پروردگار تو اس سے عداوت کرنا

جو علیؑ سے عداوت کرے۔ پس جان لینا چاہیئے کہ جو شخص علیؑ سے بغض رکھے وہ تو ہوسکتا ہے کہ دنیا میں بچ جائے اور آخرت میں جا کر بھگتے۔ لیکن جو علیؑ سے عداوت رکھتا ہے وہ دنیا میں بھی بھگتے گا اور آخرت میں بھی۔

محبت کی ابتداء

یہ ایک انوکھی اور انہونی سی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ محبت کی ابتداء محبّ کی طرف سے ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ محبت کی ابتداء محبوب کرتا ہے جیسا کہ غالبؔ نے کہا

چاک مت کہ جیبِ بے ایامِ گل\
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

جب تک محبوب کیطرف سے اشارہ نہ ہو اور وہ نگاہِ غلط انداز نہ ڈالے اس وقت تک محبت کی چنگاری کبھی نہیں بھڑکتی۔ محبت نہ تو زبان کی محتاج ہے اور نہ یہ کوئی افتادِ ذہنی ہے بلکہ یہ خالصتاً نگاہِ محبوب کا کرشمہ ہے۔ حکمتِ بوتراب حصہ اوّل صفحہ ۳۸۱ پر جناب امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''ذکر نہ تو زبان کا وظیفہ ہے اور نہ ہی فکر کی نہج۔ بلکہ یہ اوّل ہے مذکور کی طرف سے اور ثانی ہے ذاکر کی طرف سے''۔

میرے اکثر نوجوان قارئین ایسی عبارات پڑھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اسلئے ضروری ہے کہ ان کیلئے میں اس فرمان کی مختصر سی وضاحت کر دوں۔ یہاں ذکر سے مراد محبت

ہے کیونکہ ذکر کے معنی ہی ''یادؔ'' کے ہیں اور یاد اسے ہی کیا جاتا ہے جس سے محبت ہو۔ مذکور سے مراد محبوب اور ذاکر سے مراد محبّ ہے۔ آپؑ ارشاد یہ فرما رہے ہیں کہ محبت نہ تو کسی کے بارے میں باتیں کر کے کی جا سکتی ہے اور نہ کسی کے بارے میں سوچنے سے محبت کی جا سکتی ہے بلکہ جب تک محبوب محبت بھری نگاہ نہ ڈالے اس وقت تک محبت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا ہمیں جو اہلبیتؑ سے محبت کرنے کا حکم ہے تو اِس حکم کو بجالانے کیلئے بھی ہم اہلبیتؑ کے محتاج ہیں اور بغیر اُن کی مدد کے ہم ان سے محبت نہیں کر سکتے۔ **ایّاکَ نعبُدُ و ایّاکَ نستعین** کا یہی مطلب ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب محبت کی ابتداء محبوب کرتا ہے تو محبّ میں بھی کوئی نہ کوئی کمال یعنی حسن کا کوئی نہ کوئی عنصر ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ محبت ہمیشہ کمال سے ہوتی ہے۔ محبّ کے کمال کے بارے میں آخر کتاب میں عرض کیا جائے گا۔ یہاں صرف ایک کمال کے بارے میں عرض کیا جا رہا ہے اور وہ ہے طہارتِ ولادت۔ ہمارے محبوب کی نگاہ صرف اسی پر پڑتی ہے جو طاہر الولادت ہو۔ خبیث الولادت پر ان کی نگاہ پڑتی ہی نہیں اور طاہر الولادت ہونے کا تعلق صرف اور صرف، میں پھر دھراتا ہوں، صرف اور صرف میرے محبوب، میرے مولا، میرے مالک علیؑ ابن ابی طالبؑ سے ہے۔ اسی لئے میں اعلانیہ طور پر کہتا ہوں کہ میں علیؑ ہی کا بندہ ہوں، علیؑ ہی کا محبّ ہوں اور علیؑ ہی کے دیدار کا پیاسا ہوں۔ مجھے

موت سے محبت ہے، مجھے قبر سے محبت ہے، مجھے میدانِ حشر سے محبت ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہی وہ منازل ہیں جہاں میری عمر بھر کی پیاس بجھائی جائے گی۔

بے حجابانہ چلے آؤ کہ تنہا ہوں میں
اب نہیں کوئی نظارے میں در آنے والا

صرف اور صرف

شاید کچھ لوگ سوچ رہے ہوں کہ میں نے جذبات سے مغلوب ہوکر ''صرف اور صرف'' کی بات کی ہے لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے پوری ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ یہ بات زبان سے نکالی ہے۔حلالی ہونے کیلئے کسی اور کی محبت شرط نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف علیؑ کی محبت شرط ہے کیونکہ محبتِ علیؑ کے بغیر ہر محبت باطل ہے اور ایک ڈھونگ کے سوا کچھ نہیں۔لیکن جب علیؑ سے محبت کر لی تو گویا سب سے محبت کر لی۔

سید مرتضٰی حسین اصفہانی نے اپنی کتاب ''نگرشِ وحی برامامت وولایت در مجموعِ قرآن'' میں حضرتِ سلمانؓ کا ایک واقعہ درج کیا ہے جو آپ کیلئے ہدیہ کیا جارہا ہے اور یہ واقعہ ''صرف اور صرف'' پر دلیل ہے:۔

''ایک دن حضرتِ سلمانؓ فارسی رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر تھے۔آپ نے کہا کہ یارسولؐ اللہ ایک بات مجھے بہت پریشان کرتی ہے۔کیا میں آپ سے سوال کرسکتا

ہوں؟۔ جنابِ ختمی مرتبتؐ نے اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت سلمانؓ نے کہا۔ ''یا رسولؐ اللہ! بعض اوقات ہم لوگوں کے مجمعے میں بیٹھے اللہ کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اُس مجمعے میں اللہ کے دشمن موجود ہیں۔ لیکن ہماری زبان سے اللہ کا ذکر سن کر وہ اپنے چہرے سے ناگواری کے آثار ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اور یا رسولؐ اللہ! کبھی ہم لوگوں کے درمیان بیٹھ کر آپؐ کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اس مجمعے میں آپؐ کے دشمن موجود ہیں۔ لیکن ہماری زبان سے آپؐ کا ذکر سن کر وہ اپنے چہرے سے ناگواری کے آثار ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ لیکن یا رسولؐ اللہ! جب ہم کسی ایسے مجمعے میں علیؑ کا ذکر کرتے ہیں جہاں علیؑ کے دشمن موجود ہوں تو ہماری زبان سے علیؑ کا ذکر سن کر وہ اپنا غصہ اور ناگواری چھپانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟''۔ یہ سن کر آنحضرتؐ اُٹھے اور اٹھ کر جنابِ سلمانؓ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا۔ ''اے سلمانؓ! یاد رکھو۔ اللہ کا دشمن حلالی ہو سکتا ہے، جیسا کہ فرعون تھا۔ اور اے سلمان! میرا دشمن بھی حلالی ہو سکتا ہے، جیسا کہ ابولہب تھا۔ لیکن علیؑ کا دشمن حلالی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اُنؑ کو دشمن رکھنے کیلئے تو حرامی ہونا شرطِ لازمی ہے''۔

مجاز اور حقیقت

کسی بھی حقیقت کو پانے کیلئے مجاز کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ یہ ایک آفاقی اصول ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مجاز ایک سیڑھی ہے جس کے ذریعے حقیقت تک پہنچا جاتا

ہے۔ مثلاً اگر آپ کو ایک گھر بنانا ہو تو پہلے کاغذ پر اس کا نقشہ بناتے ہیں جو پنسل سے بنایا ہوا ایک مکمل گھر ہوتا ہے۔ اسے مجاز کہتے ہیں۔ پھر اس مجاز کی مدد سے آپ حقیقی گھر بناتے ہیں۔ حقیقی محبت تک پہنچنے کیلئے بھی ایک مجاز کی ضرورت ہے اور وہ مجاز اس دنیا میں ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت ہے۔ ماں باپ کی محبت۔ بھائیوں بہنوں کی محبت، بیوی بچوں کی محبت اور دوست احباب کی محبت۔ پوری دنیا اسی مجازی محبت پر قائم ہے۔ اگر یہ جذبۂ محبت نہ ہوتا تو نسلِ انسانی منقطع ہو جاتی اور دنیا برباد ہو کر رہ جاتی۔ جب مجاز میں اتنی طاقت ہے تو حقیقت میں کتنی طاقت ہوگی؟۔ اللہ نے بھی انسان کو مجازی محبت کا ذائقہ اسی لئے چکھایا ہے تاکہ وہ عملاً اس کیفیت سے گزرے، ہجر و فراق کی اذیتیں جھیلے، وصل و وصال کے خوشگوار لمحات کا لطف اٹھائے، انتظار کی جان لیوا کیفیت کو اپنے اوپر طاری ہوتے دیکھے اور پھر خود اس بات کا اندازہ لگائے کہ جس حقیقی محبت کا وہ مدعی ہے، کیا اس میں وہ ان تمام کیفیات و محسوسات سے دوچار ہوتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کسی مقام پر وہ کسی کمی کا ادراک کرتا ہے تو پھر اُس کمی کو پورا کرنے کیلئے بھرپور کوشش کرے کیونکہ مقصدِ حیات محبتِ حقیقی ہے نہ کہ محبتِ مجازی۔ جو لوگ مجاز میں ہی گم ہو کر رہ جاتے ہیں ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو کاغذ پر نقشہ بنانے میں اپنی عمرِ عزیز صرف کر دے اور پھر یہ سمجھ لے کہ میرا گھر بن گیا۔ یہ جان لیجئے کہ چونکہ مجاز فانی ہوتا ہے اسلئے دنیا کا ہر حسن اور ہر محبت بھی فانی ہوتی ہے۔ اور چونکہ حقیقت ازلی و ابدی ہوتی ہے اس لئے حقیقی حسن اور حقیقی محبت بھی

لا فانی ہوتی ہے۔اس پر زمانہ طاری نہیں ہوتا اسلئے یہ نہ کبھی پرانی ہوتی ہے اور نہ بوسیدہ ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ تر وتازہ رہتی ہے بلکہ ان کی قوتِ نمو میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اور یہ ایک نہ ختم ہونے والا سفر ہے۔

تصور

دین ہو یا دنیا، محبت کیلئے تصور ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بغیر تصور کے نہ تو کسی کی عبادت کی جاسکتی ہے اور نہ محبت۔ پرانی کہانیوں میں ہوا کرتا تھا کہ ایک ملک کے شہزادے نے کسی اور ملک کی شہزادی کے حسن و جمال کی شہرت سنی اور بغیر اسے دیکھے ہوئے اس پر عاشق ہوگیا۔ یہ باتیں جھوٹ نہیں ہیں۔ دنیا میں ایسا ہوتا ہے اور اس کی بنیاد تصور ہوتا ہے۔ وہ اپنے تصور میں اُس شہزادی کی ایک تصویر بناتا ہے اور پھر اُس تصور سے محبت کرتا ہے۔ لیکن ہم لوگوں کے لئے ایک نرالی مشکل آڑے آتی ہے کیونکہ جس اللہ سے ہمیں محبت کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ نہ تو ہمیں نظر آتا ہے، نہ ہمارے دیگر حواس کی قید میں آتا ہے اور نہ ہی اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس سے محبت کرنا ہمارے لئے ناممکن بن جاتا ہے۔ تو پھر اللہ نے ہمیں حکم ہی کیوں دیا؟ کیونکہ وہ تو کسی کو اس کی طاقت سے بڑھکر تکلیف دیتا ہی نہیں؟۔ ہماری اسی مجبوری کے پیشِ نظر اللہ نے اپنے نفس کو پیکرِ بشری میں زمین پر بھیجا اور فرمادیا کہ ''اے میرے بندو! اگر تم صورت سے محبت کرتے ہو تو دیکھو یہ

ہے میرا چہرہ۔ اگر تم آواز سے محبت کرتے ہو تو دیکھو یہ ہے میری زبان۔ اگر تم مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہو تو دیکھو یہ ہے میرا کان۔ اور اگر تم میری قربت چاہتے ہو تو سمجھ لو کہ یہ ہے میرا پہلو"۔ اب ہمارے لئے ہر چیز آسان ہو گئی۔ اطاعت بھی۔ عبادت بھی اور محبت بھی۔ اب علیؑ کا تصور کرو اور نماز پڑھو۔ اس موہنی صورت کو تصور میں لاؤ اور دل کی ساری باتیں اس سے کہہ ڈالو۔ اس کے دامن کا تصور کرو اور اپنے سارے آنسو اس کی نذر کر دو۔ اس کیفیت میں جینے کا اصل مزا آتا ہے کیونکہ تصور ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ یہ ہجر اور وصال کا سنگم ہے۔ جب آپ کسی کا تصور کرتے ہیں تو بیک وقت آپ اس سے قریب بھی ہوتے ہیں اور دور بھی اور یہ ایسے طلسماتی لمحات ہوتے ہیں جو ہزاروں زندگیوں پر بھاری ہوتے ہیں۔

مجھ سے میرے ایک بھائی نے سوال کیا کہ "ہم نے تو اپنے مولاؑ کو دیکھا ہی نہیں، پھر ہم ان کا تصور کیسے کریں؟"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تصور تین طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ تصورِ جسمانی، احساسِ موجودگی اور احساسِ جدائی۔ تصورِ جسمانی وہ ہوتا ہے جس کی ایک صورت ہم نے ابتدائے بیان میں عرض کی تھی۔

ہر شخص اپنے اپنے ذوقِ جمال کے مطابق اپنے محبوب کا تصور کرتا ہے اور اپنی نظروں کی پیاس بجھاتا ہے۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مولاً واقعتاً ایسا نہیں تھا جیسا اس نے سوچا ہے لیکن چونکہ ان کا پیکرِ بشری قابلِ تصور ہے اس لئے انسان اُن کو

دیکھے بغیر بھی اپنے تصور میں لاسکتا ہے اور ہجر و وصل کی کیفیات کو محسوس کرسکتا ہے۔
دوسری صورت احساسِ موجودگی ہے۔ یعنی انسان یہ محسوس کرے کہ میرا محبوب میرے ساتھ ہے جیسا کہ مومنؔ نے کہا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس کیفیت کو ائمہ طاہرین نے بھی بیان فرمایا ہے جیسا کہ تجلیاتِ حکمت صفحہ ۱۹۸ پر امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''محبوب کی یاد محبوب کے ساتھ بیٹھنے کی طرح ہے''۔
اسی طرح ''محبت'' صفحہ ۱۱۳ پر امیرؑ المومنین کا ارشاد ہے:۔
''اللہ اپنے دوستوں کیلئے ایسا ہی ہے جیسے شرابِ طہور۔ جو اسے پی لیتے ہیں تو مست ہوجاتے ہیں، اور جب مست ہوجاتے ہیں تو طرب میں آجاتے ہیں، اور جب طرب میں آتے ہیں تو پاک صاف ہوجاتے ہیں، اور جب پاک ہوجاتے ہیں تو گھل جاتے ہیں، اور جب گھل جاتے ہیں تو خالص ہوجاتے ہیں۔ اور جب خالص ہوجاتے ہیں تو جستجو میں لگ جاتے ہیں، اور جب جستجو کرتے ہیں تو پالیتے ہیں، اور جب پالیتے ہیں تو منزل تک پہنچ جاتے ہیں، اور جب پہنچ جاتے ہیں تو متصل ہوجاتے ہیں، اور جب متصل ہوجاتے ہیں تو پھر اُن کے اور اُن کے حبیب کے درمیان کوئی فرق نہیں رہتا''۔
احساسِ جدائی یہ ہے کہ انسان ہر لمحے خود کو نامکمل محسوس کرے۔ جیسا کہ جگر مرحوم نے

کہا

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

ایسے شخص کی پہلی علامت امام جعفر صادقؑ اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔
''اگر کوئی شخص کسی سے محبت کرتا ہو اور اُسے اس کی جدائی کی توقع ہو تو ایسا شخص سو نہیں سکتا''۔(الخصال صفحہ ۱۵۷)

حضرتِ امیرؑالمومنین کا ارشاد ہے۔''اے میرے معبود! میں تیرے عذاب پر تو صبر کرلوں لیکن تیرے فراق پر کیونکر صبر کروں گا''۔(محبت صفحہ ۲۸۹)

جدائی ہی وہ شے ہے جس کے ذریعے ہمارا امتحان ہوتا ہے اور یہ جدائی ہمارے لئے باعثِ شرف بھی ہے اور اس بات کی نوید بھی کہ ایک نہ ایک دن ہماری ملاقات ہمارے محبوب سے ضرور ہونی ہے اور لطف یہ کہ جدائی عارضی ہے اور وصل دائمی۔جیسا کہ امیرؑالمومنین فرماتے ہیں۔''شرفاء کو ہجر کے ذریعے تکلیف دی جاتی ہے محروم رکھ کر نہیں''۔محبت صفحہ ۴۷)۔مراد یہ ہے کہ جو محبّ صادق ہوتا ہے وہ جدا رہ کر بھی محروم نہیں رہتا یعنی اسے ہجر میں بھی وصل کا لطف میسر ہوتا ہے اور یہی تصور کا ماحصل ہے۔

تنہائی

محبت میں شراکت نہیں ہوتی یعنی محبت کوئی اجتماعی معاملہ نہیں بلکہ خالصتاً انفرادی معاملہ ہے۔ دنیا میں بھی جب کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کی خواہش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ وہ اپنے محبوب سے تنہائی میں ملے۔ ہر محبّ کا مقصد و مدعا اپنے محبوب کو تنہا کرنا ہوتا ہے لیکن ایسا کرنے کیلئے اسے خود بھی تنہا ہونا پڑتا ہے۔ ایسا شخص اگر لاکھوں کے مجمعے میں بھی کھڑا ہو تب بھی تنہا ہوتا ہے۔ اُس کا جسم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے لیکن اس کا دل، اس کا خیال اور اس کا دھیان اپنے محبوب کی تنہائیوں کا طواف کر رہا ہوتا ہے۔

جہاں تک ہمارے محبوب کا تعلق ہے تو وہ تو ہے ہی ''اَحَد'' اور احد کے معنی ہیں ''تنہا''۔ وہ ایسا تنہا ہے کہ اگر ساری دنیا بھی اس کی محبّ بن جائے تب بھی ہر محبّ اس سے تنہائی میں ہی ملاقات کرے گا۔ کیونکہ وہ ہے ہی تنہا ایسا تنہا محبوب بھلا اور کون ہوسکتا ہے۔ اسی لئے تو وہ یکتا اور بے مثل ہے۔ مگر محبّ کو بھی تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے محبوب کے شایانِ شان ہے یا نہیں۔

غافل اِن مہہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

پس اگر اُس یکتا، بے مثل اور تنہا سے محبت کرنا ہے تو پھر خود کو بھی تنہا کرنا پڑے گا۔ ایسا

شخص اگر چہ تلاشِ رزق بھی کرے گا، کھائے گا بھی، پیئے گا بھی، نکاح بھی کرے گا، بچوں کی پرورش بھی کرے گا، لوگوں سے ملے جلے گا بھی، اس کے باوجود تنہا ہوگا۔ اگر ایک لمحے کیلئے بھی اس کا دل اپنے محبوب غافل ہوگیا تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی محبت میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور ہے اور یہ کمی دیمک کیطرح ہوتی ہے کہ اگر اس کیطرف فوری توجہ نہ دی گئی تو یہ ساری محبت کو چاٹ جائے گی۔ اسی لئے مولا امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے۔ ''اللہ سے قربت لوگوں سے جدا ہونے میں ملتی ہے''۔

عشق

قبل اس کے کہ یہ گفتگو اپنے اختتام تک پہنچے ہم اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں کہ ایک عوامی غلط فہمی کو دور کریں جو فلاسفہ وصوفیاء کی ایجاد کردہ ہے اور وہ ہے ''عشق''۔ اس لفظ کا اتنا ڈھول پیٹا گیا ہے کہ لوگ اب اسے ایک متبرک لفظ سمجھنے لگے ہیں۔ آپ یہ جان چکے کہ محبت اور عقل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محبت اوّل تا آخر عقل ہی عقل ہے اور عقل اللہ کا محبوب لفظ ہے۔ قرآن ہو یا ارشاداتِ معصومینؑ ہمیں ہر مقام پر عقل ہی کے تذکرے ملتے ہیں جبکہ عشق دیوانگی کا نام ہے اور یہ اللہ و معصومینؑ کا مردود لفظ ہے۔ اگر چہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے لیکن نہ تو اللہ نے اس لفظ کو استعمال کرنا پسند فرمایا اور نہ معصومینؑ نے بلکہ انہوں نے ہمیشہ اس کی مذمت ہی کی ہے۔ تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں تو عرب اس لفظ کو عورتوں کیلئے دیوانہ ہو جانے اور ہوس

کاری کے ہاتھوں مغلوب ہو جانے کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اسی لئے شعراءِ عرب کے یہاں یہ لفظ کثرت سے مستعمل رہا ہے اور جہاں بھی انہوں نے اسے استعمال کیا ہے، عورتوں کیلئے کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ کا دین و مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اسے اوّلاً فلاسفہ نے اور ثانیاً صوفیاء نے اپنے خاص مقاصد کیلئے روشناس کرایا ہے۔ چنانچہ آئینۂ معرفت جو تصوف کے موضوع پر ایک تحقیقی کتاب ہے اس کے صفحہ ۴۷ پر مؤلف فرماتے ہیں کہ دینی حلقوں میں نظریۂ عشق کا خالق ابن سینا ہے۔ اس سے قبل دینی اصطلاحوں میں یہ لفظ کہیں نہیں ملتا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معصومینؑ نے عشق کے بارے میں کیا فرمایا ہے۔

۱۔ محبت صفحہ ۲۷۱۔ جناب امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ ''عشق ایسا مرض ہے کہ جس کا نہ کوئی اجر ہے نہ ثواب۔ عشق ایسی کوشش ہے جس کا تعلق خالی دل سے ہوتا ہے''۔

۲۔ محبت صفحہ ۲۷۱۔ امام جعفر صادقؑ سے جب عشق کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔ ''جو دل یادِ خدا سے خالی ہوتے ہیں خدا انہیں اپنے غیر کی محبت کا مزا چکھا دیتا ہے''۔

۳۔ محبت صفحہ ۲۷۳۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ ''عاشقوں سے مشورہ نہ کرو کہ ان کی کوئی رائے نہیں ہوتی، وہ سوختہ دل ہیں وہ مستقل فکر میں رہتے ہیں اور عقلیں ان سے چھین لی گئی ہیں''۔

۴۔ محبت صفحہ ۳۷۳۔ مولا امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ ''جس نے کسی چیز سے عشق کیا اُس نے اسے اندھا بنادیا اوراس کے دل کو بیمار کردیا۔ وہ صحیح نظر سے نہیں دیکھتا اور بہروں کی طرح سنتا ہے۔ اس کی شہوتوں نے اس کی عقل کو پارہ پارہ کردیا ہے اور دنیا نے اس کے قلب کو مردہ کردیا ہے''۔

طلبگارِ محبت............عقل

اگر کوئی اہلبیتؑ سے محبت کرنے کا دعویٰ کرے اور اُس سے پوچھا جائے کہ تیری کون سی چیز اہلبیتؑ سے محبت کرتی ہے تو اس کا جواب کیا ہوگا؟۔ اس سوال کی مزید وضاحت کیلئے عرض کروں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں دیکھتا ہوں اور اُس سے پوچھا جائے کہ تیری کون سی چیز دیکھتی ہے؟، تو وہ جواب دے گا کہ میری آنکھ۔ یا کوئی کہے کہ میں سنتا ہوں اور اُس سے پوچھا جائے کہ تیری کون سی چیز سنتی ہے؟ ،تو وہ جواب دے گا کہ میرے کان۔ اسی طرح اگر کوئی کہتا ہے کہ میں اہلبیتؑ سے محبت کرتا ہوں اور اُس سے پوچھا جائے کہ تیری کون سی چیز محبت کرتی ہے؟، تو اس کا جواب یہ ہونا چاہیئے کہ میری عقل اہلبیتؑ سے محبت کرتی ہے کیونکہ عقل ہی محبِّ حقیقی ہے۔ محبت کرنا عقل ہی کا کام ہے۔ اور چونکہ مقامِ عقل دل ہے اسلئے کہا جاتا ہے کہ دل محبت کرتا ہے۔ خود قرآن مجید نے بیشتر مقامات پر عقل کیلئے لفظِ ''قلب'' استعمال کیا جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آئے گی۔

انسان اگر مسئول ہے تو عقل کی وجہ سے ہے۔ اور چونکہ ہر انسان مسئول ہے اس لئے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ نے ہر انسان کو عقل عطا فرمائی ہے۔ اس مقام پر سوال

پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر انسان کے پاس عقل ہے تو ہر انسان کو اہلبیتؑ سے محبت ہونا چاہیئے تھی۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اہلبیتؑ سے محبت کرنے والے بہت ہی تھوڑے اور ان کو دشمن رکھنے والے یا انؑ سے بے تعلق رہنے والے بے شمار ہیں۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنا بے حد ضروری ہے اور اِن صفحات میں ہم اسی جواب کو تلاش کریں گے۔

جن حضرات نے میری کتابوں کا بغور مطالعہ فرمایا ہے انہوں نے اس بات کو ضرور محسوس کیا ہوگا کہ میں نے اپنی تحریرات میں عقل کا خصوصی ذکر کیا ہے اور ہر موضوع کو عقلی نقطۂ نگاہ سے خود بھی دیکھا ہے اور دوسروں کو بھی دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عقل میری محبوب شے ہے اور یہ اس لئے ہے کہ عقل میرے محبوب کی محبوب ہے۔ اللہ خود بھی جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے اور وہ جمال جس سے اللہ محبت کرتا ہے یقیناً عقل ہے کیونکہ یہی وہ شے ہے جس سے ادراکِ جمال کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ جمال بھی ہے اور مُدرکِ جمال بھی۔ یہ محبوب بھی ہے اور محبّ بھی۔ ہمارے دل میں خیال آیا کہ ہم نے اپنی مختلف کتابوں میں عقل کا اتنا ذکر کیا ہے اور اس پر اتنا زور دیا ہے کہ ہر پڑھنے والا یقیناً یہ سوچتا ہوگا کہ آخر یہ عقل ہے کیا چیز جس کا زیدی صاحب اتنی شدت سے پرچار کرتے ہیں۔ اِس کتاب کے موضوع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے یہ مناسب جانا کہ عقل کے بارے میں مفصل معلومات اپنے قارئین تک پہنچا دیں۔ لیکن اتنا خیال رہنا چاہیئے کہ یہ تفریح کا سامان نہیں ہے

بلکہ خالص علمی مسائل ہیں۔ایسے مسائل جن کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا بلکہ ان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا۔اِس اندازِ فکر کے سب سے نمایاں نمائندے علامہ اقبال ہیں جن کے بارے میں شیخ محمد اکرام کا ایک جملہ بڑا الطف دیتا ہے کہ "مسلمان تو ویسے ہی بے عقل مشہور ہیں لیکن علامہ اقبال کا کلام پڑھکر تو یوں لگتا ہے جیسے ہر مسلمان ہر وقت عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتا ہے"۔عرض یہ کرنی تھی کہ خالص علمی مسائل میں دلچسپی کا عنصر ذرا کم ہوا کرتا ہے۔اگر دورانِ مطالعہ آپ کو دلچسپی کم ہوتی نظر آئے تو طبیعت کو اچاٹ نہ ہونے دیجئے گا اور ضد کر کے ان تفصیلات کو پڑھیئے گا کیونکہ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں آپ سے ہمیشہ چھپایا گیا ہے اور جن کا جاننا آپ کیلئے بے حد ضروری ہے تا کہ آئندہ موضوعات آپ کیلئے دلچسپ اور آسان ہو جائیں۔

عقل کیا ہے؟

امام رضاؑ ایک روز مامون کے دربار میں تشریف فرما تھے جہاں بہت سے علماءِ سوء جمع تھے اور عقل کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ایک طویل بحث و مباحثہ کے بعد بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ "عقل وہ ہے جو نیکی اور بدی میں تمیز کرے"۔مامون نے امامؑ سے عرض کی کہ اے فرزندِ رسولؐ! آپ نے یہ گفتگو سنی، اب آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟۔امامؑ نے فرمایا۔"عقل وہ نہیں جو نیکی اور بدی میں تمیز کرے، کیونکہ جانور بھی اپنے بھلے اور برے کو جانتے ہیں (مثلاً اگر کسی گدھے کے سامنے سوکھی اور

ہری گھاس رکھ دی جائے تو وہ سوکھی گھاس کو چھوڑ دے گا اور ہری گھاس کھائے گا) بلکہ عقل وہ ہے جو یہ تمیز کرے کہ دو نیکیوں میں سے بڑی نیکی کون سی ہے اور چھوٹی نیکی کون سی۔ اور دو برائیوں میں یہ تمیز کرے کہ بڑی برائی کون سی ہے اور چھوٹی برائی کون سی''۔ یہ سن کر تمام علماءِ سوء ششدر رہ گئے اور فرمانِ امامؑ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مامون نے کہا کہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کو کہاں رکھے۔ جب مجلس برخواست ہوئی اور امامؑ باہر تشریف لائے تو آپؑ کے خادم نے کہا کہ آقا! آج تو آپ نے ان تمام لوگوں کی زبانوں پر تالے لگا دیئے۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''مگر اب بھی میں نے عقل کی صحیح تعریف انہیں نہیں بتائی''۔ خادم نے عرض کیا کہ مولا مجھے تو بتا دیجئے۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''عقل وہ ہے جس سے انسان اپنے ہادی (امام وقت) کی معرفت حاصل کرے''۔ اسی بات کو امام جعفر صادقؑ نے اس طرح بیان فرمایا کہ ''انسان کیلئے اتنی عقل کافی ہے جس سے وہ اپنے ہادی کو پہچان لے''۔ (کافی۔ کتابِ عقل)۔ یہی عقل کی جامع ترین تعریف ہے اور اسی لئے معصومینؑ نے مومن کو عقلمند اور زیرک کہا ہے۔ حالانکہ بہت سے مومن آپ نے ایسے دیکھے ہوں گے جو بے وقوفی کی حد تک بھولے اور سیدھے سادے ہوتے ہیں اور دنیاوی معاملات میں اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی عقل اپنا فریضۂ منصبی ادا کر رہی ہوتی ہے اور وہ اپنے ہادی کو پہچان رہے ہوتے ہیں اس لئے اللہ کی نظر میں وہ

صاحبانِ عقل ہوتے ہیں۔ لوگوں کو یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہیئے کہ یونیورسٹیوں اور مدرسوں سے ڈگریاں لینے یا مختلف چیزیں ایجاد کر لینے سے انسان عقلمند ہو جاتا ہے۔ یہ عقل نہیں ہوتی بلکہ کوئی اور چیز ہوتی ہے جس کا ذکر انشاءاللہ ہم کریں گے۔

نفس کی طاقتیں

ہم نے کشف العقائد میں عرض کیا تھا کہ انسان تین چیزوں سے مرکب ہے۔جسم، روح اور نفس۔جسم چند آلات کا نام ہے۔روح امرِ خدا ہوتی ہے جو اللہ کے حکم سے آتی ہے اور اسی کے حکم سے چلی جاتی ہے اور اس کا کام ان آلات میں استعدادِ عمل پیدا کرنا ہوتا ہے اور نفس وہ ہے جو ان آلات سے کام لیتا ہے۔ارادہ نفس کا ہوتا ہے۔حکم نفس کا ہوتا ہے۔لذّتیں اور اذیّتیں نفس اٹھاتا ہے اسی لئے مسئول بھی نفس ہی ہوتا ہے کیونکہ اختیار اُسی کے پاس ہے،جسم وروح کے پاس نہیں اور باز پرس اختیار کی بنا پر ہی کی جاتی ہے،بے اختیار سے کوئی سوال نہیں ہوا کرتا اور اختیار اُسی صورت میں کارآمد ہوتا ہے جبکہ اختیار کے ساتھ ساتھ طاقت بھی دی جائے۔اگر کوئی اپاہج شخص چوری نہ کرے تو کوئی بھی اس کی تعریف نہیں کرے گا کیونکہ اس کے پاس اختیار تو ہے لیکن طاقت نہیں ہے۔نفس کو جب اللہ نے مسئول قرار دیا ہے تو لازم ہے کہ اسے اختیار کے ساتھ ساتھ طاقت بھی دی جائے اور پھر دیکھا جائے کہ وہ اس طاقت کے استعمال میں اپنے اختیار کو کسطرح بروئے کار لاتا ہے۔پس اللہ نے نفس کو مسئول قرار دینے سے

پہلے چار طاقتیں عطافرمائیں جواس کی بقااوراس کی نشو ونما کیلئے ضروری تھیں:۔

۱۔ قوتِ شہویہ۔ یہ وہ قوت ہے جو بقاءِ جسم، افزائشِ نسل اور حصولِ لذّات کیلئے ضروری ہےاس میں کھانا، پینا، لباس، مکان، نکاح اور دیگر تمام لذّتیں شامل ہیں۔

۲۔ قوتِ غضبیّہ۔ یہ وہ قوت ہے جس کے ذریعے انسان اپنے دشمن کے خلاف اپنا دفاع کرتا ہےاور نقصان دہ چیزوں کو خود سے دور کرتا ہے۔

۳۔ قوتِ واہمہ۔ یہ وہ قوت ہے جس سے انسان جزئیات تلاش کرتا ہے۔کلّیات بناتا ہے، منصوبے تیار کرتا ہے اور مختلف ایجادات کرتا ہے۔ اس کا مقصد ہمیشہ باقی رہنے کی تدبیر کرنا، طلبِ ریاست کرنا اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا بھی ہوتا ہے۔اسے نفسِ ناطقہ بھی کہتے ہیں اور اکثر لوگ غلط فہمی کی بناء پر اسے ہی عقل کا نام دیتے ہیں حالانکہ یہ عقل نہیں ہوتی البتہ اصطلاحی طور پر اسے ''عقلِ عملی'' کہا جاتا ہے جبکہ قوتِ عقلیہ کو ''عقلِ نظری'' کہتے ہیں۔

۴۔ قوتِ عقلیہ۔ یہ وہ قوت ہے جس کے ذریعے انسان اپنے ہادی کی معرفت حاصل کرتا ہےاور مسلسل اسی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ عقل کا اس کے سوااور کوئی کام نہیں ہے۔

آپ نے ان قوتوں کے بارے میں جان لیا جن کی مدد سے نفسِ انسانی اپنے دین و دنیا کے امور کی تدبیر کرتا ہے۔لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جبکہ یہ قوتیں

عدل پر قائم رہیں کیونکہ جب یہ عدل سے ہٹ جاتی ہیں تو خواہشات کو جنم دینے لگ جاتی ہیں اور پھر یہی خواہشات انسان کو ہلاکت میں مبتلا کر کے اس کے دین اور دنیا، دونوں کو برباد کر دیتی ہیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ انسان اِن قوتوں اور ان کی مختلف حالتوں کے بارے میں علم رکھتا ہو اور یہ شعور بھی رکھتا ہو کہ خود پر کوئی بھی کیفیت طاری ہونے کی صورت میں وہ پہچان سکے کہ یہ نفس کی کون سی قوت کا عمل ہے اور یہ کہ عمل کرتے وقت وہ قوت کس حالت میں ہے۔ جاننا چاہیئے کہ اِن چاروں قوتوں کی تین تین حالتیں ہوتی ہیں۔ ۱۔ افراط ۔ ۲۔ تفریط ۔ ۳۔ اعتدال۔ ان کے علاوہ ایک حالت اور بھی ہوتی ہے جسے خرابی کہتے ہیں۔ اسے بھی ہم مختصراً بیان کریں گے۔ افراط یہ ہے کہ وہ قوت نقطۂ اعتدال سے آگے بڑھ جائے۔ تفریط یہ ہے کہ نقطۂ اعتدال سے کم ہو جائے اور اعتدال یہ ہے کہ مقامِ عدل پر رہے تا کہ وہ اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکے۔ مثال کے طور پر جب دریا نقطۂ اعتدال سے بڑھ جائے تو سیلاب بن جاتا ہے اور بستیاں اجاڑ کر رکھ دیتا ہے اور اگر کم ہو جائے تو قحط پڑ جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ نقطۂ اعتدال پر رہتا ہے تو خوشحالی آتی ہے، کھیتیاں سرسبز و شاداب ہوتی ہیں اور لوگوں کو پیاس سے نجات ملتی ہے۔ یہی حال ان قوتوں کا ہے کہ افراط و تفریط کی صورت میں یہ تباہی پھیلاتی ہیں اور نقطۂ اعتدال پر ہونے کی صورت میں دین و دنیا، دونوں کو سنوارتی ہیں۔

قوتِ شہویہ

قوتِ شہویہ جب حالتِ افراط پر آتی ہے تو "شرہ" کہلاتی ہے اور یہ وہ عالم ہے جبکہ انسان حصولِ لذّات کو ہی اپنا مقصدِ زندگی بنالے اور حلال وحرام کی تمیز چھوڑ دے۔ جب یہ قوت تفریط کا شکار ہوتی ہے تو اسے "خمود" کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں انسان ہر لذت سے بیزار ہو جاتا ہے یہاں تک کہ نکاح سے بھی بھاگتا ہے جس سے نسلِ انسانی کے منقطع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قوت کا اعتدال "عفت" کہلاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کھاتا پیتا بھی ہے، نکاح بھی کرتا ہے لیکن ان چیزوں کو اپنا مقصدِ حیات نہیں بناتا بلکہ حدِّ اعتدال میں رہتا ہے۔ خرابی اس قوت کی یہ ہے کہ انسان کو خواہشِ طعام تو ہو لیکن وہ ایسی چیزیں کھائے جنہیں صحیح مزاج والے پسند نہ کرتے ہوں۔ مثلاً مٹی یا کوئلہ کھاتا ہو۔ میں نے بچشم خود ایک ٹی وی پروگرام میں دیکھا کہ ایک شخص پوری بس توڑ کر کھا گیا جسمیں شیشے، ٹین، لکڑی اور کیلیں سبھی کچھ شامل تھا۔ خرابی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان غیر فطری طریقوں سے اپنی جنسی خواہشوں کو پورا کرنے لگے۔

قوتِ غضبیہ

یہ قوت جب افراط پر آتی ہے تو "تہوّر" کہلاتی ہے اور یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جب

انسان درندہ بن جائے اور اسے اپنے غصے پر قابو نہ رہے۔ اس کی تفریط کا نام ''جبن'' (بزدلی) ہے۔ ایسا شخص بالکل بے حس ہوجاتا ہے اور جس کا جی چاہتا ہے اُسے ذلیل کرکے یا تھپڑ مار کر چلا جاتا ہے اور وہ اپنے دفاع کیلئے کچھ نہیں کرتا۔ اس کا اعتدال ''شجاعت'' ہے یعنی انسان اپنے دفاع میں سستی نہیں دکھاتا لیکن بے وجہ کسی مظلوم پر ہاتھ نہیں اٹھاتا اور اپنے غصے کو ہمیشہ قابو میں رکھتا ہے۔ خرابی اس کی یہ ہے کہ انسان غیر ضروری موقعوں پر اپنی جان کو خطرے میں ڈالے کیونکہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں سے فرار ہوجانا ہی شجاعت ہوتا ہے۔ جس مقام پر بجلیاں گر رہی ہوں یا زلزلہ آرہا ہو یا گولیاں چل رہی ہوں یا دشمنوں کی اتنی کثرت ہو کہ انسان کیلئے اپنا دفاع ممکن نہ رہے تو ایسے موقع پر اپنی جان بچالینا ہی شجاعت کا تقاضا ہے اور ایسے مقامات پر کھڑے رہنا شجاعت کی نہیں بلکہ دیوانگی کی علامت ہے۔

قوتِ واہمہ

اس قوت کے افراط کا نام ''ظلم'' ہے۔ یعنی اپنا غلبہ اور تسلط جمانے کیلئے ایسی تدبیریں کرنا جن سے خلقِ خدا کو نقصان پہنچے مثلاً مہلک بم بنانا وغیرہ۔ تفریط اس کی ''تمکین'' ہے جس کا مطلب ہے ظلم کو بطور ذلّت وخواری سہنا اور باوجود قدرت حاصل ہونے کے ظلم کو دفع نہ کرنا۔ اس کا اعتدال ''عدالت'' کہلاتا ہے جو ظلم کی ضد ہے۔ خرابی اس کی ''نکرہ'' کہلاتی ہے جس کا مطلب ہے مکاری، حیلہ بازی اور سازش۔

قوتِ عقلیہ

اس کی افراط "جربزہ" ہے یعنی انسان فضول اور بے فائدہ چیزوں میں غور وفکر کرے اور اس کی تفریط یہ ہے کہ قوتِ فکر ضرورت کے وقت بالکل عاجز رہے۔ اسے بلاہت اور حماقت کہتے ہیں اور اس کی خرابی گمراہی ہے۔ اس کا نقطۂ اعتدال "حکمت" ہے اور اسی لئے اللہ کے رسولؐ نے صرف کتاب کی تعلیم نہیں دی بلکہ ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم بھی دی ہے کیونکہ حکیم کا کلام بغیر حکمت کے نہیں سمجھا جا سکتا اور اسی لئے قرآن کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے کہ "بہت سے لوگ اس سے ہدایت پاتے ہیں اور بہت سے لوگ اس سے گمراہ ہو جاتے ہیں"۔ پس جو صاحبانِ حکمت ہوتے ہیں وہی قرآن سے ہدایت پاتے ہیں اور گمراہ وہ ہوتے ہیں جن کی عقل میں خرابی ہوتی ہے۔

یہ ایک تھوڑی سی زحمت تھی جو میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کو دی۔ یہ میرے لکھنے کا طریقہ نہیں ہے لیکن اگر تھوڑی سی تکلیف اٹھا کر ایک بڑا مقصد حاصل کر لیا جائے تو یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ عقل چونکہ شرفِ انسانیت ہے اور چونکہ ہمارے ہر عقیدے اور ہر عمل کا مکمل دارومدار عقل پر ہے اس لئے اس بارے میں ہمارے نظریات بہت شفاف ہونے چاہئیں۔

نفس کی قوتوں کے تناظر میں یہ جان لینا چاہیئے کہ پہلی تین قوتیں وہ ہیں جو خواہشات کو جنم دیتی ہیں اور ساری برائیوں کی جڑ یہی خواہشات ہوتی ہیں۔ ان تینوں قوتوں کو

نقطۂ اعتدال پر رکھنا عقل کی ذمہ داری ہے۔ عقل کو نفس کا وزیر کہا جاتا ہے اور جیسا کہ ہمارے ملکی آئین کے تحت وزیرِاعظم جو مشورہ صدرِ مملکت کو بھیجے تو صدر اس مشورے پر عمل کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح عقل جو مشورہ نفس کو دے تو نفس اُس مشورے کو ماننے کا پابند ہے۔ اُدھر تینوں قوتیں بھی نفس کے پیچھے لگی رہتی ہیں اور اسے اپنے اپنے دامِ اثر میں لانے کی کوششوں میں رہتی ہیں اور یہ کشمکش تمام زندگی جاری رہتی ہے۔ اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ چونکہ نفس لذتوں کا حریص ہوتا ہے اس لئے دانستہ یا نادانستہ طور پر رفتہ رفتہ ان قوتوں کا اسیر ہو جاتا ہے اور عقل بے چاری ماتم کرتی رہ جاتی ہے۔ اسی لئے میرے مولاؑ نے فرمایا کہ "عقل ایک متروک دوست ہے"۔ اور آنجنابؑ ہی نے یہ بھی فرمایا کہ "عقل رحمٰن کے لشکروں کی سردار اور خواہش شیطان کے لشکروں کی قائد ہے اور نفس ان دونوں کے درمیان کھینچا تانی میں ہے۔ ان دو میں سے جو غالب آتا ہے، نفس اسی کے احاطے میں چلا جاتا ہے۔ (حکمتِ بوتراب ج ا صفحہ ۳۸۳) اصولی طور پر نفس کا یہ فریضہ ہے کہ وہ عقل کا دامن تھامے رکھے تا کہ حصولِ لذّات میں وہ جادۂ اعتدال سے نہ ہٹے لیکن نفس اگر ایسا کرنا چاہے بھی تو پہلے اُسے خود عقل کو اس کے نقطۂ اعتدال پر لانا پڑے گا کیونکہ افراط و تفریط تو عقل کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے اور اس کیلئے نفس کو یہ جاننا ضروری ہے کہ نقطۂ اعتدال ہوتا کیا ہے!

نقطۂ اعتدال

دائرے کے مرکز کو نقطہ کہتے ہیں اور یہی مقامِ عدل ہے۔ نقطے تک پہنچ جانا کسی صورت بھی ممکن نہیں ہوتا کیونکہ نقطہ اپنی ذات میں واحد و اَحد ہوتا ہے اور وحدتِ مطلقہ کا مظہر ہوتا ہے جہاں دوئی کا گزر بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کا تعلق براہِ راست ذات سے ہے جو مخلوق کی فہم وادراک وتصور ووہم وگمان سے باہر ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کیلئے ہم جناب امیرالمومنین کے تین فرامین پیش کر رہے ہیں تا کہ ہمارے قارئین منزلِ یقین تک پہنچ سکیں۔

۱۔ نہج الاسرار جلد اول صفحہ ۴۴۔ جنابِ امیرالمومنین فرماتے ہیں:۔

''اللہ کی ذات بشر کیلئے غیر معلوم ہے۔ پس اُس کی معرفت اس کی صفات سے حاصل کی جاتی ہے۔ نقطہ صفت ہے اللہ کی اور صفت دلالت کرتی ہے موصوف پر کیونکہ اس صفت کے ظہور سے اللہ پہچانا جاتا ہے''۔

۲۔ نہج الاسرار جلد اوّل صفحہ ۴۴ پر آنجناب فرماتے ہیں:۔

''تمام اشیاء نقطے پر منتہی ہوتی ہیں اور نقطہ ذات پر دلالت کرتا ہے''۔

۳۔ نہج الاسرار جلد اوّل صفحہ ۸۷۔ مولا علی فرماتے ہیں:۔

''نورانیت کے ساتھ میری معرفت اللہ کی معرفت ہے، اور اللہ کی معرفت میری معرفت ہے اور یہی دینِ خالص ہے۔''

Mawaddah\nu
not found.

اس شکل میں چھ مقامات سے دائرے کو مرکز سے ملایا گیا ہے جنہیں ہم نے ا، ب، ج، د، ہ، و کا نام دیا ہے آپ اگر ان کی پیائش کریں تو لمبائی میں یہ سارے خطوط برابر ہوں گے یعنی ہر مقام کا مرکز یعنی نقطے سے فاصلہ برابر ہوگا۔ ان خطوط کو "نصف قطر" کہا جاتا ہے۔ اس بات کو امام جعفر صادقؑ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

"کائنات کی ہر چیز اللہ کے یہاں یکساں قربت رکھتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک چیز زیادہ قریب ہو اور دوسری کچھ فاصلے پر ہو۔ کوئی بعید اس سے بعید نہیں اور کوئی قریب اس سے زیادہ قریب نہیں"۔ (تفسیر نور الثقلین ج ۵ صفحہ ۴۵۳)۔ واضح رہے کہ اس حدیث میں نقطے کو اللہ کہا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسم (یعنی صفت) اور معنی کو ایک ہی نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ دائرہ مقام مومن ہے اور مرکز مقام وحدت لہٰذا ہر مومن، چاہے وہ کسی بھی درجے کا مومن ہو اس نقطے سے یکساں کشش

کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اب یہ بات کہ مومن کے درجات کس طرح بنتے ہیں، اس بات کو یوں سمجھئے کہ ایک نقطے کے گرد لاتعداد دائرے بنے ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے نصف قُطر چھوٹا ہوتا جائے گا ویسے ویسے دائرہ نقطے سے قریب تر ہوتا جائے گا۔ اسے قربتِ معنوی کہتے ہیں جس کی بنیاد معرفت پر ہوتی ہے۔ اور اسی سے مومن کے درجات بڑھتے ہیں اور یہ ترتیب معکوس ہوتی ہے یعنی جیسے جیسے فاصلہ کم ہوتا ہے ویسے ویسے درجہ بڑھتا ہے۔ اسے ہم ایک شکل کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

Mawaddah\nu
not found.

آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے نقطے سے قربت بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے دائرہ چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جیسے معرفت بڑھتی ہے ویسے ویسے مومنین کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب سب سے چھوٹے دائرے کی نوبت آتی ہے تو مومن کی تعداد اتنی کم ہوجاتی ہے کہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے

جیسے اس دنیا میں مومن کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ اس کے باوجود کوئی مومن ایسا نہیں ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ نقطے تک پہنچ گیا۔ اسی لئے جب آپ **قربۃً الی اللہ** کی نیت کرتے ہیں تو اس سے مقصد یہی ہوتا ہے کہ "پرودگار ہمیں ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں منتقل کرتا رہ"۔

آپ نے نقطۂ اعتدال کو سمجھ لیا اور اب اس کی شناخت میں کوئی مشکل درپیش نہیں آنی چاہیئے کیونکہ پورے کارخانۂ ہست و بود میں صرف ایک ہی ہستی ہے جس نے نقطہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس نقطے نے بارہ مرتبہ ظہور کیا ہے۔ اسی لئے یہ نقطہ خود فرماتا ہے۔ "ہم اعتدال کی وہ تکیہ گاہ ہیں جس سے پیچھے رہ جانے والا آخر کار ملحق ہوگا اور آگے بڑھ جانے والا بھی اسی کی طرف لوٹے گا"۔

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ نفس کا فرض ہے کہ عقل کو نقطۂ اعتدال پر رکھے جس کا مطلب یہ ہے کہ عقل کو مرکزِ محبت سے نہ ہٹنے دے کیونکہ محبت ہی وہ شے ہے جو نجاساتِ ظاہری و باطنی کو دور کرتی ہے۔ نجاستِ ظاہری کا تعلق جسم سے ہے اور نجاستِ باطنی کا تعلق عقل سے ہے لہٰذا جب تک عقل پاک نہ ہوگی اس وقت تک جسم بھی نجس رہے گا اور جیسے ہی عقل پاک ہوگی تو اسی وقت جسم بھی پاک ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مشرک و کافر جب ایمان لاتا ہے تو چونکہ ایمان کا تعلق عقل سے ہوتا ہے اس لئے عقل پاک ہوتے ہی اس کا جسم بھی پاک ہو جاتا ہے۔ اس بات کی سند حضرتِ ختمی مرتبت کا یہ فرمان ہے کہ "اگر انسان کا دل (یعنی عقل) پاک ہے تو تمام جسم پاک

ہے اور اگر دل ناپاک ہے تو تمام جسم ناپاک ہے" (الخصال صفحہ ۱۷)

مدارجِ عقل

اللہ نے قرآنِ مجید میں عقل کے تین درجات قرار دیئے ہیں۔ پہلا درجہ قلب ہے، دوسرا درجہ فواد اور تیسرا درجہ لُب۔

قلب

عقل کے بارے میں ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں وہ دماغ میں رہتی ہے بلکہ ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ وہ ٹخنوں میں رہتی ہے۔ ایسی قیاس آرائیاں وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن جب ہم نے قرآنِ مجید سے رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ عقل کا مقام دل ہے۔ بلکہ قرآنِ مجید نے بہت سے مقامات پر لفظ "قلب" کو عقل ہی کے معنوں میں استعمال کیا۔ قلب عقل کا ابتدائی درجہ ہے اور اللہ نے سب سے پہلے قلب ہی کو مخاطب کیا ہے۔ ایسی بہت سی آیات ہیں لیکن ظاہر ہے کہ وہ سب کی سب نقل نہیں کی جاسکتیں اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے لہٰذا ہم صرف چند آیات ہی پیش کریں گے تا کہ پڑھنے والوں پر عقل کا مفہوم واضح ہو جائے۔

۱۔ اعراف ۱۷۹۔ **"لهم قلوبٌ لا يفقهون بها ولهم أعينٌ لا**

یُبصرون بھا ولھم اٰذانٌ لا یسمعون بھا"۔(ان کے دِل ہیں جن سے وہ سوچتے سمجھتے نہیں ہیں،اوران کیلئے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں ہیں اور ان کیلئے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں ہیں)

اس آیت سے پتہ چلا کہ جہاں دیکھنا آنکھوں کا کام ہے،سننا کانوں کا کام ہے، وہیں سوچنا قلب کا کام ہے۔ یہاں یہ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ پھر دماغ کا کیا کام ہے؟۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دماغ تو محض ایک کمپیوٹر ہے۔حواسِ خمسہ جو جو DATA جمع کرتے ہیں اسے اس کمپیوٹر میں محفوظ کر دیتے ہیں۔ جب عقل کسی موضوع پر سوچنا شروع کرتی ہے تو اسے دماغ میں محفوظ متعلقہ معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔لیکن کمپیوٹر کیطرح دماغ میں کوئی ایسا میموری بٹن نہیں ہوتا جس سے مختلف CELLS سے وہ معلومات نکالی جاسکیں۔اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب کسی کو کوئی بات یاد نہیں آرہی ہوتی تو وہ اپنے ماتھے اور سر پر زور زور سے ہاتھ مارتا ہے۔ یہ وہی معلومات نکالنے کی کوشش ہوتی ہے لیکن سوچنا اور پھر سمجھنا قلب ہی کا کام ہوتا ہے۔

۲۔محمدؐ ۲۴۔"پس کیا وہ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے ؟۔ یا اُن کے دِلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟"۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ غور وتدبّر کرنا بھی دِل کا کام ہے۔

۳۔ حج ۴۶۔ ''پس کیا وہ زمین پر چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے وہ تعقّل کرتے، یا ان کے کان ایسے ہو جاتے جن سے وہ سنتے۔ پس تحقیق آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں''۔

ثابت ہوا کہ تعقّل کرنا دل کا کام ہے، وہ دل جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ دل اندھے بھی ہو جاتے ہیں۔ یعنی انسان عقل رکھتے ہوئے بھی تعقّل نہیں کر سکتا، اُن نجاسات کیوجہ سے جو اس کے دل پر چڑھی ہوئی ہیں۔ یہ عقل کا پہلا درجہ تھا جس کے بارے میں رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''عقل کو دل میں وہی مقام حاصل ہے جو گھر کے درمیان میں چراغ کو حاصل ہے''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۱ صفحہ ۱۳۷)۔ اور جناب امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ ''دین کی کوئی چیز اصلاح نہیں کر سکتی مگر عقل'' (حکمتِ بوتراب ج ۱ صفحہ ۳۰۲)۔ اس عقل کا تعلق سمجھنے اور اقرار کرنے سے ہے۔

فُواد

یہ عقل کا دوسرا درجہ ہے جس کا کام ایمان لانا اور معرفت حاصل کرنا ہے اور یہی وہ عقل ہے جو عنداللہ مسئول ہے۔ ہم قرآنِ حکیم کی چند ایسی آیات آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جن میں ''فُواد'' کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۱۔بنی اسرائیل ۳۶۔ **"انّ السّمع وَالبصروا الفُوادَ کُلّ اولٰئک کان عنه مسئولاً"** ۔(بے شک کان، آنکھ اور دل، ان سب کے بارے میں سوال کیا جائے گا)۔ ہمیں اس ترجمے سے اختلاف ہے لیکن چونکہ یہ محل نہیں ہے اس لئے ہم فی الحال اس بارے میں خاموش رہیں گے۔ بہر حال اس آیت سے معلوم ہوا کہ عقل کا جو درجہ مسئول ہے اور جس سے ولایتِ علیؑ کا سوال کیا جائے گا وہ فُواد ہے۔ یہ ایک اعلیٰ قسم کی عقل ہے جو تجلیاتِ ولایت کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور کان اور آنکھ اس کے مددگار ہیں۔

۲۔نجم ۱۱۔ **"ماکذَبَ الفُوادُ مارأی"** ۔(نہیں جھٹلایا دل نے جو کچھ کہ اُس نے دیکھا)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خود اللہ کے رسولؐ نے آیت اللہ الکبریٰ کو دیکھ کر جب اس کی تصدیق کی تو فُواد کے ذریعے ہی کی۔ اس عقل کے بارے میں امیرالمومنین ارشاد فرماتے ہیں۔"دل اعضاء کا امیر ہے۔ اسی کے ذریعے سے تم سوچتے اور غور کرتے ہو۔ اسی کا حکم تمام اعضاء پر نافذ ہے۔ اسی دل پر واجب ہے کہ وہ ایمان کی حقیقت کو تسلیم کرلے"(تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۳۹)۔ اور اسی عقل کے بارے میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔"اللہ نے دل پر اقرار و معرفت کو واجب کیا ہے اور وہ ایمان کا ماحصل ہے"۔(تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۳۹)

لُب

یہ اعلیٰ ترین عقل ہے جو معرفت کے ان بلند ترین مقامات تک جا پہنچتی ہے جہاں حجابات سر کنے لگتے ہیں اور رازہائے سر بستہ کھلنے لگتے ہیں۔ لُب کی جمع ہے الباب اور قرآن نے اِسی لفظ کو بیان کیا ہے۔

ا۔ رعد ۱۹، ۲۰۔ کیا وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ تمھارے رب کیطرف سے نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے، اُس شخص کے مانند ہوسکتا ہے جو اندھا ہو۔ سوا اس کے نہیں کہ صاحبانِ عقل (اولوالالباب) ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور میثاق کو نہیں توڑتے اور جو اس تعلق کو ملائے رکھتے ہیں جس کے ملائے جانے کا اللہ نے حکم دیا ہے''۔

اس آیت کے بارے میں امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا۔ ''یہ آیت آلِ محمدؐ کے بارے میں اور اس عہد کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے انؑ کے بارے میں لیا ہے اور عالمِ ذر میں جو عہد و پیمان جنابِ امیر المومنین اور دیگر ائمہ معصومین کی ولایت کے متعلق لیا گیا تھا اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے''۔ (تفسیر المتقین صفحہ ۳۲۶ بحوالہ صافی وقمی)۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اولی الالباب کا تعلق خالصتاً ولایت علیؑ کی معرفت اور اُس عہد و میثاق پر قائم و دائم رہنے سے ہے جو یومِ الست لوگوں سے لیا گیا تھا اور یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ صرف صاحبانِ لُب ہی کر سکتے ہیں۔

۲۔ ابراہیم ۵۲۔ ''یہ (قرآن) لوگوں کے واسطے کافی اطلاع ہے اور اس لئے بھی کہ وہ اس کے ذریعے سے ڈرائے جائیں اور اس غرض سے بھی کہ وہ جان لیں کہ ماسوا اس کے نہیں کہ وہی معبودِ واحد ہے اور اس لئے بھی کہ صاحبانِ عقل (اولوالالباب) اس سے نصیحت حاصل کریں''۔

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ صاحبانِ لُب وہ ہیں جو معرفتِ توحید رکھتے ہیں اور کسی خیالی خدا کی پرستش نہیں کرتے۔

۳۔ زمر ۱۷، ۱۸۔ ''اور جو لوگ طاغوت سے بچے رہے کہ اس کی عبادت کریں اور انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا ان کیلئے خوشخبری ہے۔ پس (اے رسولؐ) تو میرے اُن بندوں کو خوشخبری دے دے جو بات کو غور سے سنتے ہیں، پھر اس کی سب سے اچھی چیز کی پیروی کر لیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی اللہ نے ہدایت کی ہے اور یہی لوگ صاحبانِ عقل (اولوالالباب) ہیں''۔

اس آیت میں اللہ نے صاحبانِ لُب کی چند خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ اوّل یہ کہ وہ طاغوت سے بچتے ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ طاغوت سے بچنے کیلئے پہلے طاغوت کی معرفت حاصل کرنا ہوگی کیونکہ جس چیز کو انسان پہچانتا نہ ہو اس سے بچے گا کیسے؟۔ یاد رکھیئے کہ جو چیز بھی محمدؐ و آلِ محمدؐ کے مقابلے پر آئے یا ان کے حکم کے خلاف حکم لگائے یا لوگوں کو آلِ محمدؐ سے ہٹا کر اپنی

طرف رجوع کرنے کی دعوت دے، وہی طاغوت ہے کیونکہ اللہ کی طرف رجوع کرنے کا مطلب ہے اِن مقدس ہستیوں کیطرف رجوع کرنا ہے۔ پس فتووں پر عمل کرنے والے ''اولوالالباب'' سے خارج ہیں چاہے وہ کتنی ہی دلفریب گفتگو کیوں نہ کرتے ہوں۔ دوئم یہ کہ وہ کسی ایک شخص یا کسی ایک گروہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر نہیں ہوتے بلکہ ہر ایک کی بات کوغور سے سنتے ہیں اور جو بات بھی سب سے اچھی ہوتی ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لہٰذا جو بھی کسی ایک فرد کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوکر رہ جائے وہ صاحبِ لُب نہیں ہوسکتا۔ سوئم یہ کہ وہ ہدایت یافتہ ہوتے ہیں اور جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے، ہدایت کا مطلب معرفتِ ولایتِ علیؑ ہوتا ہے۔ صرف مان لینے یا نعرے لگا لینے سے انسان ہدایت یافتہ نہیں بن سکتا کیونکہ ایسے شخص کے پھسلنے کا ہر وقت امکان موجود رہتا ہے۔

ہم نے مختصر ترین الفاظ میں مبادیاتِ عقل آپ کیلئے بیان کردیئے۔ اس سے کم الفاظ میں عقل کو بیان کرنا کم از کم ہمارے لئے ممکن نہ تھا۔ اب انشاءاللہ آپ کیلئے عقل اور خواہش میں تمیز کرنا مشکل نہیں رہے گا اور آپ کیلئے یہ فیصلہ کرنا بھی آسان ہوجائے گا کہ آپ کس وقت عقل کی کون سی منزل پر ہیں اور یوں آپ کسی مقام پر ٹھہریں گے نہیں بلکہ آپ کا ارتقاء ہمیشہ جاری رہے گا۔

عقل کے اس درجے کے بارے میں ائمہ معصومین کے چند ارشادات پیش کرکے ہم

اس گفتگو کو اختتام تک پہنچاتے ہیں:۔

۱۔امام زین العابدینؑ نے فرمایا۔"امامِ غائبؑ کی غیبت کے زمانے میں وہ لوگ جو اس کی امامت کے قائل اور اُسؑ کے ظہور کے منتظر ہوں گے وہ لوگ تمام زمانوں کے لوگوں سے افضل ہوں گے کیونکہ اللہ ان کو عقل وفہم ومعرفت عطا کرے گا اور ان کے نزدیک غیبت مشاہدے کی طرح ہوگی۔ان کا مرتبہ ان مجاہدین کے برابر ہوگا جنہوں نے رسولؐ اللہ کی اقتداء میں تلوار سے جہاد کیا۔یہی لوگ حقیقی مخلص اور ہمارے سچے شیعہ ہوں گے۔وہ لوگوں کو اللہ کے دین کیطرف ظاہرہ اور پوشیدہ دعوت دیں گے۔

(کمال الدین وتمام النعمہ ج ۱صفحہ ۳۲۱)

۲۔جنابِ امیرؑالمومنین فرماتے ہیں۔"بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں روزوں کا ثمرہ بھوک پیاس کے علاوہ کچھ نہیں ملتا اور بہت سے عابدِ شب زندہ دار ایسے ہیں جنہیں عبادت کے نتیجے میں جاگنے اور زحمت اٹھانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔لیکن زیرک و دانا لوگوں کا سونا اور روزہ نہ رکھنا بھی قابل ستائش ہوتا ہے"۔(نہج البلاغہ قول ۱۴۵)۔اس حدیث کی وضاحت انشاءاللہ آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔

مددگارِ محبت............علم

جب ہم محبت کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اُس پوری زنجیر کو دھیان میں رکھنا پڑتا ہے جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی ہوئی محبت سے جا ملتی ہیں۔ کیونکہ انسان چھلانگ لگا کر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس زنجیر کی پہلی کڑی عقل تھی جس پر ہم نے حسبِ ضرورت گفتگو کی۔ اب یہ جانیئے کہ عقل جب سکڑتی ہے تو ''نقطہ'' بن جاتی ہے اور جب پھیلتی ہے تو بابِ مدینۃ العلم بن جاتی ہے۔ گویا عقل کا ظہور لوحِ علم پر ہوتا ہے۔ عقل اگر جڑ ہے تو علم اس کی شاخ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور اگر انہیں جدا کر دیا جائے تو ایک آگ جلانے کے کام آتی ہے اور دوسری دفن ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ اکیلی دفن نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایمان اور حیا بھی دفن ہو جاتے ہیں جیسا کہ میرے مولاؑ نے فرمایا۔ ''عقل اور علم، ایمان اور حیا، ایمان اور علم ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے''۔ (حکمتِ بوتراب ج۱صفحہ۳۰۳)۔ لہٰذا تنہا عقل اُس مچھلی کے مانند ہے جسے خشکی پر چھوڑ دیا جائے جو اوّل اوّل تڑپتی ہے اور بالآخر مر جاتی ہے۔

علم کیا ہے؟

علم عقل کا چراغ ہے اور تدبر و تفکر کو قوت مہیا کرتا ہے۔ اس کی ابتداء رہنمائی اور انتہاء معرفت ہے۔ گویا علم خود ہی سفر ہے، خود ہی مسافر ہے، خود ہی رہنما ہے اور خود ہی منزل ہے۔ ہمارے یہاں اللہ کے فضل و کرم سے علماء کی بہتات پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر اینٹ اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے ایک نام نہاد عالم برآمد ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک علم دوسروں پر برتری جتلانے اور فخر و مباہات کا ایک ذریعہ ہے۔ ان کے نزدیک ڈھیروں کتابیں چاٹ جانے اور ایک مخصوص لباس پہن لینے کا نام علم ہے یا پھر ایسے بلند و بانگ باتوں کا جو سننے یا پڑھنے والوں کی سمجھ ہی میں نہ آئیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان بے چاروں کو علم کی تعریف تک معلوم نہیں۔ اگر معلوم ہوتی تو کبھی تو اپنے سننے والوں یا پڑھنے والوں کو بھی بتاتے۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ علم ایک پاک اور خالص چیز ہے اور پاک اور خالص دلوں میں ہی اترتا ہے۔ میرے آقا امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "علم حاصل کرنے اور یاد کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا نور ہے کہ اللہ جسے ہدایت کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں قرار دیتا ہے"۔ (القطرۃ من بحار ج ۴ صفحہ ۲۵۸)۔ پس علم ہدایت حاصل کرنے کا یعنی معرفتِ ولایت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس شخص نے معرفت کی بُو تک نہ سونگھی ہو اور اس کا مقصد فقط دین کے ذریعے دنیا کمانا، شہرت حاصل کرنا اور لوگوں کے ذہنوں کو الجھانا

ہو،اس کا علم سے تعلق ہی کیا ہے؟،وہ تو محض ایک بازیگر اور شعبدہ باز ہے جس نے جہلاء کو مسحور کیا ہوا ہے۔ علم تو درحقیقت کشفِ حقیقت کا نام ہے،وہ حقیقت جس کے بارے میں خود اللہ کا نبیؐ یہ دعا کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ ''پروردگار! مجھے حقیقتِ اشیاء کا علم عطا فرما''۔پھر بھلا صرف ڈگریاں لے لینے اور القابِ معصومینؑ پر غاصبانہ قبضہ کر لینے سے علم کیونکر مل سکتا ہے؟۔ ہماری بات کی سند خود حضرتِ ختمی مرتبتؐ کا ارشاد ہے جو فرماتے ہیں۔ ''بلعم بن باعور کا واقعہ تمام اہلِ علم کیلئے باعثِ عبرت ہے۔ جو بھی اہلِ علم اپنے علمی تقاضوں کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی کرے تو وہ بھی اُسی کی طرح سے راندۂ درگاہ قرار پاتا ہے۔جس کے علم میں اضافہ ہو لیکن اس کی ہدایت (معرفت) میں اضافہ نہ ہو تو ایسے شخص کی اللہ سے دوری میں اضافہ ہو جاتا ہے''۔(تفسیر نور الثقلین ج۳صفحہ۵۰۵)۔یعنی جتنا جتنا وہ کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنے نفس کو موٹا کرتا جائے گا اتنا اتنا وہ اللہ کی بارگاہ میں مردود ہوتا جائے گا۔اسی لئے ہم عرض کرتے ہیں کہ انسان پہلے اپنی عقل کو خواہشات کی کدورت سے پاک کرے،پھر علم کا ارادہ کرے،یہاں تک کہ حجابات ہٹنے لگیں اور آفتابِ حقیقت اس کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگے اور یہ جان لیجئے کہ کائنات کی اصل حقیقت میرے مولا امیرؑ المومنین کی ولایت ہے۔پس آؤ بابِ حطّہ کی طرف اور خاک پر اپنی پیشانی رکھ دو اگر تم واقعی علم کے طلبگار ہو!

اقسامِ علم

بنیادی طور پر علم کی دو قسمیں ہیں۔ وہبی اور اکتسابی۔ وہبی علم وہ ہوتا ہے جسمیں انسان کا اپنا عمل دخل کوئی نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور یہ علم اللہ نے اپنی ہر مخلوق کو عطا فرمایا ہے۔ اسے علم فطری بھی کہا جاتا ہے۔ ہر شے کو فطری طور پر یہ معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ مچھلی کا بچہ جب انڈے سے نکلتا ہے تو نکلتے ہی تیرنے لگتا ہے۔ یہ علم فطری ہے جو اللہ نے اسے سکھایا ہے۔ انسان کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''ہم نے تمھیں تمھاری ماؤں کے شکم سے اس طرح نکالا کہ تمھیں کسی شے کا علم نہیں تھا''۔ لیکن اس صریح لاعلمی کے باوجود بچے کو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کو رزق کہاں سے ملے گا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی چیز کی ضرورت ہو تو رونا چاہیئے۔ انسان کی حد تک یہ علم منقطع نہیں ہوتا بلکہ اگر انسان اپنے دل کو خالص کرلے تو اس کے دل پر مسلسل القاء ہوتا رہتا ہے اور بقدرِ طلب اس کے علم و معرفت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

علمِ اکتسابی وہ ہوتا ہے جس کیلئے انسان کو خود ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں اور جہدِ مسلسل کے ساتھ ساتھ اس کا علم بڑھتا رہتا ہے۔ یہ ایک سفر ہے جو مہد سے لحد تک جاری رہتا ہے اور کسی بھی مرحلے پر انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے تمام علم حاصل کرلیا۔ گویا انسان کا سفر جہل سے شروع ہوتا ہے اور جہل پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جہل کی

بھی دو اقسام ہیں۔جہلِ مرکب اور جہلِ بسیط۔جہلِ مرکب یہ ہے کہ انسان نہیں جانتا مگر سمجھتا یہ ہے کہ جانتا ہے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک چیز ہے اور اس کی شدید مذمت کی گئی ہے اور دراصل جاہل اسے ہی کہا جاتا ہے جو جہلِ مرکب میں مبتلا ہو۔جہلِ بسیط اسے کہتے ہیں کہ انسان نہیں جانتا مگر اسے یہ معلوم ہوتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ نہیں جانتا۔ایسے جہل کی تعریف کی گئی ہے اور یہی جہل انسانی علم کی معراج ہوتا ہے۔
بقولِ فانیؔ

حاصلِ علمِ بشر جہل کا عرفاں ہونا
عمر بھر عقل سے سیکھا کئے ناداں ہونا

اس طرح زندگی کے کسی بھی مرحلے پر انسان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ عالم بن گیا بلکہ وہ ہمیشہ طالبِ علم ہی رہتا ہے۔میرے مولاؑ نے بھی جب انسانوں کو طبقات میں تقسیم کیا تو فرمایا۔''انسان تین قسم کے ہیں۔ عالم ربّانی (یعنی امامؑ) نجات کی راہ پر گام زن طالبِ علم اور تیسرے کوڑا کرکٹ''(حکمتِ بوتراب ج ا صفحہ ۳۷۹)۔اس بات کو اس طرح سمجھئے کہ انسان کہیں جانے کیلئے گھر سے نکلتا ہے۔ جب ایک تہائی سفر طے کرلیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ ایک تہائی راستہ کٹ گیا۔لیکن ایک تہائی راستہ طے کر لینے کے بعد بھی وہ مسافر ہی رہتا ہے۔پھر جب دو تہائی سفر مکمل ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ دو تہائی راستہ کٹ گیا۔لیکن دو تہائی راستہ طے کر لینے کے باوجود بھی وہ مسافر ہی کہلائے گا۔ یہ سفر اُس وقت ختم ہوگا جب وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ یہ مثال ایک ایسے سفر کی

تھی جومحدود تھااور طے کیا جا سکتا تھا لیکن سفرِ علم لامحدود ہےاور ہزار زندگیاں مل جانے کی صورت میں بھی نامکمل ہی رہتا ہے اس لئے انسان چاہے کتنی بھی معلومات جمع کرلے، کتنی ہی اطلاعات اکھٹی کرلے، وہ بہر حال راہِ علم کا مسافر ہی رہے گا اور اسے طالبِ علم کے نام سے ہی پکارا جائے گا۔ البتہ جس کے پاس علمِ قطعی ہو جس کی بنیاد یقین ہو نہ کہ ظن و گمان، اسے مجازی طور پر عالم کہکر بلاتے ہیں۔ امیر ؑالمومنین سے جب پوچھا گیا کہ لوگوں میں بڑا عالم کون ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا۔ ''جو دوسرے لوگوں کا علم اپنے علم میں جمع کرلے وہی بڑا عالم ہے''۔ (تفسیرِ نورالثقلین ج۵ صفحہ۵۰۲)۔ ایسے مانگے تانگے کے علم پر اگر کوئی اکڑنے لگے اور خود کو واقعی عالم سمجھنے لگے تو اس سے بڑا جاہل کوئی نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی جہل کی مذمت ائمہ معصومین نے کی ہے۔ اس کو سمجھنا چاہیئے تا کہ انسان ٹھوکر نہ کھائے اور جعلی مدّعیانِ علم کی شناخت کرسکے:۔

۱۔ امیر ؑالمومنین نے فرمایا۔ ''شک جہالت کا نتیجہ ہے، ایمان کو برباد کردیتا ہے، دین کو فاسد کردیتا ہے اور دل کے نور کو بجھا دیتا ہے''۔ پس ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ کون متضاد باتیں کرتا ہے۔ ایک مقام پر کچھ کہتا ہے اور دوسرے مقام پر کچھ اور۔ یقیناً ایسا شخص شک میں مبتلا ہے جو اس کی جہالت پر دلیل ہے۔

۲۔ امام رضاؑ نے فرمایا۔ ''ہر شخص کا دوست اس کی عقل اور اس کا دشمن اس کی جہالت ہوتی ہے''۔ (عیونِ اخبار الرضاؑ ج۱ صفحہ۴۵۴)

۳۔ جنابِ امیر ؑالمومنین نے فرمایا۔ ''عاقل کمال چاہتا اور جاہل مال''۔ (تجلیاتِ

حکمت۳۳۳)

اس فرمان سے ثابت ہوجاتا ہے کہ جس شخص کو مال کے پیچھے بھاگتا دیکھو، سمجھ لو کہ وہ جاہل ہے اگر چہ وہ عالم ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔

۴۔ جنابِ امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔ ''جاہل ہمیشہ حیران ہی رہتا ہے''۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کردینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ حیرت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حیرت وہ ہے جو جہالت کیوجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی دیہاتی کسی بڑے شہر میں پہنچ جائے تو وہ ہر چیز کو دیکھ کر حیرت کرے گا۔ یہ حیرت اُس کی جہالت کی پیداوار ہے نہ کہ جن اشیاء کو دیکھ کر وہ حیران ہورہا ہے وہ اپنی ذات میں حیران کن ہیں۔ دوسری حیرت علم و معرفت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جیسا کہ امیرالمومنین نے فرمایا کہ ''معرفت ایک حیرانی ہے اور اس سے محرومی ایک اندھا پن ہے''۔ جو حیرت جہل کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے اس کی وضاحت ہم نے کردی ہے لیکن معرفت کی حیرت ایک دوسری چیز ہے۔ ہم نے کشف الحقائق کے ضمیمے میں عرض کیا تھا کہ اوّل تو انسان کی عقل بذاتِ خود محدود ہے اور عقلِ جزئی کہلاتی ہے۔ پھر یہ کہ انسان آج تک اِس عقلِ جزئی کا بھی کُل پانچ فیصد حصہ استعمال کرسکا ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کی اس میں طاقت ہی نہیں ہے۔ لیکن معرفت کا سفر طے کرتے کرتے جب وہ اس حد سے آگے بڑھتا ہے تو عقل خود حجاب بن جاتی ہے کیونکہ یہ مرحلہ مشاہدے سے آگے کا ہے اور جب عقل مشاہدات کی حد سے نکل جائے تو اس کا لازمی نتیجہ حیرت ہے۔ لیکن

یہ حیرت مستقل نہیں ہوتی کیونکہ انسان اپنی حد سے آگے کا سفر اپنے بل بوتے پر طے نہیں کر سکتا بلکہ اسے لازماً اپنے امامؑ کا دامن تھام کر یہ سفر طے کرنا ہوتا ہے اور جب رہبر کے دامن کے سائے میں وہ آگے بڑھتا ہے تو آج کی حیرت کل کی معرفت میں بدلتی جاتی ہے۔ اس طرح اگر چہ اس کی معرفت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن وہ رہتا حیرت ہی میں ہے۔

ذرائعِ علم

جہاں تک علمِ وہبی کا تعلق ہے تو جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس میں انسان کا اپنا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ یہ خالصتاً عطائے ربّانی ہوتا ہے اور جو چیز اس عطا کو کھینچتی ہے وہ پاک اور خالص عقل اور اہلبیتؑ سے مودت ہے۔ اس علم کی تین اقسام ہیں۔ علمِ جزئی، علمِ کلّی اور علمِ احاطی۔ علمِ جزئی مومنین کیلئے ہے۔ علمِ کلّی انبیاءؑ و مرسلین کیلئے ہے اور علمِ احاطی ائمہؑ معصومین کیلئے جیسا کہ سورۂ یٰسین میں ارشاد ہوا کہ "ہم نے تمام اشیاء کو گن گن کر امامِ مبین میں احصاء کر دیا ہے"۔ یعنی امامِ مبین ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

علمِ اکتسابی کے تین ذرائع ہیں۔ خبر، مشاہدہ اور تجربہ۔ اخباری علم وہ ہوتا ہے جو آپ کسی سے سنتے ہیں یا کسی کتاب میں پڑھتے ہیں۔ مشاہداتی علم وہ ہوتا ہے جو آپ نے نہ تو کسی سے سنا ہوتا ہے اور نہ پڑھا ہوتا ہے بلکہ اپنے حواسِ خمسہ کے ذریعے آپ خود ہی اس کا ادراک کرتے ہیں۔ اور علمِ تجرباتی وہ ہوتا ہے جب آپ خبری اور مشاہداتی

معلومات پرغور وتدبر کرتے ہیں، انہیں ایک دوسرے سے منسلک کرتے ہیں، ان کی جزئیات میں جاتے ہیں اور اِس عملِ تفکر و تدبر کے ذریعے قیمتی نتائج برآمد کرتے ہیں۔ یعنی جزو سے کُل کیطرف اور فرع سے اصل کیطرف جاتے ہیں۔ یہی وہ علم ہے جس کے ذریعے انسان اپنے علم سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ بصورت دیگر وہ ایک طوطے کی مانند ہوتا ہے جو بہت کچھ رٹے رہتا ہے لیکن اسے معلوم کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اگر ان تینوں ذرائع کو جمع کیا جائے تو اس کیلئے ایک لفظ بولا جاتا ہے اور وہ ہے "علمِ سماعی"۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ایک علم پہلے سے آپ کے پاس ہوتا ہے جسے علمِ فطری یا علمِ طبعی کہتے ہیں۔ علمِ سماعی اور علمِ طبعی ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہوتے ہیں اور جب تک یہ دونوں اکھٹے نہ ہو جائیں اس وقت تک مقصدِ علم حاصل نہیں ہوتا۔ میرے مولا امیرالمومنین نے ان دونوں علوم کی افادیت پر زور دیا ہے۔

۱۔ تجلیاتِ حکمت صفحہ ۳۳۵۔ امیرالمومنین نے فرمایا۔

"علم دوطرح کا ہوتا ہے۔ فطری اور سماعی۔ اور سماعی علم فائدہ نہیں پہنچا سکتا اگر فطری علم موجود نہ ہو"۔

۲۔ "علم دو ہیں۔ طبعی اور سماعی۔ طبعی علم اس وقت تک نفع نہیں پہنچا تا جب تک کہ سماعی علم نہ ہو"۔

تحصیلِ علم

انسان اپنی فطرت سے کبھی نہیں لڑسکتا۔اگر چہ انسانوں کی اکثریت اپنی سہل پسندی، غفلت یا دنیاداری کی وجہ سے طلبِ علم سے گریز کرتی ہے لیکن دنیا میں ایک انسان بھی ایسا نہ ہوگا جو جہالت کی تعریف کرتا ہواور خود کو جاہل کہلانا پسند کرتا ہو لیکن طلبِ علم سے غفلت اُن علمی وڈیروں کی مرہونِ منت ہے جنہوں نے اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کیلئے لوگوں کے ذوقِ علمی کو تساہلی کا شکار کررکھا ہے تاکہ لوگ ہر حال میں ان کے محتاج رہیں۔لیکن جو لوگ ان وڈیروں کے آسرے پر بیٹھے ہوئے ہیں، میں ان کو خبردار کرتا ہوں کہ ان کا جاہل رہنا کوئی حادثاتی عمل نہیں ہے بلکہ ایک ذلّت کا عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر نازل ہوتا رہتا ہے اور وہ مولوی سے امید لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔

۱۔تجلیات حکمت صفحہ ۳۴۵۔امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

"جب اللہ کسی بندے کو ذلیل کرتا ہے تو بابِ علم کو اس پر بند کردیتا ہے"۔

۲۔تفسیرِ نورالثقلین ج۴ صفحہ ۱۴۷)۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

"تمھیں اللہ کے دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرنی چاہیئے اور اعراب (گنوار) نہ بنو۔جو دین میں سمجھ بوجھ سے عاری ہو تو اللہ قیامت کے دن اس کی طرف نگاہِ رحمت نہیں کرے گا"۔

۳۔تفسیرِ نورالثقلین ج ۴صفحہ ۱۹۲۔امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے۔

''میری خواہش ہے کہ میرے اصحاب کے سروں پر کوڑے برسائے جائیں یہاں تک کہ وہ دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرلیں''۔

۴۔تجلیاتِ حکمت صفحہ ۲۶۳۔امیرالمومنین فرماتے ہیں۔

''میں ایسے گروہ کی اللہ سے شکایت کرتا ہوں جو جہالت کے عالم میں زندہ رہتے ہیں اور پھر گمراہی کے عالم میں مر جاتے ہیں''۔

اللہ نے طلبِ علم کو انسان کی فطرت میں خمیر کردیا ہے۔ بچہ جب تھوڑا سمجھدار ہوجاتا ہے تو ہر چیز کے بارے میں پوچھتا ہے کہ ''یہ کیا ہے؟، یہ کیوں ہے؟، یہ کیسا ہے؟''۔ ''کیا''، ''کیوں'' اور ''کیسے'' یہ سوال ہیں اور سوال علم کی کنجی ہوتی ہے۔اس طرح ہوش سنبھالتے ہی طلبِ علم کی خواہش انسان میں بیدار ہوجاتی ہے۔پھر کتنا بدنصیب ہے وہ شخص جو اس پودے کو پنپنے ہی نہیں دیتا اور کونپل نکلتے ہی اسے دفن کردیتا ہے۔ پھر بھی کچھ ایسے لوگ رہتے ہیں جو اپنی اس جبلّت کو مرنے نہیں دیتے لیکن ان کیلئے بھی یہ دشواری ہے کہ ان کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جتنی زیادہ کتابیں پڑھیں گے اتنا ہی زیادہ ان کا علم بڑھے گا۔حالانکہ یہ چیز فائدہ دینے کی بجائے الٹا نقصان دیتی ہے۔ کتابیں چونکہ تضادات کا مجموعہ ہوتی ہیں اس لئے یہی تضادات انسان کے ذہن میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور ان تضادات کے

ہجوم سے بعض اوقات انسان پاگل ہو جاتا ہے یا کم از کم نیم پاگل تو ہوتا ہی ہوتا ہے اور ایسی بہت سی مثالیں عملی دنیا میں ہمارے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مطالعے کے بارے میں انسان کو بہت SELECTIVE ہونا پڑتا ہے کیونکہ انسانی زندگی محدود ہے اور علم لامحدود ہے۔ اسی لئے امیرؑ المومنین نے فرمایا ہے۔ ''علم اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ اس کا احاطہ کیا جا سکے۔ پس علم کے بہترین حصے کو حاصل کرو''۔ (حکمتِ بوتراب ج ۱ صفحہ ۳۱۲)۔ نیز فرمایا۔ ''تیرے لئے سب سے اہم علم وہ ہے کہ جس کے بغیر عمل قبول نہیں ہوتا''۔ (حکمتِ بوتراب ج ۲ صفحہ ۳۴۴)

اس کی ایک مثال آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک ہرا بھرا جنگل ہے جس میں پھول بھی ہیں پھل بھی ہیں، پتے بھی ہیں اور گھاس بھی۔ وہاں ایک گدھا گھوم رہا ہے جو ہر چیز میں منہ مارتا ہے اور کھا کھا کر اس کا پیٹ پھول کر کُپّا بن گیا ہے۔ اسی جنگل میں ایک حکیم بھی موجود ہے۔ وہ نہ پھول کیطرف دیکھتا ہے نہ پھل کیطرف، نہ پتوں پر نگاہ کرتا ہے اور نہ گھاس پر۔ وہ سیدھا ایک بُوٹی کی طرف جاتا ہے اور اسے توڑ کر گھر واپس آ جاتا ہے۔ اُس بُوٹی سے وہ ایک دوا بناتا ہے جس سے سینکڑوں لوگوں کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ اب انسان خود فیصلہ کر لے کہ اسے گدھا بننا ہے یا حکیم؟۔ لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ ذریعۂ عزت صرف اور صرف علم ہے کیونکہ رسولؐ اللہ نے فرما دیا ہے کہ ''اللہ جاہل کو کبھی عزت نہیں دیتا''۔ علم تو بے حقیقت

لوگوں کے سامنے بھی لوگوں کے سروں کو جھکا دیتا ہے جیسا کہ امیرؑالمومنین نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''علم اس کیلئے بھی بہترین شرف ہے جس کا کوئی ماضی نہ ہو''۔

حصولِ علم کیلئے بنیادی چیز ''فہمِ دین'' ہے اور اس کا مطلب ہے کہ کسی کا کلام سن کر سامع کے ذہن تک جو مفہوم پہنچے وہ وہی ہو جو کہنے والے کی مراد ہو۔ یعنی معنی اور مفہوم میں کوئی فرق نہ پڑے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ سننے والا کہنے والے کے مزاج اور اُس کے لہجے سے مانوس ہو۔ ہم چونکہ علمِ دین کے حوالے سے بات کر رہے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان چاہے علم کا پہاڑ ہی کیوں نہ بن جائے لیکن دین اس کی سمجھ میں اس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک وہ لہجۂ معصومؑ سے مانوس نہ ہو جائے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ وہ قلبی اعتبار سے انؑ سے وابستہ ہو۔ ہم نے بڑے بڑے مدعیانِ علم کو دیکھا ہے لیکن جب انہیں ٹٹولا جائے تو معلوم ہو گا کہ نہ وہ قرآن کو سمجھتے ہیں اور نہ حدیث ان کی سمجھ میں آتی ہے، وہ فقط قرآن و حدیث کے ظاہری الفاظ کو رٹ لیتے ہیں اور انہیں موقعہ بے موقعہ استعمال کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں معصومؑ سے کوئی لگاؤ یا تعلق نہیں ہوتا لہٰذا ذائقۂ علم چکھنا ان کے نصیب میں ہوتا ہی نہیں۔ اسی لئے امام رضاؑ نے فہم کو مومن سے مخصوص کیا ہے اور فرمایا ہے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ہر مومن محدّث ہو۔ مقصد یہ ہے کہ مومن کو فہمیدہ ہونا چاہیئے''۔ (عیونِ اخبارالرضاؑ)۔ اب اِس ''فہم'' کو حاصل کرنے کی ترتیب کیا ہے، یہ ہم جناب امیرؑالمومنین کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''علم فہم سے

حاصل ہوتا ہے، فہم شعور سے ملتا ہے اور شعور بصیرت کا نتیجہ ہے"۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ حصولِ علم کیلئے سر کی آنکھوں سے زیادہ دل کی آنکھوں (بصیرت) کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے لئے جو اہم ترین چیز ہے وہ غور وتدبر ہے جس کے بغیر فہم وشعور وبصیرت رکھتے ہوئے بھی انسان علم کی گہرائیوں میں نہیں اتر سکتا۔ اسی لئے امیرؑالمومنین نے فرمایا ہے کہ "غور کرنے سے بڑھ کر کوئی علم نہیں"۔

علم صرف شیعوں کو ہی ملتا ہے

ہم نے عرض کیا تھا کہ علم ایک پاک چیز ہے اور پاک دلوں میں ہی اترتا ہے۔ آپ نے امام جعفر صادقؑ کا فرمان بھی پڑھا کہ علم ایک ایسا نور ہے کہ اللہ جسے ہدایت کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں قرار دیتا ہے۔ نور بھی پاک چیز ہے اور پاک ظرف میں ہی ٹھہرتا ہے۔ ہدایت بھی پاک لوگوں کو ہی دی جاتی ہے اور ایسے طیّب الروح والبدن لوگوں کو زبانِ معصومؑ نے شیعہ کہا ہے اور علم کو انہی لوگوں سے مخصوص کیا ہے۔ چنانچہ القطرۃ من بحار ج ۴ صفحہ ۱۹۰ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "ہم اپنے شیعوں میں سے جس کسی کو چاہتے ہیں اپنا علم عطا کرتے ہیں"۔ "جس کسی" کی قید امامؑ نے اس لئے لگائی ہے کہ علم کیلئے طلب ایک شرطِ لازمی ہے۔ علم تو محبوب کی طرح ہے جو بے طلب نہیں ملا کرتا۔ امام محمد باقرؑ نے بھی اس بات کی توثیق فرمائی ہے کہ نصیب علم انؑ کے شیعوں کیلئے ہی مخصوص ہے۔ تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۴۶۲ پر آپؑ فرماتے ہیں۔

''علمِ امامؑ ہر چیز پر پھیلا ہوا ہے لیکن صاحبانِ تقویٰ یعنی انؑ کے شیعوں کو ہی اس تک رسائی حاصل ہوتی ہے''۔

علم کا ماخذ ومعدن قرآنِ مجید ہے۔ جن لوگوں کے قلوب نجس ہیں وہ قرآن کے حروف والفاظ، اس کی ظاہری ساخت اور اس کی صرفی اور نحوی تراکیب کو ہی علم سمجھتے ہیں۔ لیکن علمِ قرآن کا مطلب مشیتِ متکلم تک پہنچنا ہوتا ہے اور یہ اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک متکلم اپنی مشیت کو خود دلوں میں نہ اتار دے۔ علمِ قرآن کے دو حصے ہیں۔ قراءت اور معنی۔ جہاں تک قراءت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں۔ ''ہمارا جو بھی محبّ اور شیعہ اس حالت میں مرے کہ وہ اچھے طریقے سے قرآن نہ پڑھ سکتا ہو تو اسے اس کی قبر میں قرآن کی تعلیم دی جائے گی تاکہ اس کے ذریعے اس کے درجات میں اضافہ کیا جا سکے''۔ (تفسیرِ نورالثقلین ج ۵ صفحہ ۲۲۸)۔ اور مرنے سے پہلے اپنی زندگی کے دوران اگر وہ اچھی طرح سے قرآن نہ پڑھ سکا ہو تو اس کے بارے میں اصولِ کافی کتابِ فضل القرآن میں خود رسول اللہؐ فرماتے ہیں۔ ''میری امت کا غیر عربی اگر قرآن کو اپنی زبان (لہجے) میں پڑھے گا تو فرشتے اس کو عربی لہجے میں بارگاہِ الٰہی میں پہنچائیں گے''۔

اب رہی تعلیمِ معنیِ قرآن کی بات تو اس کیلئے میرے مولا امیرؑ المومنین کا ایک ہی جملہ کافی ہے۔ ہم ان کے غلام ہیں اور ان کے فرمان پر اعتماد و وثوق رکھتے ہیں۔ اگر کوئی

شک کرتا ہےتو کرتا رہے کیونکہ اس بد بخت کا تو نصیب ہی شک ہے۔ یہ فرمان تفسیرِ نور الثقلین میں بھی موجود ہے لیکن یہاں ہم اسے القطرۃ من بحارج ا صفحہ ۳۵۰ سے نقل کرر ہے ہیں۔میرے مولاؑ نے فرمایا (اور کس سے فرمایا ؟۔خود ملکۂ کائنات بی بی فاطمۃ الزہراءؑ سے اور وہ بھی رسولِ ؐکا ئنات کی موجودگی میں):۔

''میں نے اپنے شیعوں کو قرآن پڑھایا ہے''۔

اس بات پر توجہ دینا ضروری ہے کہ اس جملے میں میرے مولاؑ نے مستقبل کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ میں اپنے شیعوں کو قرآن پڑھاؤں گا۔ بلکہ آپؑ نے یہاں ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ گویا اُس خالقِ کُل نے اپنے شیعوں کی طینت میں علمِ قرآن کو خمیر کر دیا ہے۔ اس طرح یومِ الست سے لیکر آج تک علیؑ کا ہر شیعہ ہدایت یافتہ بھی ہے اور تعلیم یافتہ بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے علم کا ادراک نہ کر سکتا ہو اور اسی لئے میرے مولاؑ نے علم سماعی پر زور دیا ہے تا کہ ان کا شیعہ جزو سے کُل کیطرف سفر کر سکے۔ جیسے جیسے وہ علم کی منازل طے کرتا جائے گا ویسے ویسے اسے وہ سب کچھ یاد آتا جائے گا جس کی تعلیم اسے پہلے ہی دی جا چکی ہے اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرے مولاؑ نے فرمایا۔ ''اگر خداوند عالم نے خودستائی سے نہ روکا ہوتا تو بیان کرنے والا (یعنی خود امیرالمومنینؑ) اپنے وہ فضائل بیان کرتا کہ مومنین کے دل جن کی معرفت (پہلے سے) رکھتے ہیں''۔ (نہج البلاغہ) اور مومن بِن بتائے ان فضائل کو اس لئے جانتا ہے کہ یوم الست اسے اِن باتوں کے پہلے ہی تعلیم دی جا چکی

ہے۔

استادِ ازل

پس شیعوں کو جان لینا چاہیئے، تسلیم کر لینا چاہیئے اور یقین کر لینا چاہیئے کہ ان کا معلّم مولوی نہیں ہے بلکہ وہی استادِ ازل ہے جس نے پہلی ہی نظر میں جوہرِ علم دلِ مومن میں ودیعت کر دیا اور آج بھی وہ ہر لمحہ ہر آن پاک دلوں پر الہام کرتا ہے۔ مقصّر ان باتوں کا مذاق اڑاتا ہے کیونکہ وہ خود اِس کیفیت سے گزرا ہی نہیں اور نہ گزر سکتا ہے۔ جب رشتۂ محبت استوار ہو جاتا ہے تو ہمارا محبوب نہ صرف دلوں پر القاء کرتا ہے بلکہ منھ میں الفاظ بھی ڈال دیتا ہے۔ پھر انسان اُسی کی زبان بولنے لگتا ہے۔ اُس کے لہجے میں وہی مٹھاس اور وہی بے ساختگی آ جاتی ہے۔

طوطی ایک پرندہ ہوتا ہے جو انسانوں کی طرح بولتا ہے۔ لیکن اوّل اوّل اسے بولنا سکھانا پڑتا ہے اور اُس کو سکھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اُس کو ایک آئینے کے سامنے بٹھا دیتے ہیں اور آئینے کے پیچھے کوئی انسان چھُپ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہاں بیٹھ کر باتیں کرتا ہے۔ طوطی آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر یہ سمجھتی ہے کہ شاید اس کا ہم جنس بول رہا ہے اور اُسے دیکھ دیکھ کر وہ خود بھی بولنے لگتی ہے۔ ہمارا محبوب بھی شاید پیکرِ بشری میں اسی لئے آیا تھا کہ ہم اسے دیکھ دیکھ کر

بولنا سیکھیں اور اپنی تربیت کریں۔ علم تو اس نے پہلے ہی دے دیا تھا، اب بولنا بھی سکھا دیا۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استادِ ازل گفت ہمان می گویم

مجھے تو طوطی کیطرح آئینے کے پیچھے بٹھا دیا گیا ہے اور میں تو وہی کچھ بولتا ہوں جو میرا استادِ ازل پہلے ہی فرما چکا ہے۔

نگہدارِ محبت............ایمان

دینِ خدا کی بنیاد عقل پر نہیں بلکہ فطرت پر ہے کیونکہ مراحلِ دین طے کرتے ہوئے بہت سی ایسی چیزوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو ماورائے عقل ہوتی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی وسعتیں دنیا و آخرت کا احاطہ کئے ہوئے ہیں جبکہ عقل انسانی محدود ہے جس کا کام ہادی کو پہچاننا ہوتا ہے اور جب پہچان لے تو پھر خود کو اپنے ہادی کے سپرد کر دینا ہی عقل کا تقاضا ہے کیونکہ یہی ہادی وہ فطرت ہے جس پر ہر شے کو خلق کیا گیا ہے اور ہر شے اپنی فطرت کی جستجو میں مصروف نظر آتی ہے۔ یہی فطرت دین بھی ہے، ایمان بھی ہے اور ہادی بھی۔ اسی لئے ہادی کو قرآن میں دین بھی کہا گیا ہے اور ایمان بھی اور اللہ کے نبیؐ نے اسے کلِّ ایمان کی سند دی ہے۔ اس فطرت کو تلاش کرنا اور پہچاننا ہی عقل کا فریضہ ہے۔ سورۂ روم میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اللہ کی بتائی ہوئی فطرت جس پر اس نے آدمیوں کو پیدا کیا ہے یہی ہے''۔ اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''اللہ نے اپنی توحید، محمدؐ کے رسول اور علیؑ کے امیرالمومنین ہونے پر پیدا کیا ہے''۔ (تفسیر فرات صفحہ ۲۲۷)۔

یہی فطرت ہے، یہی دین ہے اور یہی ایمان ہے جو محبت کی حفاظت کرتا ہے اور اسے خواہشاتِ نفسانی کی دستبرد سے بچاتا ہے اور انسان کے درجات بلند کرتا ہے جیسا کہ

تفسیرِ نور الثقلین ج ۱صفحہ ۸۷۴ پر امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''جتنا کسی کا ایمان مضبوط ہوتا ہے، خداوندِ عالم اُس کے درجات میں بھی اتنا ہی اضافہ کرتا ہے''۔ ایمان کی مفصل تعریف ہم کشف المسائل میں بیان کر آئے ہیں جسے دوہرانا تحصیلِ حاصل کے مترادف ہوگا۔ البتہ اس کے دیگر متعلقات پر ایک مختصر گفتگو ضرور کی جائے گی۔

شرطِ ایمان

ایمان کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان کا عقیدہ اُس کے علم پر استوار ہو۔ یعنی جو کچھ وہ مانتا ہوا سے جانتا بھی ہو اور معصومؑ نے بھی اسی کی تاکید کی ہے کہ ''وہ عقیدہ اختیار نہ کرنا جس کا تمھیں علم نہ ہو''۔ لہٰذا ایمان کی پہلی شرط علم ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ وہ کون سا معیار ہے جس پر ہم لوگوں کو پرکھیں اور دیکھیں کہ کون مومن ہے اور کون مومن نہیں ہے۔ یعنی وہ کم سے کم خصوصیات کون سی ہیں جن کی بنا پر کسی کو مومن سمجھا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ ایمان کا تعلق خالصتاً ولایتِ علیؑ سے ہے لہٰذا ہم مومن اسے سمجھیں گے جو ولایتِ علیؑ پر ایمان رکھتا ہے، اس کا اقرار کرتا ہو، اس کی شہادت دیتا ہو، علیؑ سے محبت کرتا ہو، علیؑ کے دشمنوں کو دشمن رکھتا ہو اور علیؑ کی ولایت و امامت میں کسی غیر کو شریک نہ کرتا ہو تو یہ ایمان کا پہلا درجہ ہے اور ایسے شخص کو ہم مومن کہہ سکتے ہیں۔ کسی کے دل کو ٹٹولنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے کیونکہ ہماری تکلیف صرف ظاہر تک محدود ہے۔

ایمان کا دوسرا درجہ یقین ہے اور یقین کی علامت یہ ہے کہ انسان کبھی شبہے میں مبتلا نہ ہو، کبھی تذبذب کی کیفیت اس پر طاری نہ ہو۔ اگر کسی بھی ایسی شے میں جس کا تعلق معصومؑ سے ہو، انسان کے ذہن میں تذبذب پیدا ہو تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ابھی منزلِ یقین تک نہیں پہنچ پایا۔ یقین کی ضد شک ہے۔ اور یہ وہ بری بلا ہے جو انسان کو کفر کی حدوں تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ کفر میں داخل ہو جانے کے بعد بھی یہ شک ختم نہیں ہوتا بلکہ ایسی حالت میں انسان کے ہر عقیدے کی بنیاد شک ہوتا ہے۔ اس کیفیت کے بارے میں امام رضاؑ فرماتے ہیں۔ ''جس شخص کے دنیاوی کفر و نافرمانی کی وجہ سے اللہ اسے اپنی جنت اور دارِ کرامت کو فراموش کرانے کا ارادہ کرتا ہے تو اُس کے سینے کو تنگ اور گھٹا ہوا بنا دیتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ اپنے کفر میں بھی شک کرنے لگ جاتا ہے اور اپنے اعتقادِ قلب سے بھی مضطرب ہو جاتا ہے''۔

حفاظتِ ایمان

لہٰذا ایمان کی ٹھنڈک دل میں محسوس کر لینے کے بعد انسان کو مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ رہنا چاہیئے بلکہ ہر لمحے اس کی حفاظت کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے۔ ایمان کی اوّل حفاظت علم سے کی جاتی ہے اس لئے لازم ہے کہ جہلاء سے دور رہا جائے جیسا کہ امام رضاؑ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ''جو شخص دین کو اچھی طرح سے جانتا پہچانتا ہو اس کیلئے اہلِ جہل

کے ساتھ رہنا سہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ جاہلوں کے ساتھ رہن سہن رکھنے میں یہ اندیشہ موجود ہے کہ کہیں وہ اپنے علم کو نہ چھوڑ دے اور جاہلوں کے ساتھ نہ مل جائے''۔ (عیونِ اخبار الرضاً۔ ج ۲ صفحہ ۱۹۸)۔ اور یہ سمجھ لیجئے کہ جاہل وہ ہوتا ہے جو اپنے جہل پر قناعت کرلے اور یہ سمجھنے لگے کہ جتنا وہ جانتا ہے اس کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔

چونکہ میرا موضوع اغیار نہیں ہیں اس لئے میں نہ تو ان کے بارے میں سوچتا ہوں اور نہ لکھتا ہوں۔ میں اپنے دشمن کو اغیار میں نہیں بلکہ اپنی ہی صفوں میں ڈھونڈتا ہوں، اس لئے کہ میرے ایمان کو باہر والوں سے کوئی خطرہ نہیں بلکہ اصل خطرہ ان سے ہے جو میری صفوں کے اندر ہیں اور انہی سے ہوشیار رہنے کی ائمہ معصومین نے ہدایت کی ہے جیسا کہ امیرالمومنین کا ارشاد ہے کہ ''بچو اُس کمینے شخص سے جو خود کو شیعہ کہتا ہے''۔ نیز تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۷۴ پر آنجناب ہی کا ارشاد ہے کہ ''گھٹیا لوگوں سے پرہیز کرو۔ گھٹیا لوگوں کے اذہان میں اللہ کا خوف نہیں ہوتا۔ ان میں انبیاءؑ کے قاتل اور ہمارے دشمن ہوتے ہیں''۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم غیروں کے سامنے تقیہ کیا کرتے تھے۔ لیکن آج وہ دور آگیا ہے کہ ہمیں غیروں سے نہیں بلکہ اپنوں سے تقیہ کرنا پڑرہا ہے۔ میری کتابوں کو صرف شیعہ ہی نہیں پڑھتے بلکہ بہت سے اہلسنت بھی ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ یقین فرمالیجئے کہ مجھے اہلسنت کا ایک بھی فرد ایسا نہیں ملا جس

نے میری کتابیں پڑھکر مجھ پرغلو کاالزام لگایا ہو۔ بلکہ بعض لوگوں کوتو میں نے وجد کے عالم میں دیکھا۔لیکن دل دُکھتا ہے اُن لوگوں کودیکھ کر جوبظاہر روتے پیٹتے بھی ہیں اور سینہ بھی کوٹتے ہیں لیکن میرے مولاؑ کے فضائل سن کرآپے سے باہرنظر آتے ہیں۔وہ جاہلانِ ازلی جن کوخود اپنی بھی خبرنہیں۔جنہیں نہ غلو کا کچھ پتہ ہے نہ تقصیر کا، وہ بھی ہمارے بارے میں زہر اگلنے اورنصیری نصیری کا شور مچانے میں مشغول ہیں۔نقلِ کفر کفر نہ باشد لیکن ایسے لوگوں کو یہ تک کہتے سنا گیا ہے کہ "علیؑ کو اتنا ہی رکھو جتنے وہ ہیں"۔ایسی باتیں سن کردل خون کے آنسو روتا ہےلیکن شاید اسی میں ہماری آزمائش ہے۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حضرت ختمی مرتبتؐ نے فرمایا ہے۔ "اُن لوگوں کیلئے ہلاکت ہے جن کی وجہ سے مومن کوتقیہ کرنا پڑے"۔(تفسیر نورالثقلین ج۲ صفحہ۷۴)۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں معصومؑ فرماتے ہیں۔"یہ وہ لوگ ہیں جوحق بات سننے کے روادارنہیں ہیں اور یہ لوگ امیرالمومنینؑ کا ذکرِ خیر سننے پرآمادہ نہیں ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خسارہ اٹھایا ہے"۔اس کے برعکس وہ لوگ جوبظاہر شیعہ عقائد نہیں رکھتے لیکن انہوں نے اہلبیتؑ سے دشمنی بھی نہیں باندھی، ان کیلئے ائمہؑ معصومین نے نرم رویہ اپنایا ہے۔چنانچہ تفسیرِ نورالثقلین ج۳ صفحہ۳۸۰ پرلکھا ہے کہ کسی نے امام محمد باقرؑ سے عرض کی کہ "ہمارے پاس ایک میزان (معیار) ہے اور وہ میزان یہ ہے کہ جوبھی ہمارے عقیدے میں ہمارے موافق ہوتو ہم اُس سے محبت کرتے ہیں اور جوہمارے عقیدے کے خلاف ہوتو ہم اس سے بیزاری اختیار کرتے

ہیں"۔امامؑ نےفرمایا۔"خدا کافرمان تیری بات سےزیادہ سچا ہے۔تو نے ان لوگوں کو شمار کیوں نہ کیا جن کے متعلق اللہ نے کہا۔"وہ لوگ جنہوں نے کچھ نیک اور برے عمل مخلوط کئے ہیں"(توبہ۱۰۲)۔(یہاں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نجات پانے کے اعتبار سے عمل سے مراد عقیدہ ہے)۔

اب تک ہم نے حفاظتِ ایمان کے سلسلے میں دو باتیں عرض کی ہیں۔ایک تو جاہلوں سے الگ رہنا اور دوسرے مقصروں سے اپنے آپ کو بچانا۔تیسری چیز جس سے خود کو محفوظ رکھنا ہے وہ امورِ دین میں ذاتی رائے کا عمل دخل ہے جس کے بارے میں ہم نے اپنی گزشتہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا ہے۔یہاں ہم صرف تین احادیث نقل کر رہے ہیں جن سے ظاہر ہو جائے گا کہ یہ چیز ایمان کیلئے کتنی مہلک ہے۔

۱۔معانی الاخبار۔صفحہ۴۴۲۔حدیث۴۲۔

"معصومؑ سے پوچھا گیا کہ کمترین چیز کون سی ہے کہ جس کی وجہ سے بندہ کافر ہو جاتا ہے"۔آپؑ نے فرمایا۔"ایسی رائے کہ وہ اسے حق کے مخالف دیکھے، پھر بھی اس پر قائم رہے"۔

پس جو لوگ حکمِ معصومؑ کے خلاف حکم لگاتے ہوں اُن سے وابستہ رہنا یقیناً ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔

۲۔معانی الاخبار۔صفحہ۴۴۲۔حدیث۴۳۔

"امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ وہ کم ترین چیز کون سی ہے کہ جس کیوجہ سے بندہ

کافر ہو جاتا ہے؟''۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''اس کا کسی بدعت کو ایجاد کرنا، پھر اس کی ذمہ داری اٹھانا اور اس کی مخالفت کرنے والے سے بیزاری کرنا''۔

پس کسی کا اپنی ذاتی رائے سے فتوے جاری کرنا اور پھر یہ ذمہ داری اٹھانا کہ جو بھی اس کے فتووں پر عمل کرے گا وہ اللہ کے سامنے جوابدہ نہیں ہوگا، یقیناً عدمِ ایمان کی دلیل ہے۔

۳۔ اب ہم ایک ایسی حدیث پیش کرر ہے ہیں جس سے ان لوگوں کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے جنہوں نے بزورِ طاقت ایک خطۂ زمین پر حکومت حاصل کرلی ہے اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلامی قوانین کا نفاذ کرر ہے ہیں۔

تفسیرِ نور الثقلین ج ۴۔ صفحہ ۱۰۰

جنابِ امیر المومنین نے فرمایا۔ ''ہر وہ عمل جو اللہ کے منتخب بندوں کے علاوہ کسی اور کے ہاتھوں نافذ ہو تو بندوں کے ذاتی قائم کردہ حدود، عہود، قوانین، رسوم اور ان کے آئین و دستور کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ قابل قبول نہیں ہیں اگر چہ ان پر ایمان کے الفاظ کا اطلاق ہی کیوں نہ ہوتا ہو''۔

ہم جو حفاظتِ ایمان پر اتنا زور دے رہے ہیں اور اس پر اتنا وقت صرف کرر ہے ہیں وہ اسلئے ہے کہ اوّل تو ایمان شرطِ عمل ہے۔ اس کے بغیر کوئی عمل قبول ہوتا ہی نہیں۔ جیسا کہ نحل ۹۷ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''مرد اور عورت میں سے جو بھی نیک عمل کرے جبکہ وہ

مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی عطا کریں گے"۔ دوئم یہ کہ ایمان نہ صرف مومن کو عذاب سے بچاتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں کافر سے بھی عذابِ خدا کو رفع کرتا ہے۔ یہ حیرت کی بات تو ہے لیکن ہے ایسا ہی۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ "اللہ دو وجوہات کی بناء پر اپنے عذاب کو روک لیتا ہے۔ اوّل اس لئے کہ اللہ جانتا ہے کہ وہ گنہگار بندہ مومن ہے اور وہ توبہ کرلے گا اور اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ دوئم اس لئے کہ وہ بندہ خود تو مومن نہیں ہوتا لیکن اس کے صلب سے کوئی مومن آنے والا ہوتا ہے"۔ (القطرۃ من بحار۔ ج ۲ صفحہ ۱۴) ۔ اب ہم حفاظتِ ایمان کے بارے میں دیگر ایسی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے بغیر ایمان قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ایمان کی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ ان میں سے پہلی چیز اخلاص ہے اور دوسری چیز ثباتِ قدم۔

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ ایمان بالکل خالص ہو اور اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو۔ اس میں کوئی ذاتی غرض شامل نہ ہو، اس میں کسی غیر کی محبت شامل نہ ہو۔ آپ اگر سنہار کی دوکان پر ایک تولہ سونا بھی خریدنے جائیں تو اس پر طرح طرح کی جرح کرتے ہیں اور اس بات کی گارنٹی لیتے ہیں کہ وہ خالص ہے۔ جب آپ ایک تولہ سونے میں بھی کسی قسم کا کھوٹ گوارا نہیں کرتے تو پھر غور فرمائیے کہ آپ کا مولاؑ کیونکر کوئی کھوٹی چیز خرید سکتا ہے؟۔ ثباتِ قدم کا مطلب یہ ہے کہ صرف دائرۂ ایمان میں داخل ہو جانا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز وہاں پر قائم رہنا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت

کا فیصلہ زندگی پر ہوتا ہے۔ یعنی زندگی میں اچھے کام کئے تو بخشا جائے گا اور بُرے کام کئے تو عذاب پائے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا فیصلہ زندگی پر نہیں بلکہ موت پر ہوتا ہے۔ یعنی یہ نہیں دیکھا جاتا کہ انسان نے زندگی کس حال میں گزاری بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ انسان کس حال پر مرا۔ اس موقعے پر مجھے حضرتِ ختمی مرتبتؐ کی ایک دعا یاد آتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اسے حرزِ جاں بنالیں۔ آپؐ فرماتے ہیں۔ ''خدایا! جب تک زندگی میرے لئے فائدہ مند ہو اس وقت تک مجھے زندہ رکھنا، اور جب موت میرے لئے فائدہ مند ہو تو اس وقت مجھے موت دے دینا''۔ اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان کی زندگی کو بھی بامقصد ہونا چاہیئے اور مرتے وقت بھی وہی مقصد اس کے پیشِ نظر رہنا چاہیئے اور اس کیلئے ثباتِ قدم کی ضرورت پڑتی ہے جو کہ ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ اگر مشکل نہ ہوتا تو ہر نماز میں ہم سے یہ دعا نہ کرائی جاتی کہ ''پروردگار ہمیں صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ''۔ انسان زندگی میں ثابت قدم رہے گا تب ہی وہ موت کے وقت ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ میرے مولاؑ امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''اخلاصِ عظیم خطرے کا شکار رہتا ہے، یہاں تک کہ یہ دیکھا جائے کہ اس کا انجام کس کیفیت پر ہوا''۔ رہی یہ بات کہ ثابت قدم کس چیز پر رہنا ہے اور ایمان کیا چیز ہے تو اس کے بارے میں امام زین العابدینؑ نے یوں وضاحت فرمائی ہے۔

''جو شخص غیبتِ امامؑ میں ہماری ولایت پر ایمان رکھ کر ثابت قدم رہے گا اللہ اس کو

شہداءِ بدر واُحد کے مرتبے کے ایک ہزار شہداء کا اجر عطا فرمائے گا"۔(کمال الدین وتمام النعمہ حصہ اوّل صفحہ ۳۴۳)

یہ تھے وہ امور جن کا بیان کرنا ضروری تھا تا کہ صرف ایمان رکھنے کو ہی کافی نہ سمجھ لیا جائے بلکہ اس کی حفاظت پر بھی کڑی توجہ رہے۔ جب انسان یہ سب کچھ کرے گا اور وہ دعا مانگتا رہے گا جس کی تعلیم رسولؐ نے دی ہے تو پھر اللہ خود اس کے ایمان کی حفاظت کرے گا جیسا کہ اس نے وعدہ کیا ہے۔حضرت حُر علیہ السلام بظاہر کفر کے شکنجے میں پھنسے ہوئے تھے اور وہی تھے جو ایک ہزار کا لشکر لے کر امامِ مظلومؑ کا راستہ روکنے کے لئے گئے تھے لیکن چونکہ وہ مومن تھے اِس لئے اللہ اِس حال میں بھی اُن کے ایمان کی حفاظت کرر ہا تھا۔ریاض القدس۔حصہ اوّل۔صفحہ ۳۶۱ پر شیخ صدوق سے منقول ہے کہ حُرؑ اپنی منزل سے نکلا ہی تھا کہ اُس نے ایک ندا سنی کہ "اے حُرؑ! تجھے خیر کی بشارت دی جاتی ہے"۔ یہ آواز تین مرتبہ آئی۔لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ اپنی کوشش میں لگا رہے اور اللہ سے امید وابستہ رکھے، کبھی مایوس نہ ہو اور نہ کسی وسوسے پر کان دھرے اور دیکھے کہ اللہ اُس سے کیا وعدہ فرما رہا ہے۔

تفسیرِ نور الثقلین۔ج ۴ صفحہ ۲۱۱،۲۱۲۔رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے فرمایا۔

"میرے کچھ مومن بندے ایسے ہیں جو اپنے لئے عبادت کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں لیکن میں انہیں اس سے روک دیتا ہوں تا کہ ان میں خود پسندی نہ پیدا ہو اور وہ

خود پسندی کیوجہ سے ہلاک نہ ہو جائیں۔ میرے کچھ مومن بندے ایسے بھی ہیں جن کا ایمان افلاس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، اگر میں انہیں دولت مند بنادوں تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ میرے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کا ایمان دولت و امارت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر میں انہیں غربت و افلاس میں مبتلا کردوں تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ میرے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کا ایمان بیماری کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر میں انہیں تندرست کردوں تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ میرے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کا ایمان صحت و تندرستی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر میں انہیں بیماری دے دوں تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ میں اپنے بندوں کے دلوں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں اور اپنے علم کے مطابق ان کے امور کی تدبیر کرتا ہوں اور میں ہی صاحبِ علم اور صاحبِ خبر ہوں"۔

ہدایت

ایمان اور ہدایت لازم وملزوم ہیں۔ اگر ہدایت نہ ہو تو ایمان کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا اور ہدایت بھی صرف مومن کی ہی کی جاتی ہے، غیرِ مومن کا اس سے کوئی تعلق نہیں نہیں جیسا کہ طٰہٰ ۸۲ میں ارشاد ہوا۔ "میں اس کیلئے ضرور ضرور بڑا بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور عملِ صالح کیا پھر ہدایت پائی"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر کسی کو ہدایت نہیں ملتی بلکہ توبہ، ایمان اور عملِ صالح کے مراحل سے جب انسان گزرے تب

کہیں جا کر اسے ہدایت کی جاتی ہے۔قرآنِ مجید میں لفظِ ہدایت تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا،صراطِ مستقیم تک پہنچانا اور صراطِ مستقیم پر قائم رکھنا۔ رہنمائی کرنا نبی کا کام ہوتا ہے،ہاتھ پکڑ کر منزل تک پہنچانا امام کا کام ہوتا ہے اور قائم رکھنا ولی کا کام ہوتا ہے۔ دوسری بات میں بڑی معذرت کے ساتھ عرض کر رہا ہوں۔معذرت اس لئے کہ مجھ پر پہلے ہی بہت سے فتوے لگے ہوئے ہیں، ڈر ہے کہ ان میں ایک اور فتوے کا اضافہ نہ ہو جائے۔ ہدایت ہمیشہ گمراہ کی جاتی ہے اور چونکہ ہدایت مومن سے مخصوص ہے اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت پانے سے پہلے مومن بھی گمراہ ہوتا ہے۔اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے کیونکہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔''اللہ مومنین کا ولی ہے اور انہیں اندھیرے سے نکال کر نور کیطرف لاتا ہے''۔ پس ثابت ہوا کہ مومن ہوتے ہوئے بھی انسان اندھیرے میں ہوسکتا ہے۔ جو صاحبان قرآن کی تلاوت اور تفہیم کا ذوق رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ نے قرآن میں نور سے میرے مولا علیؑ کو مراد لیا ہے اور صراطِ مستقیم بھی ولایتِ علیؑ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مجھے اس کیلئے آیات و احادیث نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ باتیں میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ یہاں اپنی بات کی سند کے طور پر صرف ایک قولِ معصومؑ پیش کرتا ہوں اور یہ فرمان میرے مولا امیرؑ المومنین کا ہے جو تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۶۱ پر موجود ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔''ہدایت سے مراد ولایت ہے''۔

جو کچھ عرض کیا گیا اسے سمجھ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ جب تک آپ گمراہی کو نہیں سمجھیں گے اس وقت تک ہدایت کو بھی نہیں سمجھ سکتے لہٰذا اس بات کو جان لیجئے کہ صرف گمراہی کے لفظ کو سن کر اچھل پڑنا کوئی عقلمندی نہیں ہے کیونکہ گمراہی کی دو اقسام ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم کو معیوب نہیں کہا جا سکتا جبکہ دوسری قسم انتہائی مذموم ہے اور غضبِ خداوندی کو دعوت دینے والی ہے۔ ایک گمراہ وہ ہوتا ہے جسے اپنی منزل کا علم ہوتا ہے اور وہ منزل تک پہنچنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے لیکن اسے راستہ نہیں ملتا۔ یہ وہ گمراہی ہے جسے معیوب نہیں کہا جاتا اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کا کوئی دوست آپ کے گھر آنے کا ارادہ کرے، اسے آپ کے محلے کا بھی پتہ ہے، آپ کے گھر اور گلی کا نمبر بھی اسے معلوم ہے لیکن یہ علاقہ اس کا دیکھا ہوا نہیں ہے اس لئے لوگوں سے پوچھتا ہوا آتا ہے، بعض اوقات غلط فہمی کی بناء پر کسی غلط گلی میں مڑ جاتا ہے اور بالآخر بڑی خاک چھان کر وہ آپ کے گھر پہنچتا ہے۔ لفظی اعتبار سے یہ بھی گمراہی ہے لیکن جب ایسا شخص آپ کے گھر پہنچے گا تو آپ ہرگز اُسے بُرا بھلا نہیں کہیں گے بلکہ اس سے ہمدردی کریں گے۔ اور یہ بات صرف عام آدمیوں تک ہی محدود نہیں انبیاءؑ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ معرفتِ ولایتِ علیؑ کی راہ میں انہیں بھی بڑی خاک چھاننی پڑتی ہے اور اس کی دلیل سورۂ شعراء کی آیت ۲۰ ہے جسمیں ارشاد ہوتا ہے۔ ''(موسیٰ نے کہا) میں نے وہ کام اس وقت کیا تھا جب میں ضالّین میں سے تھا''۔ اب اِس ضالّین کا موازنہ اگر کوئی سورۂ الحمد کے ضالّین سے کرنے لگے تو یہ اس کی کوتاہیِ عقل

کی دلیل ہوگی۔ بہر حال یہ وہ گمراہی ہے جس کی بناء پر اللہ نے مومنین کو محتاجِ ہدایت قرار دیا ہے۔ بلکہ اس کی بناء پر خود کو ان کا ولی قرار دیا ہے۔

دوسری قسم کی گمراہی وہ ہوتی ہے جہاں انسان کو اپنی منزل کا علم نہیں ہوتا، نہ ہی اُس کا ارادہ منزل تک جانے کا ہوتا ہے۔ اُس کا کام صرف بھٹکنا ہوتا ہے۔ اس کی مثال چوپائے ہیں۔ آپ نے اکثر گائے بھینسوں کا ریوڑ دیکھا ہوگا جن کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوتی ہیں اور وہ ٹن ٹن ٹن ٹن کرتی ہوئی چلتی رہتی ہیں، چلتی رہتی ہیں۔ جہاں تھک گئیں وہاں بیٹھ گئیں، پھر اٹھ کر چل دیں۔ اسی لئے اللہ نے بھی نہ پرندوں کو گمراہ کہا نہ درندوں کو گمراہ کہا بلکہ چرنے والے چوپایوں کو گمراہ کہا بلکہ انہیں گمراہی کا رول ماڈل قرار دیا۔ جیسا کہ فرقان ۴۴ میں ارشاد ہوتا ہے۔

''یا تم گمان کرتے ہو کہ یقیناً ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں ہیں مگر چوپایوں کی مانند، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ''۔

یہ غول تو راہوں میں بھٹکنے کیلئے ہے
چلنا ہے تو کترا کے چلو ہمسفروں سے

اب ہم بیان کرتے ہیں کہ یہ ضالّین، جو چوپایوں کے مانند ہیں، یہ کون ہیں۔ یہ بہر حال ذہن میں رکھیئے کہ ہدایت کا مطلب ہے معرفتِ ولایتِ علیؑ۔ گمراہی چونکہ ہدایت کی ضد ہے اس لئے اس کا مطلب ہے ''معرفتِ ولایت علیؑ سے عمداً بے

بہرہ رہنا"۔

۱۔تفسیرِ نورالثقلین ج اصفحہ ۵۵۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

"مغضوب سے مراد ناصبی اور ضالّین سے شک میں مبتلا وہ افراد مراد ہیں جنہیں امامؑ کی معرفت حاصل نہیں ہے"۔

۲۔تفسیرِ نورالثقلین ج ۳صفحہ ۲۳۰۔امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔

"ضالّین وہ ہیں جنہوں نے میثاق کو بھلا دیا"۔

۳۔تفسیرِ نورالثقلین ج ۴صفحہ ۳۵۔جنابِ امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔

"لوگو! آگاہ رہو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مجھے کچھ اسماء سے مخصوص کیا ہے (مثلاً آیت اللہ حجتہ اللہ وغیرہ) ان اسماء پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ دین میں گمراہ ہو جاؤ گے"۔

۴۔تفسیرِ نورالثقلین ج ۳صفحہ ۱۷۴۔امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔

"شیاطین ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو گمراہ کرنے کے طور طریقے القاء کرتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے گمراہ کرنے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں"۔

ہم نے ضالّین کو پہچان لیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کسی شیعہ میں یہ خصوصیات ہو سکتی ہیں؟۔اس کا جواب تفسیرِ نورالثقلین ج اصفحہ ۵۴ پر حضرتِ ختمی مرتبتؐ یوں دیتے ہیں:۔

"علیؑ کے شیعہ وہ ہیں جن پر اللہ نے ولایتِ علیؑ کا انعام کیا ہے۔ ان پر نہ تو خدا کبھی غضبناک ہوا اور نہ ہی وہ لوگ کبھی گمراہ ہوئے"۔ پس معلوم ہوگیا کہ شیعہ وہ ہوتے ہیں جو معرفتِ امامؑ میں کوشش کرتے رہتے ہیں، جنہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی میثاق کو نہیں بھلایا، جو ایک دوسرے کو گمراہ کرنے کے طریقے نہیں بتاتے، جو اسماء و القاباتِ امیرؑ المومنین پر قبضہ نہیں کرتے اور جو کفرانِ نعمت نہیں کرتے یعنی کسی ایک لمحے کے لئے بھی ولایتِ علیؑ سے غافل نہیں ہوتے۔ جب یہ معیارات آپ نے جان لئے تو ہر شخص کو انہی کسوٹیوں پر پرکھیئے اور اگر ان میں سے کوئی ایک خصوصیت بھی کسی میں نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ وہ مغضوب اور ضال ہے، اگر چہ وہ شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔

جب ہم نے گمراہی کو سمجھ لیا تو اب ہم ہدایت کے بارے میں گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں۔ گمراہی کا تفصیلی ذکر ہم نے اس لئے کیا کہ بغیر اس کو جانے ہوئے ہدایت سمجھ میں نہیں آسکتی اور اس بارے میں مولا امیرؑ المومنین کا ایک فرمان ہمارے پیشِ نظر تھا جس میں آپ فرماتے ہیں۔ "جان لو کہ تم ہدایت کو اس وقت تک نہ پہچان سکو گے جب تک اس کے چھوڑنے والوں کو نہ پہچان لو۔ اور تم قرآن کے عہدوپیمان کے پابند نہ رہ سکو گے جب تک اس کے توڑنے والے کو نہ جان لو اور اس سے وابستہ نہیں رہ سکتے جب تک اسے پھینکنے والوں کی شناخت نہ کرلو"۔ (تفسیرِ نورالثقلین ج ۳ صفحہ ۴۸۲)۔
ہم عرض کر چکے کہ ایمان اس وقت تک کام نہیں آتا جب تک انسان ہدایت نہ پالے

اور یہ بات قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے۔خود امیرؑالمومنین نے بھی یہی فرمایا ہے کہ "لفظِ ایمان صادق آنے کیوجہ سے نجات نصیب نہیں ہوتی ،صرف ایمانی دعویٰ ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہدایت یافتہ ہونا بھی ضروری ہے"۔(تفسیرِ نور الثقلین ج ۳۔صفحہ ۲۴۵)۔ہدایت پانے کی پہلی شرط تو میرے مولاؑ نے یہ لگادی کہ پہلے گمراہوں کو پہچانا جائے اور گمراہی اور گمراہوں کی نشاندہی ہم نے تفصیل سے کردی ہے تاکہ آپ کسی سے دھوکا نہ کھاسکیں۔دوسری شرط یہ ہے کہ پہلے خود ہدایت کو سمجھا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ آپ نماز روزے کیطرف دعوت دینے والوں کو بھی ہادی سمجھ بیٹھیں۔

غرض یہ ہے کہ ہدایت کا تعلق اس پہلے عہدوپیمان سے ہے جوروزِ الست ہم سے لیا گیا تھا۔کیونکہ اسی عہد کی پاسداری کرنے پر ہماری نجات کا دارومدار ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے، وہ چاہتا ہے کہ اپنے بندوں پر اپنی نعمتوں کی بارش کرے لیکن چونکہ وہ عادل ہے اس لئے اسکی عطا کیلئے استحقاق کا ہونا ضروری تھا۔اور استحقاق بھی صرف اتنا کہ انسان کو صرف ایک وعدہ نبھانا تھا۔اصولی طور پر جب انسانوں سے وہ وعدہ لے لیا گیا اور انسانوں نے وہ وعدہ کرلیا تو اب یہ وعدہ کرنے والوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنا وعدہ یادرکھتے، وعدہ لینے والے کی یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ وہ بار بار یاد دہانی کراتا۔لیکن یہ اس کی انتہائے کریمیت تھی کہ اُس نے انسان کو زمین پر بعد میں بھیجا، پہلے اپنے اس نمائندے کو بھیج دیا جو یاددہانی کرانے والا تھا۔سلسلۂ نبوت جاری

کرنے کا مقصد یہی تھا کہ انسانوں کو مسلسل وہ وعدہ یاد دلایا جاتا رہے۔ اسی یاددہانی کا نام ہدایت ہے۔ یعنی جس کی ولایت کا عہد کرکے انسان اس دنیا میں آیا تھا تو دنیا میں آکر اسے پہچاننا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا اور یہ کام اس کیلئے اس وقت تک ممکن نہ ہوتا جب تک کہ اللہ اپنے ولی کا تعارف نہ کرا دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں جگہ جگہ اللہ نے فرمایا کہ ہدایت کرنا صرف میرا کام ہے اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن مومنین اللہ کے اس احسان کا اقرار کریں گے اور اس کا شکریہ ادا کریں گے جیسا کہ سورۂ اعراف ۴۳ میں ارشاد ہوا۔ ''اور وہ (مومنین) کہیں گے کہ الحمد ہے اُس اللہ کیلئے جس نے ہمیں اِس کیطرف ہدایت کی۔ اور اگر اللہ ہماری ہدایت نہ کرتا تو ہم خود ہدایت نہیں پا سکتے تھے''۔

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''اُن کا مقصد یہ ہوگا کہ اللہ نے ہمیں امیرالمومنین اور ائمہ ہدیٰ کی ولایت کا راستہ دکھایا اسی لئے وہ لائق حمد ہے۔ اور اگر اللہ ہمیں ان کی ولایت کی راہ نہ دکھاتا تو ہم از خود راہِ ولایت کو نہیں دیکھ سکتے تھے''۔ (تفسیرِ نورالثقلین ج ۳ صفحہ ۴۷۳)۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ''الحمد للہ ربّ العالمین'' کا تعلق بھی صرف اور صرف ولایتِ علیؑ سے ہے۔

اس مقام پر لازم ہے کہ ''ہادی'' کے تصور کو واضح کر دیا جائے کیونکہ اگر چہ بظاہر ہدایت کا فریضہ انبیاءؑ ادا کرتے ہیں لیکن اللہ کا دعویٰ یہی ہے کہ ہدایت کرنا صرف میرا کام ہے لہٰذا اُس اللہ کو تلاش کرنا انتہائی ضروری ہے جو ہادیِ حقیقی ہے اور اس مقصد کیلئے ہم

صرف دو آیات پیش کریں گے۔

ا۔ رعد ۷۔ ''ماسوا اس کے نہیں کہ (اے رسولؐ) تو تو (صرف) ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کیلئے ایک ہادی ہے''۔ تفسیرِ فرات صفحہ ۲۴۲ پر منقول ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسولؐ اللہ نے عرض کیا کہ پروردگار میں تو ڈرانے والا ہوں لیکن ہادی کون ہے؟۔ اللہ نے فرمایا۔ ''یا محمدؐ! وہ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ ہیں جو ہدایت پانے والے کا مقصد اور امام المتقین ہیں۔ وہ میری رحمت سے تیری امت کو جنت کی طرف ہدایت کریں گے''۔ اس سے پتہ چلا کہ علیؑ خود ہی مقصد ہیں اور اس مقصد کی طرف دعوت دینے والے بھی وہی ہیں یعنی میرا مولاؑ اپنی ہی طرف لوگوں کو ہدایت کرتا ہے۔

۲۔ شوریٰ ۵۲۔ ''اور (اے رسولؐ) اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر سے تھی، تجھے کیا معلوم تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا، لیکن ہم نے اس (روح) کو نور قرار دیا جس سے ہم جس کی چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں''۔

نہج الاسرار میں امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''میں ہوں اللہ کی روح اور اس کا امر''۔

اور تفسیرِ نور الثقلین میں امام محمد باقرؑ ارشاد فرماتے ہیں۔ ''اللہ جس کسی کی بھی ہدایت کرتا ہے علیؑ ہی کے ذریعے کرتا ہے''۔

اتحاد بین المسلمین

ممکن ہے کہ بظاہر آپ کوایسا لگے کہ ہم کسی غیر متعلقہ موضوع کیطرف آگئے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ روحِ ایمان کو سمجھنے کیلئے اس موضوع پر توجہ کرنا انتہائی ضروری ہے جو اقتدار کے بھوکے لوگوں نے لوگوں کو گمراہ کرنے کیلئے ایجاد کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صدیوں سے اپنے چہروں پر نقاب ڈالا ہوا تھا لیکن جیسے ہی انہوں نے حکومت کی بو محسوس کی ویسے ہی ان کے سارے نقاب اتر گئے۔ ان لوگوں کا نہ کوئی دین ہے نہ مذہب، البتہ انہوں نے کسی نہ کسی مذہب کا لیبل اپنے ماتھے پر ضرور لگا رکھا ہے تا کہ پہچانے نہ جائیں۔ یہ اس نعرے کا ہی کرشمہ ہے کہ اس کے فریب میں آکر بے شمار لوگ اپنے عقائد سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں حالانکہ ان کو یہ تک معلوم نہیں کہ اتحاد کس جانور کا نام ہے اور آیا یہ ممکن بھی ہے یا نہیں اور آیا یہ مقصودِ خداوندی ہے بھی یا نہیں؟۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک معاشرتی زندگی کا تعلق ہے تو ہر باشعور انسان کی خواہش اور کوشش یہی ہوتی ہے کہ معاشرے میں فتنہ و فساد نہ ہو بلکہ تمام لوگ امن و آشتی کے ساتھ زندگی گزاریں چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہمارا دین بھی یہی تعلیم دیتا ہے اور عقلِ سلیم کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لیکن اسے اتحاد نہیں کہتے بلکہ اتفاق کہتے ہیں۔ اتفاق کی ضد اختلاف ہے اور اتفاق تو

چند نکات پر بھی ہوجایا کرتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک میں مختلف مسالک کے لوگ رہتے ہیں لیکن مذہب ان کے درمیان وجہ نزاع نہیں بنتا اور وہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے ہیں۔ لہٰذا مختلف العقیدہ لوگوں کے درمیان اتفاق ممکن ہوتا ہے اور ہر مہذب معاشرے میں لوگوں کے درمیان اتفاق ہونا ایک امر لازمی ہے ورنہ عدمِ اتفاق کی صورت میں معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجایا کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک اتحاد کا تعلق ہے تو اس کے معنی ہیں ایک ہوجانا اور اس کی ضد ہے افتراق، یعنی فرقہ فرقہ ہوجانا۔ لہٰذا اگر اتحاد کرنا ہے تو فرقوں کو ختم کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک فرقے موجود ہیں اُس وقت تک اتحاد ایک بے معنی لفظ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ بنصِ فرمانِ رسولؐ، فرقوں کا ختم ہوجانا محالات سے ہے اور اس طرح اتحاد بھی ایک امرِ محال ہے۔ اور اتحاد کا نعرہ ایمان سلب کرنے کا ایک حربہ ہے۔

یہ یاد رکھیئے کہ دین، مذہب، قرآن، یہاں تک کہ خود اللہ کا مقصد انسان کو خالص بنانا ہے اور خالص کرنے کے عمل کے دوران ہمیشہ چھانٹا جاتا ہے، جمع نہیں کیا جاتا۔ سونے کو خالص بنانے کیلئے اسے پگھلا کر اس سے تمام میل کچیل اور دیگر کثافتوں کو دور کیا جاتا ہے تب کہیں خالص سونے کی صورت نظر آتی ہے۔ یہی بات معصومؑ نے بھی فرمائی کہ ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ فقط یہ کہہ دینے سے کہ ہم مومن ہیں، تمھیں چھوڑ دیا

جائے گا؟۔ ہرگز نہیں، بلکہ تمہیں چھانا جائے گا پھٹکا جائے گا، پھر چھانا جائے اور پھٹکا جائے گا، پھر چھانا جائے گا اور پھٹکا جائے گا یہاں تک کہ صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو خالص ہوں گے"۔ (بحار)۔ اللہ تعالیٰ بھی ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ سارے لوگ اکھٹے ہو جائیں بلکہ اس کا مقصد نیکوں اور بدوں کو جدا جدا کرنا ہے۔ جیسا کہ آلِ عمران ۱۷۹ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "اللہ صاحبانِ ایمان کو انہی کے حال پر نہیں چھوڑ سکتا جب تک خبیث اور طیّب کو الگ الگ نہ کر لے"۔ تو کیا ان لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ خبیث و طیّب ایک ہو جائیں؟۔

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ "میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے، سارے جہنم میں جائیں گے سوائے ایک فرقے کے"۔ تو کیا یہ عقل کے دشمن جنّتیوں اور جہنّمیوں کے درمیان اتحاد کرانے چلے ہیں؟۔ مقصودِ خداوندی یہی ہے کہ حق و باطل جدا جدا رہیں۔ اللہ نے اتحاد چاہا ہے تو حبل اللہ یعنی ولایتِ علیؑ کو مرکزِ اتحاد بنایا ہے۔ یہ اس نے ہرگز نہیں کہا کہ دوستانِ اہلبیتؑ اور دشمنانِ اہلبیتؑ متحد ہو جائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جتنے بھی انبیاءؑ وائمہؑ آئے انہوں نے اُن معاشروں کو جو کفر پر متحد تھے، تقسیم کیا ہے۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو سیاسی معاملات پر متحد کرنا نہیں تھا بلکہ ولایتِ علیؑ پر متحد کرنا تھا اور کفر کے نمائندوں نے ان پر ہمیشہ قوم میں پھوٹ ڈالنے کے الزامات لگائے ہیں۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۲۷۴ پر لکھا ہے کہ جب امام محمدؑ

باقرؑ، ہشام بن عبدالملک کے دربار میں پہنچے تو اس نے آپ کو مخاطب کرکے کہا۔ ''تم لوگ ہمیشہ سے مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق تباہ کرتے آئے ہو اور اپنے آپ کو امام کے طور پر متعارف کراتے ہو''۔ گویا ان کے نزدیک اعلانِ امامت و ولایتِ اہلبیتؑ کرنا مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے مترادف تھا، بنی امیہ کی اسی سوچ کو اتحاد بین المسلمین کے نام پر رائج کیا جارہا ہے۔

ائمہ معصومینؑ نے اس بارے میں کیا فرمایا ہے یہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:۔

۱۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۱۶۴۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔

''اللہ جانتا تھا کہ یہ لوگ نبیؐ کے بعد اختلاف کریں گے، اسی لئے اللہ نے امتِ مصطفٰی کے افراد کو اختلاف سے اسی طرح سے روکا جیسا کہ اس نے سابق امتوں کو روکا تھا اور انہیں حکم دیا تھا کہ تم سب مل کر ولایتِ آلِ محمدؐ کا عقیدہ رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو''۔

۲۔ انعام ۱۵۹۔ ''بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا اور گروہوں میں بٹ گئے، آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، پھر وہ انہیں ان کے اعمال کی خبر دے گا''۔

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے حضرتِ امیرالمومنینؑ کو چھوڑ دیا اور گروہوں میں تقسیم ہوگئے''۔ پھر

فرمایا۔ ''ہمارے مخالفین نے اپنے دین کے ٹکڑے کیۓ ہیں''۔(تفسیرِ نورالثقلین ج۳صفحہ۳۱۲)

یہ یاد رکھیۓ کہ اتحاد کیلیۓ کثرت کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔تجلیاتِ حکمت صفحہ ۳۷۵ پر جنابِ امیرؑالمومنین فرماتے ہیں۔ ''تفرقہ اہلِ باطل کا شیوہ ہے چاہے وہ کتنے ہی زیادہ ہوں۔ اتحاد و ہم آہنگی اہلِ حق کا طریقہ ہے اگرچہ وہ کم ہی کیوں نہ ہوں''۔

معیارِ محبت..........معرفت

معرفت، علم کا خلاصہ، اس کا مقصدِ آخر اور اس کی منزلِ مراد ہے جس میں کسی شے کو باقی اشیاء سے جدا کر کے دیکھا اور سوچا جاتا ہے اور اس کے اور باقی تمام اشیاء کے درمیان ایک حدِ تمیز قائم کی جاتی ہے تاکہ اس کی خصوصیات کی انفرادیت نظر آ سکے۔ اوروں کی معرفت شاید آسان ہو لیکن ہم جس کی معرفت پر گفتگو کرنے جا رہے ہیں وہ اس کائنات کا مشکل ترین معروف ہے کیونکہ وہ ہر شے میں موجود ہے اس کے باوجود ہر شے سے جدا ہے۔ وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ وہ قریب بھی ہے اور بعید بھی۔ وہ عینِ عقل بھی ہے اور ماوراءِ عقل بھی۔ کبھی کبھی نظر کو دھوکا ہوتا ہے کہ شاید ہم نے اسے پا لیا، لیکن اگلے ہی لمحے احساس ہوتا ہے کہ ہم تو اس کا نام بھی نہیں جانتے اور پھر مجبور ہو کر اسی سے پوچھتے ہیں کہ یا علیؑ! تیرا نام کیا ہے؟ اور وہ جواب دیتا ہے کہ "میں وہ ہوں جس پر اسم کا اطلاق ہوتا ہی نہیں"۔ اگر آپ اس کشمکش کو دو مصرعوں میں سننا چاہتے ہیں تو میں احمد فرازؔ کا ایک شعر آپ کو سناتا ہوں۔

رتجگے ہوں کہ بھرپور نیندیں، مسلسل اُسے دیکھنا
وہ جو آنکھوں میں ہے اور آنکھوں سے اوجھل، اسے دیکھنا

اگر لاکھوں زندگیاں بھی ہمیں مل جائیں تب بھی ہم اس کی جوتیوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے باوجود وہ ہمارے دلوں میں رہتا ہے اور ہم اُس کا لمس اپنی رگِ جاں میں محسوس کرتے ہیں۔ کیسا محبوب ہے وہ جو بیک وقت وصل اور ہجر دونوں کا مزہ ہمیں چکھاتا ہے۔ مسرّت اور اداسی کے اس حسین امتزاج میں وہ نشہ ہے کہ کوئی ناواقف شخص اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں واعظ
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

حقیقت پسندی کا دامن ہم کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اسی لئے ہم اپنی محبت کا اظہار بھی بہت محتاط طریقے سے کرتے ہیں تا کہ کوئی حرفِ اعتراض زبان پر نہ لا سکے۔ لیکن جس کی معرفت کی بات ہم کرنے چلے ہیں وہ ہے ہی ایسا کہ جب بھی اس کے بارے میں گفتگو کرو تو الفاظ معنی کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کسی کے دل کو ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ اپنی کوتاہیِ ظرف کی خبر لے، قبل اس کے زبانِ طعن دراز کرے۔

غلو

یہ ایک لفظ ہے جو کسی کو اس کی حد سے نکال کر اس سے بلند تر حد میں داخل کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن جن کے دل اندھے ہیں انہوں نے جان بوجھ کر اس لفظ کا

رخ اہلبیتؑ اطہار کی طرف کر دیا اور وہ علیؑ جو تمام حدوں کا خالق ہے، اسی کو محدود کرنے کی کوشش کی جانے لگی اور اس کا مقصد صرف اپنی پگڑی کا شملہ اونچا کرنا تھا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ علیؑ وہ نورِ وحدانیت ہے جس کے آگے کسی کا چراغ جل ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے میرے مولاؑ فرماتے ہیں۔ ''بدترین اندھا وہ ہے جو ہماری فضیلت سے اندھا ہو۔ ہمارا قصور صرف یہی ہے کہ ہم نے اسے حق کی دعوت دی ہے اور ہمارے اغیار نے اسے فتنے اور دنیا کی دعوت دی ہے اور اس نے فتنے اور دنیا کو قبول کیا اور ہم سے بیزاری اختیار کی اور ہم سے عداوت کی''۔ (تفسیر نور الثقلین ج ۵ صفحہ ۲۵۴)۔

آپ اگر تاریخ کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ ہمارے ائمہؑ کا زمانہ انتہائی مخدوش اور خون آشام زمانہ تھا اور ان حالات میں اُنؑ کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے فضائل کھل کر بیان کرسکیں۔ پھر ایسے لوگ بھی اُنؑ کو میسر نہ آتے تھے جو ان کے بلند پایہ فضائل کو برداشت کرسکتے اور اس کا گلہ وہؑ کرتے بھی رہے ہیں جیسا کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''کاش ہمیں سننے والے میسر آتے تو ہم بھی انہیں کچھ سناتے''۔ نہ سنانے پر لوگوں کا یہ حال ہے کہ غلو غلو کا شور مچا کر آسمان سر پہ اٹھا رکھا ہے، اگر وہؑ سنا دیتے تو شاید یہ بد بخت تو خودکشی ہی کر لیتے۔

غلو کی تفصیلات ہم نے اپنی کتاب کشف العقائد میں لکھ دی ہیں اسلیئے ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مقام پر ہم صرف اس بات کا جائزہ لیں گے کہ معصومینؑ نے جو غلو کی مذمت کی ہے تو انہوں نے غالی سے کن لوگوں کو مراد لیا ہے اور بعد میں یہ

لفظ کن لوگوں کیلئے استعمال ہوتا رہا ہے۔

۱۔عیونِ اخبار الرضاؑ ج ۱صفحہ ۳۷۸پر امام رضاؑ فرماتے ہیں۔''اللہ تعالیٰ غالیوں پر لعنت کرے۔ غالی یہودی، نصرانی، قدریہ، مرجیہ اور حروریہ ہیں''۔قدریہ وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے انسان کو مکمل اختیار دے دیا ہے اور خود ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ گیا ہے۔مرجیہ وہ ہیں جو انسان کو مجبورِ محض سمجھتے ہیں اور حروریہ خارجیوں کی ایک شاخ ہے۔آجکل جو نام نہاد شیعہ غلو غلو کا شور مچا رہے ہیں وہ خود تو خارجیوں کی بغل میں بیٹھے ہیں اور مومنین پر غلو کا الزام لگاتے ہیں۔

۲۔کتاب آئینۂ معرفت جو تصوف پر ایک تحقیقی اور مستند مقالہ ہے اس میں غالیوں کی اقسام بیان کی گئی ہیں۔وہ لکھتے ہیں۔''غلاۃ کے اگر حالات اور ایمان پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ وہ صحیح معنوں میں شیعہ نہ تھے''۔پھر انہوں نے غالیوں کے بائیس فرقوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے چند یہ ہیں:۔

(الف) سبائیہ۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے علیؑ کو اسم کی بجائے معنی سمجھ لیا۔

(ب) بنیانیہ۔ان کا قول ہے کہ خدا بصورتِ انسان ہے اور اس کی روح مولا علیؑ میں حلول کر گئی ہے، اُنؑ کے بعد ان کے بیٹے محمد حنفیہ میں، ان کے بعد ان کے بیٹے ابو ہاشم میں ان کے بعد ان کے بیٹے بنیان میں حلول ہے۔

(ج) مغریہ۔یہ بھی تجسیمِ خدا کے قائل ہیں۔

(د) منصوریہ۔ اس کا عقیدہ امام محمد باقرؑ تک ہے (یعنی پانچ اماموں کو مانتا ہے)۔ اس کے بعد وہ خود خدا بن گیا اور امام بھی ہو گیا۔

(ہ) خطّابیہ۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جتنے امام ہیں سب خدا ہیں اور حسنینؑ فرزندانِ خدا ہیں لیکن ابوالخطّاب (اس فرقے کا بانی) ان سے اور علیؑ ابنِ ابی طالبؑ سے افضل ہے۔

(و) ذمّیہ۔ ان کا خیال تھا کہ محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ سب خدا ہیں اور شے واحد ہیں اور روح ان میں برابر ہے، کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔

(ز) زرامیہ۔ اس کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؑ کے بعد امامت محمد حنفیہ کی طرف اور پھر ان کے بیٹے کی طرف اور پھر علی ابنِ عبداللہ ابنِ عباس تک پہنچی اور پھر ان کی اولاد میں منصور تک امامت رہی۔ بعد اس کے خدا ابومسلم (خراسانی) میں حلول کر گیا۔

(ح) نصیریہ و اسماقیہ۔ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے علیؑ ابنِ ابی طالبؑ اور ان کی اولاد میں حلول کیا۔

(ط) باطنیہ۔ ان کا لقب اس لئے ہوا کہ یہ قائل ہیں معتبر باطنِ قرآن ہے نہ کہ ظاہرِ قرآن، بلکہ ظاہر کو ماننے والے گنہگار ہیں۔ انہوں نے محرمات و محارم کو مباح کر لیا۔ ان کے مذہب میں یہ بھی ہے کہ خدا نہ موجود ہے نہ معدوم ہے۔

ان تمام اقسام میں کہیں آپ کو کوئی شیعہ نظر آتا ہے؟۔ ہاں وہ ضرور نظر آتے ہیں جو خود

امام بن بیٹھے تھے اور آج بھی اصل غالی وہی ہیں جو بقلمِ خود امام بن بیٹھے یا پھر وہ جو ایسے لوگوں کو امام مانتے ہیں۔

تقصیر

غلو کے بارے میں تو بڑا شور مچایا جاتا ہے، جس کی حقیقت ہم نے کھول کر بیان کر دی، لیکن تقصیر کے بارے میں کبھی کوئی نہیں سوچتا جو یقیناً باعثِ ہلاکت ہے۔ بلکہ بہت سے مومنین بھی صحیح طور پر اس کے معنی کو نہیں جانتے۔ وہ صرف اس کے لفظی معنوں پر جاتے ہیں یعنی حد سے گھٹانا۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کیونکہ جب یہ ثابت ہے کہ ان کی کوئی حد ہے ہی نہیں تو پھر نہ تو ان کو حد سے بڑھایا جا سکتا ہے اور نہ حد سے گھٹایا جا سکتا ہے بلکہ حقیقی تقصیر یہ ہے کہ ان کیلئے کوئی حد تجویز کی جائے۔ کوئی میرے مولاً کے کتنے ہی فضائل کیوں نہ بیان کرے لیکن اگر وہ ان فضائل کو کسی مقام پر لے جا کر چھوڑ دیتا ہے تو وہ یقیناً مقصر ہے۔ ان کے فضائل تو خیر تصور سے بھی باہر ہیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انہوں نے جو فضائل خود اپنی زبان سے بیان فرما دئے ہیں اگر انسان انہی پر غور کرے تو عمریں گزر جائیں گی لیکن ان کی تہ تک نہیں پہنچا جا سکے گا۔ کجا یہ کہ کوئی کسی مقام پر رک کر کہے کہ بس! فضائل یہیں تک ہیں۔

یہاں ہم مقصر کو پہچاننے کی کوشش کریں گے لیکن ایک غلط فہمی کو دور ہو جانا چاہیئے۔ ایک ہوتا ہے مقصر اور ایک ہوتا ہے منکر۔ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور ان میں

فرق کرنا ضروری ہے اور اس کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ جن لوگوں کو آپ مقصّر کہتے ہیں وہ مقصّر نہیں بلکہ منکر ہیں۔اب ذرا دیکھئے کہ منکر کون ہوتا ہے۔

ا۔تفسیرِ نورالثقلین ج۵صفحہ ۳۸۰۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''جوکوئی اپنے رب کی عبادت میں شریک بناتا ہے تو وہ ہماری ولایت میں بھی اغیار کو شریک بناتا ہے اور وہ ولایت کا انکار کرتا ہے اور ایسا شخص امیرالمومنینؑ کے حق اور انؑ کی ولایت کا منکر ہے''۔

یہاں سے پتہ چلا کہ جو کوئی ائمہ معصومین کے علاوہ کسی اور کی ولایت کو بھی مانتا ہو وہ ولایتِ علیؑ کا منکر ہے،اور جو منکر ہوتا ہے وہ مشرک بھی ہوتا ہے۔اب بتائیے کہ آئندہ آپ ایسے لوگوں کو مقصّر کہیں گے یا منکر؟۔

۲۔القطرۃ من بحار ج۳صفحہ ۵۶۔امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔

''اے سلمان!بدبختی اور مکمل بربادی ہے اُس شخص کیلئے جو ہمارا حق نہیں پہچانتا اور ہمارے فضائل کا منکر ہے۔اے سلمان!جو شخص ہمارے علوم اور امور میں شک و تردید میں مبتلا ہوتا ہے وہ اُس شخص کی مانند ہے جس نے ہماری معرفت اور حقوق کا مذاق اڑایا''۔یہ فرمان بتا رہا ہے کہ جو شخص معرفت سے بیزار ہے اور جو علومِ آلِ محمدؑ کے بارے میں اپنی ساری زندگی شک میں ہی گزارتا ہے وہ منکر ہے اور بدبختی اور مکمل بربادی اس کا مقدر ہے۔اب بتائیے کہ آئندہ ایسے لوگوں کو مقصّر کہیں گے یا منکر؟۔

بعض مقامات وہ ہیں جہاں مقصر اور منکر ایک ہو جاتے ہیں

۳۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۵ صفحہ ۲۸۹۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''اے ابوذر! علیؑ کے منکر کو قیامت کے دن اندھا اور گونگا بنا کر محشور کیا جائے گا اور وہ کہے گا کہ افسوس میری اس تقصیر پر جو میں اللہ تعالیٰ کی جناب میں کرتا رہا''۔

یہ تھا منکر اور اب ہم مقصر کو پہچاننے کی کوشش کرے ہیں۔

۱۔ القطرۃ من بحارج ۲ صفحہ ۲۷۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔

''مقصّر وہ ہیں جنہوں نے اماموں، امر اور روح کی معرفت میں، جو ان پر واجب کی گئی ہے، کوتاہی کی ہے۔ اور امر و روح کی معرفت یہ ہے کہ انسان درک کرتا ہو اور جانتا ہو کہ اللہ نے روح کو جس کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے اور اپنا امر اُس کے سپرد کر دیا ہے وہ اُس کے اذن سے خلق کرتا ہے اور زندہ کرتا ہے۔ اور جو نیتوں میں اور فکروں میں اسے جانتا ہے۔ اور جو واقع ہو چکا اور جو قیامت تک انجام پائے گا وہ سب جانتا ہے اور یہ اس لئے ہے کیونکہ روح اللہ کا امر ہے۔ پس جس کو بھی اللہ اس روح کے ساتھ مخصوص کر دے وہ کامل ہے اور کسی قسم کا نقص اور عیب اس میں نہیں ہے۔ وہ جو چاہتا ہے اذنِ خدا سے انجام دیتا ہے۔ مغرب سے مشرق تک ایک لحظہ میں طے کر سکتا ہے۔ آسمان کی طرف اوپر جا سکتا ہے اور آسمان سے نیچے آ سکتا ہے اور جو چاہے اور جو ارادہ کرے وہ انجام دے سکتا

ہے"۔

اس فرمان میں معصومؑ نے مقصر کی کچھ علامات کی نشاندہی کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے چند فضائل بھی بیان فرمائے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم اس کی تھوڑی سی تشریح کریں تو آپ کے ذہنوں پر بار نہیں ہوگا کیونکہ مومنین کیلئے یہ لازم ہے کہ وہ تقصیر کو سمجھیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ دوسروں کو تو مقصر کہتے رہیں اور خود اپنی خبر نہ لیں۔

اس حدیثِ مبارکہ میں معصومؑ نے مقصّر کی دو پہچانیں بتائی ہیں۔ یعنی ایک تو وہ "امر" کی معرفت نہیں رکھتا اور دوسرے وہ "روح" سے بے خبر ہے لہٰذا ہر مومن کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان دو چیزوں کی معرفت حاصل کرے تاکہ تقصیر سے محفوظ رہے۔ یہاں ہم انتہائی اختصار کے ساتھ ان دو چیزوں کی وضاحت کریں گے۔

امر

امر ارادۂ خدا کے ظہور کا نام ہے۔ ہم اپنی گزشتہ کتابوں میں بھی یہ عرض کر آئے ہیں کہ علمِ خدا سے جو شے سب سے پہلے ظاہر ہوئی وہ مشیتِ خدا تھی۔ مشیت سے ارادہ ظاہر ہوا اور ارادے سے امر۔ "عملِ تخلیق مکمل طور پر تحت امر ہے۔ اس طرح تخلیق ہو یا تقدیر، قضا ہو یا اجل، غرض ہر شے محتاجِ امر ہے۔ پس تمام تخلیقات و تقدیرات کا مالک وہ اولی الامر ہے کہ تمام عالمِ ہست و بود جس کی مٹھی میں ہے۔ میرے مولاؑ نے بھی اس حدیث میں یہی فرمایا ہے کہ اللہ جسے اپنا امر سپرد کردے، پس وہی خلق کرتا

ہے، وہی مارتا ہے، وہی زندہ کرتا ہے، وہی ہے جو نیتوں اور دل میں چھپی باتوں کو جانتا ہے، عالِم ما کان و ما یکون ہوتا ہے، بے عیب ہوتا ہے جس بات پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اگر چہ اسے اذنِ خدا حاصل ہے لیکن وہ جو کچھ کرتا ہے وہ خود اپنی مشیت اور اپنے ارادے سے کرتا ہے۔کون ہے یہ امر؟ یہ جاننے کیلئے جب ہم خطبۃ البیان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو میرے مولا امیرؑالمومنین یہ فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ''میں ہوں اللہ کا امر اور اس کی روح''۔

روح

روح ایک قوت اور انرجی کا نام ہے اور یہ پوری کائنات صرف انرجی کے بل بوتے پر کام کررہی ہے۔بغیر روح کے کوئی بھی شے نہ تو اپنا کام کرسکتی ہے اور نہ اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ جمادات میں جو روح ہے اسے روحِ جمادیہ کہتے ہیں۔نباتات میں روحِ جمادیہ بھی ہے اور روحِ نباتیہ بھی۔حیوانات میں روحِ نباتیہ بھی ہے اور روحِ حیوانیہ بھی۔لیکن جب بات انسان تک پہنچتی ہے تو پھر انسانیت دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی ہے، مومن اور غیر مومن۔ دونوں میں روحِ حیوانی بھی ہوتی ہے اور روحِ عقلانی بھی لیکن مومن میں ایک اضافی روح بھی ہوتی ہے جسے روحِ ایمانی کہتے ہیں۔انبیاءؑ میں تمام روحوں کے علاوہ ایک امتیازی روح ہوتی ہے جسے روحِ نبوتی کہتے ہیں۔ یہ وہ روح ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ وحی کا ادراک کرتے ہیں اور اسے

برداشت کرتے ہیں اور یہی روح ان کی عصمت کی ضامن ہوتی ہے۔ جب یہ روحِ نبوتی اپنے مرتبۂ کمال تک پہنچتی ہے تو ''روح القدس'' کہلاتی ہے اور یہ مخصوص ہے چہاردہ معصومینؑ سے۔ یہ ایک طویل موضوع ہے لیکن ہم نے انتہائی اختصار کے ساتھ صرف اتنا لکھ دیا ہے جس سے ایک عام آدمی تک بھی روح کے بارے میں ضروری معلومات پہنچ جائیں اور اب ہم تلاش کرتے ہیں کہ یہ روح ہے کون؟۔

مولا امیرؑالمومنین فرماتے ہیں۔ ''میں ہی روح ہوں، میں ہی روح الارواح ہوں بلکہ امّ الارواح ہوں''۔ یہ ایک انتہائی بلیغ جملہ ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ ''میں ہی روح ہوں'' سے مراد یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کی زندگی میں ہوں۔ یعنی یہ پورا نظامِ حیات جو قائم ہے اور کام کر رہا ہے اُس کے پیچھے میری ہی قوت کارفرما ہے۔ ''میں ہی روح الارواح ہوں'' کا مقصد یہ ہے کہ جیسے ہر شے کو زندہ رہنے اور کام کرنے کیلئے ایک روح کی ضرورت ہے اسی طرح خود روح کو بھی زندہ رہنے اور کام کرنے کیلئے کسی روح کی ضرورت ہے۔ تو سمجھ لو کہ تمام روحوں کی روح بھی میں ہی ہوں۔ ''میں ہی امّ الارواح ہوں''۔ اُمّ اُس شے کو کہتے ہیں جو کسی شے کو جنم دے اور مولاؑ یہ فرما رہے ہیں کہ تمام روحوں کو پیدا بھی میں نے ہی کیا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ معرفتِ روح تک آپ پہنچ گئے ہوں گے مگر مزید تصریح کیلئے اگر ہم ایک بار پھر سورۂ شوریٰ کی آیت ۵۲ کیطرف رجوع کریں تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

''(اے رسول) اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح وحی کی جو ہمارے امر سے تھی۔ تجھے کیا پتہ تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا۔ مگر ہم نے اُس (روح) کونور قرار دیا جس کے ذریعے ہم جس کی چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں''۔

ہم مقصّر کی تعریفات اور خصوصیات بیان کر رہے ہیں۔ ایک حدیث ہم نے بیان کردی اور اب باقی احادیث کی طرف چلتے ہیں۔

۲۔ ریاض القدس ج ۲ صفحہ ۳۶۱۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا۔

''مقصّر کے اعمالِ حسنیٰ باطل ہیں''۔

۳۔ زیارتِ جامعہ کبیر کا ایک جملہ:۔

''جس نے آپ کے فرمان کوٹھکرا دیا وہ دوزخ کے پست ترین طبقے میں ہے۔ میں خدا کے حضور آپ کے دشمنوں سے بیزاری کرتا ہوں اور طاغوت اور شیاطین اور ان کے گروہ سے بیزار ہوں جنہوں نے ظلم پر ظلم کئے اور جو آپ کے حق کے منکر ہیں اور جو آپ کی ولایت سے خارج ہیں اور جو آپ کے متعلق شک کرنے والے ہیں اور جو آپ سے منحرف ہیں''۔

شاید اس لفظِ منحرف سے کوئی اور معنی نکال لئے جائیں لیکن القطرة من بحار ج ۳ صفحہ ۲۶ پر امام محمد باقرؑ اس لفظ کے حقیقی معنی بتارہے ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں۔ ''جو بھی ان (ائمہؑ) سے منحرف ہوا وہ گمراہ ہوجائے گا اور مقصّر بد بخت ہوجائے گا''۔

بدترین مقصّر

ان تمام مقصّرین میں بدترین مقصّر وہ نام نہاد علماء ہیں جو فضائل علیؑ کو چھپاتے ہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ نورِ خدا کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں لیکن اللہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا اگرچہ مجرم کراہت ہی کیوں نہ کریں۔

۱۔ حکمتِ بوتراب ج ۲ صفحہ ۳۰۲ پر جنابِ امیرؑالمومنین فرماتے ہیں۔ ''انسانوں میں بوجھ کے لحاظ سے وہ علماء ہیں جو مقصّر ہیں''۔

۲۔ بقرہ ۱۵۹۔ ''یقیناً وہ لوگ جو ہمارے نازل کردہ واضح بیانات اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جسے ہم لوگوں کیلئے کتاب میں بیان کر چکے ہیں، اُن پر اللہ لعنت کرتا ہے''۔ اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''یہ چھپانے والے وہ ہیں جو حضرتِ امیرؑالمومنین کے فضائل و مناقب کو چھپاتے ہیں۔ اور جس پر اللہ لعنت کرے اس پر تمام جنّ و انس اور تمام چوپائے لعنت کرتے ہیں''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج۱)

۳۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''اللہ اس مخلوق کو عذاب نہیں دے گا مگر اُن علماء کے گناہوں کی وجہ سے جو انہوں نے علیؑ اور اولادِ علیؑ کے فضائل کو چھپانے کے بارے میں کیئے۔ جو کوئی فضائل علیؑ کو جہالت اور نادانی کی وجہ سے چھپائے تو

وہ ہلاکت اور بربادی کا مستحق ہوگا اور جو کوئی جان بوجھ کر فضائلِ علیؑ کو چھپائے تو وہ منافق ہے کیونکہ اس کی طینت اور خمیر نجس ہے''۔ (القطرۃ من بحار ج ا صفحہ ۲۳۹)

ضرورتِ معرفت

انسان جس شے کا بھی طالب ہوتا ہے تو اس کیلئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس شے کو پہچانتا بھی ہو۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص بازار سے آم خریدنے جائے تو کیا اس کیلئے ضروری نہیں کہ وہ یہ جانتا ہو کہ جو آم وہ خریدنے جارہا ہے اس کی شکل کیسی ہوتی ہے، اس کا رنگ کیا ہوتا، اس کی خوشبو کسی ہوتی ہے؟۔ بصورتِ دیگر اگر پھل والا اسے خربوزہ پکڑا دے تو وہ تو اسے ہی آم سمجھے گا۔ لیکن اگر وہ اس کی شکل، رنگ اور خشبو کو جانتا بھی ہو تب بھی یہ معرفتِ ناقصہ کہلائے گی۔ کامل معرفت اسے تب حاصل ہوگی جب وہ اس کے ذائقے سے آشنا ہوگا کیونکہ مقصودِ اصلی اس کا ذائقہ ہے نہ کہ شکل و رنگ۔ اسی طرح انسان بھی ابتداءً معرفتِ ناقصہ سے کرتا ہے۔ یہ معرفتِ ناقصہ اس کے دل میں محبت کو جنم دیتی ہے۔ جیسا کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے کہ ''انسان اس چیز سے محبت کرتا ہے جسے وہ پہچان لیتا ہے''۔ اور جب وہ محبت کرتا ہے تو اپنے محبوب کو طلب کرتا ہے اور طلب کرنے کا اصل مقصد حقیقت کو پانا ہوتا ہے نہ کہ ظاہر کو جاننا۔ پس محبت کہتے ہیں کسی کے قرب کی چاہت دل میں پیدا ہونے کو اور معرفت نام ہے

اس کوشش کا جو انسان اپنے محبوب سے قریب سے قریب تر ہونے کیلئے کرتا ہے۔
اسے قربِ معنوی کہتے ہیں اور جیسے جیسے یہ قرب بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے حقیقتوں پر
سے حجابات اٹھتے رہتے ہیں اور ویسے ویسے محبت اور طلب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا
ہے۔ گویا محبوب کو پانے کیلئے جس راستے پر سفر کرنا ضروری ہوتا ہے اسے معرفت کہتے
ہیں۔ اس طرح معرفت ایک محبّ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کوئی مشغلہ نہیں ہے جسے
ہر کس و ناکس اختیار کر لے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر انسان دو کام زندگی بھر کرتا ہے
جو اس کے احتیاج کی دلیل ہے۔ ان میں سے ایک تو اس کی نیت ہے جو اس کے ہر
عمل کے پیچھے کارفرما ہوتی ہے، اور وہ ہے طلبِ قربت۔ قربۃً الی اللہ کا یہی مطلب
ہے۔ اور دوسرے اس کا ہر روز کم از کم ۳۴ بار **"اھدنا الصراط المستقیم"**
کہنا ہے، بشرطیکہ وہ اس کا مطلب جانتا ہو۔ تفسیرِ نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۵۰، ۵۳ پر
امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "صراطِ مستقیم سے مراد امیر المومنینؑ اور ہدایت سے مراد
اُنؑ کی معرفت ہے"۔ غرض نیت ہو یا عمل، دونوں کا مقصد علیؑ کا قرب حاصل کرنا اور
اس کیلئے انؑ کی معرفت طلب کرنا ہے۔

ہر انسان کی تمنا فضیلت حاصل کرنا ہوتا ہے اور جس شخص میں یہ تمنا نہیں ہوتی اسے
کمینہ، احمق اور سفیہ کہا جاتا ہے۔ تو یہ سمجھ لیجئے کہ فضیلت بھی معرفت سے ہی ملتی ہے۔
رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ "جس شخص پر اللہ نے احسان فرمایا ہو اور اسے میرے اہلبیتؑ
کی معرفت اور ولایت عطا کی ہو، گویا کہ اللہ نے تمام خوبیاں اس کیلئے جمع کر دی

ہیں"۔(القطرۃ من بحار ج اصفحہ ۷)۔دیکھا جائے تو انسان دنیا و آخرت، دونوں میں معرفت کا محتاج ہے۔ ہم مختصراً چند امور کی نشاندہی کرتے ہیں۔

۱۔ ایمان۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بغیر معرفت کے ایمان ایک بیکارِ محض شے ہے اور اس کی سند پیغمبرِ اسلام کا وہ فرمان ہے کہ "جو شخص امامِ زمانہ کی معرفت حاصل کئے بغیر مرگیا تو وہ جاہلیت، کفر اور نفاق کی موت مرا"۔ اسی طرح امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "انسانوں کیلئے معرفتِ امامؑ کے سلسلے میں کوئی عذر قابلِ قبول نہ ہوگا"۔ (کمال الدین وتمام النعمہ ج ۲۔صفحہ ۴۰۲)

۲۔ علم۔ عقل کی ضرورت علم ہے اور علم کا مقصد معرفت ہے۔ جس علم کا مقصد معرفت نہ ہو وہ بدترین جہل ہے۔ اس لئے امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے۔ "جس نے ہماری معرفت حاصل نہیں کی اس کا علم اسے کوئی فائدہ نہ دے گا"۔ (القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۵۴)

۳۔ عمل۔ عمل وہی مفید ہے جو بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو جائے۔ جو عمل قبول نہ ہو وہ رائیگاں جاتا ہے بلکہ منھ پر مار دیا جاتا ہے اور یاد رکھیئے کہ معرفت شرطِ عمل ہے۔ امامِ جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "تمام اعمال کی ابتداء اور انتہاء ہماری معرفت ہے"۔ (القطرۃ من بحار ج اصفحہ ۸)

۴۔ وقتِ موت۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہوتا ہے اور

اس وقت معرفت کے علاوہ کوئی چیز کام نہیں آتی۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''امامؑ کی معرفت کی اشد ضرورت اُس وقت پیش آتی ہے جب سانس حلق میں آجاتی ہے''۔ (تفسیر نور الثقلین ج۲ صفحہ ۴۰۳)۔

۵۔ میدانِ حشر میں۔ سورۂ القلم ۴۲۔ ''جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور انہیں سجدے کیلئے بلایا جائے گا''۔ اس آیت کی تفسیر امام رضاؑ یوں بیان فرماتے ہیں۔ ''ساق سے مراد نور کا حجاب ہے جو ہٹا دیا جائے گا تو مومن سجدے میں گر جائیں گے اور منافقین کی پشت اکڑ جائے گی اس لئے وہ سجدہ کرنے کے قابل نہیں ہوں گے''۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مومنین اس حقیقتِ ابدی کو پہچانتے ہوں گے جو دنیا میں نور کے حجاب میں چھپی ہوئی تھی اور جب وہ ظاہر ہوگی تو مومنین سجدے میں گر پڑیں گے اور جو لوگ اس سے ناواقف ہوں گے وہ لاکھ کوشش کریں گے مگر سجدہ نہ کر سکیں گے۔

۶۔ نجات۔ یہی انسان کی منزلِ مراد ہوتی ہے اور اسی کیلئے وہ زندگی بھر پاپڑ بیلتا ہے لیکن اس کا ذریعہ بھی معرفت ہی ہے۔ القطرۃ من بحار ج۱ صفحہ ۱۸۰ پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ ''اللہ فرماتا ہے کہ علیؑ مخلوقات پر میری حجت، زمینوں کے درمیان میرا نور اور علم وحکمت پر میرا امین ہے۔ جس نے علیؑ کی معرفت حاصل کر لی میں اسے جہنم میں نہیں ڈالوں گا، اگر چہ وہ میری نافرمانی کرے۔ اور جس نے علیؑ کا انکار کیا میں

اسے جنت میں داخل نہیں کرونگا اگر چہ وہ میری اطاعت کرتا ہو"۔

حقیقتِ معرفت

بہت سے احباب ہم سے پوچھتے ہیں کہ معرفت کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ان کا سوال یہ بتاتا ہے کہ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ معرفت کوئی مشینی عمل ہے یا پھر شاید ان کا اشارہ اُن حلقوں کیطرف ہو جو معرفت حاصل کرنے کیلئے کچھ ریاضات وعملیات تجویز کرتے ہیں جن میں چند مخصوص نمازیں، کچھ تسبیحات، سانس روکنے کا عمل، مراقبے اور چلّہ کاٹنا شامل ہیں۔ یہ بہت بڑی غلط فہمیاں اور نہایت مہلک الجھنیں ہیں جو چند حلقوں کی طرف سے لوگوں میں پھیلا دی گئی ہیں اور جو سادہ لوح ان طریقوں پر عمل کرکے معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بے چارے کہیں کے نہیں رہتے، البتہ ذہنی مریض ضرور بن جاتے ہیں۔ یہ تمام ریاضات وعملیات اس لئے کئے جاتے ہیں تاکہ نفس کی کسی ایک قوت کو بڑھایا جا سکے اور اسے فعّال بنا دیا جائے یہاں تک کہ اس سے ایسے امور صادر ہونے لگیں جو دوسرے لوگوں کیلئے محیّر العقول ہوں اور جنہیں وہ اپنی جہالت کیوجہ سے کرامت سمجھنے لگیں، بلکہ جو لوگ عقل سے بالکل ہی محروم ہیں وہ تو اسے معجزہ کہنے سے بھی چوکتے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ نفسِ انسانی میں بے پناہ طاقتیں چھپی ہوئی ہیں اور چونکہ وہ تمام کی تمام بیک وقت کام کرتی رہتی ہیں اس لئے کوئی بھی قوت اپنی پوری استعداد کا مظاہرہ نہیں کرپاتی۔اگر کسی ایک قوت پر کام کیا

جائے تو باقی قوتیں رفتہ رفتہ پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور دھیمی پڑ جاتی ہیں اور وہ خاص قوت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور ایسے ایسے امور سر انجام دینے لگتی ہے جو عام زندگی میں ناممکن سمجھے جاتے ہیں۔ لوگ اسے معرفت سمجھتے ہیں لیکن حقیقتاً اس کا مقصد لوگوں پر اپنا اقتدار قائم کرنا ہوتا ہے۔ جن لوگوں سے معرفت کے نام پر یہ سب کچھ کرایا جاتا ہے انہیں چاہیئے کہ ہوش میں آجائیں کیونکہ یہ معرفت نہیں بلکہ برین واشنگ ہوتی ہے۔

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ معرفت بارش کی طرح ہوتی ہے کہ انسان جا کر اس میں کھڑا ہو جائے اور چند لمحوں میں سر سے پیر تک پانی میں شرابور ہو جائے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ معرفت بارش کی طرح نہیں بلکہ شبنم کیطرح ہوتی ہے کہ بہت دیر تک انسان کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ رات جب کافی گزر جاتی ہے تب وہ اپنے جسم اور اپنے کپڑوں پر ہلکی ہلکی نمی محسوس کرتا ہے۔ معرفت بھی اچانک نہیں آتی بلکہ غیر محسوس طریقے پر دل میں گھر کرتی رہتی ہے۔ ایک مدت گزر جانے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ پانچ برس قبل میں جس مقام پر تھا وہ تو مقامِ جہل تھا۔ پھر آئندہ پانچ سال بعد جب وہ مڑ کر دیکھتا ہے تو گزشتہ مقام اسے مقامِ غفلت لگتا ہے۔ معرفت اسی طرح سفر کرتی ہے کہ مسلسل بڑھتی بھی جاتی ہے اور انسان کو اپنے حال پر قناعت بھی نہیں کرنے دیتی اور عمر کے ہر حصے میں وہ بہت کچھ جاننے کے باوجود بھی یہی سمجھتا

رہتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔جس دن اس کے ذہن میں یہ خیال آ گیا کہ وہ کچھ جانتا ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا سفرِ معرفت رک گیا۔

اب رہی یہ بات کہ معرفت کیسے حاصل کی جائے ،تو اس کیلئے انسان کو الٹا نہیں لٹکنا پڑتا بلکہ چند امور ہیں جن کا اسے دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ان میں پہلی چیز اخلاص ہے۔یہ مقامِ ''لا'' ہے جہاں ہر شے کی نفی کرنا پڑتی ہے۔باپ؟۔نہیں!۔ ماں؟۔نہیں! بیوی؟۔نہیں! بچے؟۔نہیں!۔غرض دل سے ہر کھوٹ کو دور کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوتا ہے کہ میرا مولاؑ اس میں قدم رکھ سکے۔امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔''جھوٹ بولا اُس شخص نے جو یہ گمان کرتا ہے کہ وہ ہماری معرفت رکھتا ہے جبکہ وہ ہمارے غیر کی رسی سے وابستہ ہو''۔

دوسری چیز توجہ ہے۔یہ مقامِ ''اِلّا '' ہے۔اخلاص کے ذریعے انسان خود کو تنہا کرتا ہے اور توجہ کے ذریعے وہ اپنے محبوب کو تنہا کرتا ہے۔

میں جہاں ہوں ترے خیال میں ہوں

تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے

ایسا شخص رزق کیلئے بھی بھاگ دوڑ کرتا ہے، والدین کی بھی خبر گیری کرتا ہے، بیوی بچوں کی پرورش بھی کرتا ہے، رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ بھی تعلقات کو نبھاتا ہے لیکن اس کا دھیان ایک لمحے کے لئے بھی اپنے محبوب سے نہیں ہٹتا۔وہ اگر لاکھوں

کے مجمعے میں بھی کھڑا ہو تب بھی اپنے محبوب کے ساتھ تنہا ہوتا ہے۔

تیسری چیز علم ہے۔ علم ہی وہ شے ہے جس کے ذریعے انسان اپنے محبوب کی تنہائیوں میں قدم رکھتا ہے۔ یہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا کہ علم کا مقصد ومقصود صرف معرفت ہے۔ جس علم سے معرفت نہ ملے اس کی منزل گمراہی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معرفت کی بنیاد محبت ہوتی ہے لیکن محبت صرف اسی صورت میں پروان چڑھتی ہے جب علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ لہٰذا جو شخص معرفت کا طالب ہو اس کا فرض ہے کہ علم کیطرف سے غافل نہ رہے۔

چوتھی اور سب سے اہم چیز غور وتدبر ہے کیونکہ تفکر وتدبر ہی وہ شے ہے جسے معرفت کی کنجی کہا جا سکتا ہے۔ علم ایک شجرِ بے ثمر بن کر رہ جاتا ہے اگر انسان اس میں تدبر نہ کرے۔ یہی وہ شے ہے جس کیوجہ سے ایک دروازے سے ہزاروں دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہی وہ آبِ حیات ہے جس کیوجہ سے شاخِ علم بڑھتے بڑھتے شجرِ طوبیٰ تک جا پہنچتی ہے۔ معصومینؑ نے فہمِ دین پر بہت زور دیا ہے اور غور وفکر فہم دین کیلئے کھاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ تفکر ہی کے ذریعے انسان کا ہاتھ دامنِ حقیقت تک پہنچتا ہے اور جب انسان حقیقت کے لمس کو محسوس کرنے لگتا ہے تو پھر الہام اور القاء کی ابتداء ہوتی ہے۔ جسے کچھ لوگ وجدان کا نام دیتے ہیں اور اس کے ذریعے انسان بہت سی ایسی چیزوں کا ادراک کر لیتا ہے جو اسے کتابوں میں نہیں ملتیں۔

ہم نے بڑے اختصار کے ساتھ حقیقتِ معرفت کے بارے میں چند اشارات دیئے

ہیں۔اب ان کو سمجھنا، ان کی تشریح کرنا اور ان پر عمل کرنا آپ کا کام ہے لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ محبت، ہدایت، علم اور معرفت کو اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ہمارا کام صرف کوشش کرنا ہے اور ہمارا کوشش کرنا ہی ہماری معرفت کہلاتا ہے ورنہ علیؑ کی معرفت حاصل کر لینا ایک امر محال ہے اور کسی میں یہ طاقت نہیں کہ وہ عارف ہونے کا دعویٰ کر سکے۔اس بارے میں لاتعداد نصوص موجود ہیں لیکن یہاں ہم صرف دو احادیث نقل کرر ہے ہیں۔

۱۔القطرۃ من بحارج ا صفحہ ۶۹۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''ہمارے لئے ایک رب قرار دو کہ جس کی طرف ہم رجوع کرتے ہیں۔اس کے بعد ہماری فضیلت میں جو چاہو کہو''۔پھر فرمایا۔''ممکن نہیں ہے کہ تم ہمارے حق کو ادا کر سکو اور ہمارے علوم و معرفت میں سے تم تک صرف وہ الف پہنچا ہے جس کا عطف نہ ہوا ہو''۔(یہ کمی اور قلّت کی طرف اشارہ ہے)۔

۲۔امام رضاؑ فرماتے ہیں۔''اگر ہمیں اجازت ہوتی کہ اللہ کے نزدیک جو ہمارا مقام ہے وہ لوگوں کو بتا سکیں تو تم میں اسے برداشت کرنے اور قبول کرنے کی طاقت نہ ہوتی''۔(القطرۃ من بحارج ا صفحہ ۷۰)

لہٰذا کبھی یہ گمان نہ کیجئے گا کہ ہم نے اپنی محنت سے معرفت حاصل کر لی کیونکہ یہ خالصتاً عطاءِ خداوندی ہے جو صرف ان پر ہوتی ہے جن کے دل پاک اور خالص ہوتے ہیں۔ جیسا کہ معصومؑ نے فرمایا۔''ہر ایک دل کی دو آنکھیں ہیں۔پس جب اللہ کسی بندے کی

بھلائی چاہتا ہے تو اس کے دل کی دونوں آنکھیں کھول دیتا ہے تا کہ وہ دل کی آنکھوں سے عالم ملکوت کا مشاہدہ کرے"۔ (کوکبِ دری صفحہ ۱۷)۔

آپ اس سے قبل یہ جان چکے ہیں کہ امر وروح کی معرفت کے بغیر انسان مقصر کہلاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ہم امر وروح کی کماحقہٗ معرفت کرسکیں لیکن ہمارے کریم اور سخی آقاؤں نے ہمارے لئے آسانی پیدا کر دی اور ہماری حقیر کوششوں کو قبول کرتے ہوئے ہمیں زندانِ تقصیر سے نکال کر فردوسِ معرفت میں داخل کر دیا۔ اس کرم کا شکر ادا کرنا ہی استحقاقِ معرفت پیدا کرتا ہے۔

اب سنیئے کہ آپ کا آقا کیا ارشاد فرماتا ہے۔

امام زین العابدینؑ نے فرمایا۔ "جو کوئی امر وروح کو کماحقہٗ نہ جانتا ہو لیکن ہمیں دوست رکھتا ہو، ہمارے دشمنوں سے بیزار اور ہماری فضیلت کا قائل ہو وہ نیکی اور خیر وخوبی کے راستے پر ہے، یہاں تک کہ وہ معرفت کے اس مرتبے تک پہنچ جائے (یعنی معرفت کی کوشش میں لگا رہے)"۔ (القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۳۱)۔

معرفتِ امامِ زمانؑ

ہمارا موضوع معرفتِ ولایتِ علیؑ ہے اور اسی معرفت کا مطالبہ اللہ و رسولؐ وائمہؑ طاہرین نے ہم سے کیا ہے، کیونکہ یہی ولایت مطلوب ومقصودِ خدائے لم یزل ہے اور اسی ولایت پر ہماری طہارتِ ولادت، ہمارے ایمان، ہماری دنیا، ہماری آخرت،

ہمارے آغاز اور ہمارے انجام کا مکمل دارومدار ہے۔لیکن ہم ابتداء کرتے ہیں اپنے زمانے کے امامؑ سے۔اور کیوں نہ کریں جبکہ ہمیں آپؑ ہی کے ساتھ محشور ہونا ہے اور آپؑ کی معرفت حاصل کئے بغیر جو مر گیا وہ کفر و نفاق کی موت مرے گا۔اِس بیان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اوّل اقسامِ معرفت۔ دوئم معرفتِ عمومی اور سوئم معرفتِ خصوصی۔

اقسامِ معرفت

معرفت کی چار قسمیں ہیں۔۱۔معرفتِ نسب۔۲۔معرفتِ شرف۔۳۔معرفتِ فضل۔ ۴۔معرفتِ نورانیہ۔

معرفتِ نسب:۔یہ ہے کہ انسان جانے کہ آپؑ کا نام کیا ہے، آپؑ کے والد کون ہیں، آپؑ کے دادا کون ہیں اور آپؑ کا قبیلہ کون سا ہے۔

معرفتِ شرف:۔ یہ ہے کہ انسان اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ جس ہستیؑ کے نسب کی معرفت وہ رکھتا ہے، وہی اس کے زمانے کے امامؑ ہیں اور انہی کے ساتھ اسے محشور ہونا ہے۔

معرفتِ فضل:۔ یہ ہے کہ انسان آپؑ کے ان فضائل سے واقف ہو جو اس دنیا میں ظہور پذیر ہوئے۔ چاہے ان کا تعلق آثار سے ہو یا معجزات سے۔

معرفتِ نورانیہ:۔ یہ ہے کہ انسان اُن کی بشریت سے گزر کر ان کے مقاماتِ نورانیہ

کی معرفت رکھتا ہو۔

معرفتِ عمومی

معرفتِ عمومی میں وہ تمام اوصافِ کمال اور وہ تمام فضائل شامل ہیں جو عقلِ انسانی کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مثلاً نسبِ عالیہ، حلم، علم، سخاوت، شجاعت، عبادت، امامت، ولایت، عصمت اور منزلت وغیرہ۔ کیونکہ امامؑ تمام صفاتِ حسنہ کے نقطۂ کمال پر ہوتا ہے اور ان تمام صفات کا موجود ہونا شرائطِ امامت میں شامل ہے۔ لہٰذا مومن کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ ہر نقص سے امامؑ کو منزہ و مبرا جانے اور ہر کمال کو ان ؑ کیلئے تسلیم کرے اور یہ خیال رکھے کہ ان ؑ کی کسی بھی صفت کو محدود کرنا بھی انؑ میں نقص پیدا کرنا ہے۔ اس معیار کا تعلق امامتِ مطلقہ سے ہے جس کا مرکز و محور اور سرچشمہ مولا امیرالمومنینؑ ہیں۔ لہٰذا جب ہم کسی بھی امامؑ کی معرفت حاصل کرنا چاہیں گے تو ہماری نظریں خود بخود فضائلِ علیؑ کی طرف اٹھیں گی کیونکہ آنجنابؑ کے فضائل ہی معیارِ امامت ہیں اور جب ہم نے ان کی معرفت حاصل کر لی تو یقیناً ہم نے تمام ائمہؑ کی معرفت حاصل کر لی۔ اسی لئے اللہ کے رسولؐ اور تمام ائمہؑ نے ولایتِ علیؑ پر ہی زور دیا ہے۔ کلمہ، اذان، اقامت اور نماز میں بھی ولایتِ علیؑ ہی کا اقرار کیا جاتا ہے اور اسی کی شہادت دی جاتی ہے کیونکہ علیؑ کی ولایت کی شہادت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے تمام ائمہؑ کی ولایت کا اقرار کر لیا اور اس کی شہادت دے دی۔ کیونکہ یہ بظاہر بارہ ہیں

لیکن حقیقتاً سارے علیؑ ہیں۔

بارہ علیؑ

ہم نے کشف المعارف میں عرض کیا تھا کہ نقطے کا بار بار ظہور کرنا خط کہلاتا ہے اور اس طرح خط، نقطے کا مقامِ ظہور ہوتا ہے۔ میرا مولاؑ بھی اگر بارہ مرتبہ ظہور نہ کرتا تو ہرگز پہچانا نہ جاتا۔ نہج الاسرار میں آپؑ فرماتے ہیں۔ ''جس صورت میں خدا چاہتا ہے منقلب ہوجاتا ہوں۔ جس نے ان صورتوں کو دیکھا، مجھے دیکھا۔ اور جس نے مجھے دیکھا اس نے انہیں دیکھا۔ ہم درحقیقت اللہ کا وہ نور ہیں جس کو نہ زوال ہے اور نہ تغیر''۔ نہج الاسرار میں ہی آپ کا یہ فرمان بھی محفوظ ہے۔ ''اے سلمانؓ! میں اور وہ ہادی جو میرے اہلبیتؑ سے ہیں خدا کے رازِ مکنون اور اس کے مقرب اولیاء ہیں۔ ہم سب ایک ہیں۔ ہمارا امر ایک ہے اور ہمارا راز ایک ہے۔ پس ہم میں تفرقہ نہ ڈالو ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے۔۔ ہم ہر زمانے میں حسبِ مشیتِ رحمانی ظاہر ہوں گے''۔ اسی طرح التوحید میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''ہم ہی وہ وجہہ اللہ ہیں جو تمھارے درمیان روپ بدل بدل کر آتے ہیں''۔ پس امامت موتیوں کی وہ لڑی ہے جس کا اوّل بھی علیؑ ہے اور آخر بھی علیؑ۔ اسی لئے میرے مولا نے فرمایا ہے کہ ''کربلا میں مجھے ہی قتل کیا جائے گا''۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ ''عیسیٰؑ میرے ہی پیچھے نماز پڑھیں گے''۔ آپ اگر کلامِ معصومؑ کو غور سے پڑھیں تو بہت سے عقدے خود بخود کھل جاتے ہیں۔ ہم جو کہتے

ہیں کہ یہ بارہ کے بارہ علیؑ ہیں تو اس حقیقت کا اظہار میرے مولاؑ نے متعدد مقامات پر کیا ہے جن میں سے چند آپ ملاحظہ فرما چکے۔ نہج الاسرار میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں آپؑ نے اپنے لئے صیغۂ واحد متکلم یعنی ''میں'' استعمال فرمایا ہے لیکن اپنی صفت کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً جلد اوّل صفحہ ۱۳۴ پر فرماتے ہیں۔ ''میں اللہ کی آیات کبریٰ ہوں''۔ اور اسی جلد کے صفحہ ۲۱۲ پر فرماتے ہیں۔ ''میں ہوں اللہ کے اسمائے حسنہ، امثالِ اعلیٰ اور آیات کبریٰ''۔

ہماری بات آپ تک پہنچ گئی ہوگی کہ ہر امامؑ کی معرفت عمومی مولا امیرؑ المومنین کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ ہماری مجالس ومحافل میں ہمیشہ فضائلِ علیؑ ہی بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ معاذ اللہ دیگر ائمہؑ کو نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ ہر مومن جانتا ہے کہ وہ فضائل جو بیان کئے جارہے ہیں وہ صرف امیرؑ المومنین سے ہی مخصوص نہیں بلکہ ہر امامؑ کے یہی فضائل ہیں اور ان فضائل کے بغیر کوئی امام، امام نہیں ہوسکتا۔ لیکن چونکہ ہر فضیلت کا سرچشمہ میرے مولا علیؑ ہیں اس لئے انہی کو مرکز ومحور بنا کر تمام ائمہؑ کے فضائل بیان کئے جاتے ہیں، بالکل اُسی طرح جیسے ہر امامؑ کے مصائب بیان کرتے وقت مصائبِ حسینؑ کو مرکز بنایا جاتا ہے۔

معرفتِ خصوصی

یہی وہ معرفت ہے جو مقصودِ حقیقی ہے اور جب ہم سے معرفت کا تقاضا کیا جاتا ہے یا جس کے ذریعے ہمارے درجات بلند کئے جاتے ہیں تو وہ یہی معرفتِ خصوصی ہے۔
معرفتِ خصوصی کا مطلب یہ ہے کہ امامؑ کو ان ؑ کی کسی ایسی خصوصیت کے ساتھ پہچانا جائے جو اُن ؑ کے اور دیگر ائمہ ؑ کے درمیان امتیاز قائم کرتی ہو۔ مثلاً جب ہم مولا علیؑ ابن ابی طالبؑ کی معرفت حاصل کریں گے تو اُن ؑ کے ''امیرالمومنین'' ہونے سے کریں گے کیونکہ صرف وہی امیرالمومنین ہیں، ان کے سوا اوّلین و آخرین میں کوئی ایک بھی امیر المومنین نہیں ہے اور یہ آنجناب ؑ کی صفتِ امتیاز ہے اور اسی کے ذریعے آپؑ کو پہچانا جائے گا۔

اسی طرح جب امام حسینؑ کی معرفت حاصل کی جائے گی تو کربلا کے ذریعے کی جائے گی کیونکہ آپؑ کے علاوہ کوئی بھی اس مرحلے سے نہیں گزرا۔ امام سجادؑ کی معرفت ان کے صبر کے ذریعے کی جائے گی کیونکہ بازارِ کوفہ و شام سے ان کے علاوہ کوئی نہیں گزرا۔ اگر یہاں تک بات واضح ہوگئی تو پھر ہم رسولِ اکرم کی وہ حدیث پھر دوہرائیں گے کہ ''جو مر گیا اور اس نے اپنے امامؑ زمانہ کی معرفت حاصل نہ کی تو وہ جاہلیت، کفر اور نفاق کی موت مرا''۔ اور جب ہمیں اس حدیث کی شدت کا احساس ہو جائے گا تو ہم اپنے شب و روز اپنے زمانے کے امامؑ کی معرفت کے حصول میں صرف کریں گے۔

اور جب ہم ایسا کریں گے تو لازماً ہمیں پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ ہمارے امامؑ کی صفتِ امتیاز کیا ہے، کیونکہ یہ طے کئے بغیر ہم انؑ کی معرفت حاصل کر ہی نہیں سکتے۔ ہمارے علماء وخطباء نے تقریری اور تحریری طور پر جتنا بھی کام کیا ہے اس تمام کا خلاصہ ہمارے امامؑ کی معرفتِ عمومی ہے۔ ایک بات جس کا جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ معرفت ہمیشہ ماضی اور حال کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے، مستقبل کے ذریعے نہیں۔ کیونکہ معرفت صفت کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے اور صفت کو اس وقت تک سمجھا اور تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کا ظہور نہ ہو جائے اور مستقبل مقامِ ظہور نہیں بلکہ مقامِ خفی ہے اسلئے یہ ذریعۂ معرفت نہیں بن سکتا۔ ہمارے امامؑ کے زمانۂ ظہور کے حالات کا تعلق بھی مستقبل سے ہے اور جو حضرات مطالعے کا ذوق اور فہمِ دین رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دورِ ظہور کے بارے میں جتنی بھی روایات آئی ہیں ان میں سے اکثر متشابہ ہیں، یہاں تک کہ انؑ کا نام بھی حتمی طور پر ہمیں معلوم نہیں۔ (اس کا ذکر آئندہ سطور میں قدرے تفصیل سے کیا جائے گا)۔ ان حالات میں اس زمانے میں رونما ہونے والے حالات کے ذریعے ہم کوئی ایسی صفتِ امتیاز تلاش نہیں کر سکتے جو ہمیں ہمارے امامؑ کی معرفت کرا دے۔ لہٰذا ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس صفتِ امتیاز کو تلاش کریں کیونکہ صرف اسی صورت میں ہم اپنی تکلیفِ معرفت سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔ جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ کے ماضی کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہے،

نہ ہی ہمارا حال انؑ کے بارے میں کوئی اشارہ دیتا ہے۔ جب ہم اپنی کوشش کی انتہا تک پہنچتے ہیں تو ہمیں ادراک ہوتا ہے کہ ہمارے امامِ زمانہ کی صفتِ امتیاز اگر کوئی ہے تو وہ ان کی غیبتِ مطلقہ ہے۔ یوں تو ہر امامؑ غیبت میں رہا ہے لیکن ان کی غیبت انسانی عقول تک محدود رہی ہے، جسمانی طور پر وہ سب کے سامنے ظاہر تھے۔ لیکن ہمارے امامؑ عقول سے بھی غائب ہیں اور مشاہدے کی قید سے بھی باہر ہیں اور یہی غیبتِ مطلقہ و تامّہ ہے جو انہیں باقی تمام ائمہؑ سے ممتاز کرتی ہے لہٰذا اسی غیبت کے ذریعے ان کی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے اور جو شخص ان کی غیبت کی حقیقت کو نہیں جانتا وہ لاکھ دعوے کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ معرفتِ امامؑ زمانہ سے نا آشنا ہے۔ وہ فقط منزلِ ایمان پر ہے اور نافہمی کیوجہ سے ایمان کو معرفت سمجھ رہا ہے۔ قیامت یہ ہے کہ اس اہم ترین شے کو جس پر معرفتِ امامؑ کا دارومدار ہے، لوگوں نے تماشا بنا رکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ نادانی ہے یا بد نیتی کہ بعض لوگ معرفت کے نام پر اِس پردۂ غیبت کے اندر گھسنے کی کوشش کرتے ہیں اور طرح طرح کے دعوے کرکے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور اپنے جال میں پھانستے ہیں۔ ایسے بیانات بھی میری نظر سے گزرے جن میں نہ صرف خود مشاہدۂ امامؑ کا دعویٰ کیا جاتا ہے بلکہ ایسے عملیات و وظائف بھی تجویز کئے جاتے ہیں جن کے ذریعے جب دل چاہے (معاذ اللہ) امامؑ کو حاضر کیا جاسکتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کیسا خیالی امام ہے جو اپنے ماموین کے قبضے میں

ہے کہ وہ جب چاہیں اسے اپنے سامنے حاضر کر سکتے ہیں۔اس طرح تو روحوں اور جنّات کو بلایا جاتا ہے،امامؑ کا اِن خرافات سے بھلا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟۔

غیبتِ امامؑ

ہمارے بیان سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ (معاذ اللہ) ہمارے امامؑ کی کوئی صفتِ امتیاز ہے ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپؑ کی تو ہر صفت امتیازی ہے۔ گیارہ ائمہؑ سے جتنی بھی صفات ظہور پذیر ہوئیں وہ سب کی سب اپنے نقطۂ کمال پر ہمارے امامؑ سے ظاہر ہوں گی۔ آپؑ ہی کے ذریعے اللہ تمام انبیاءؑ و ائمہؑ کی جدوجہد کو کامیابی تک پہنچائے گا اور نبوت و امامت کا اصل مقصد آپ ہی کے ذریعے حاصل ہوگا۔آپؑ کا فیصلہ کن قیام آپؑ کی امتیازی صفت ہے،آپؑ کی قہاریت آپؑ کی امتیازی صفت ہے،آپؑ کا مکمل علم کا نافذ کرنا آپؑ کی امتیازی صفت ہے،دینِ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کر دینا آپؑ کی امتیازی صفت ہے،ظلم کو مکمل طور پر ختم کر دینا آپؑ کی امتیازی صفت ہے اور پوری دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دینا بھی آپؑ کی امتیازی صفت ہے۔آپ کا وجودِ طاہر و مطہّر بذاتِ خود ایک نشانِ امتیاز ہے۔ جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مقصد فقط اتنا تھا کہ معرفت اس صفت سے حاصل ہوتی ہے جو ظاہر ہو چکی ہو جبکہ ہمارے امامؑ کی صفات کو ابھی ظاہر ہونا ہے۔ ان صفات پر یقین کی حد تک ایمان رکھنا ہم پر لازم و واجب ہے۔ جو امور مستقبل میں وقوع پذیر ہونے

والے ہوں، مثلاً قیامت، ان پر ایمان رکھنا تو ضروری ہوتا ہے لیکن ان کی معرفت حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہماری اس مجبوری کو دیکھتے ہوئے ائمہ طاہرینؑ نے ہمارا مقصدِ حیات ان کا انتظار کرنے اور دعائے تعجیل کرنے کو قرار دیا ہے۔ البتہ ان کی غیبت ہمارے سامنے ہے اس لئے انؑ کی معرفت ان کی غیبت کے ذریعے حاصل کرنا ہمارے لئے ممکن ہے کیونکہ انتظار وہی کرے گا جو ان کی غیبت کو جانتا ہوگا ورنہ امامؑ کا اس دنیا میں تشریف لانا اور پھر غیبت میں چلے جانا عام لوگوں کی نظر میں ایک روایت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی لئے لوگ غیبت پر زبانی کلامی ایمان تو رکھتے ہیں لیکن یقین ان کو ہرگز نہیں ہے، نہ ہی ان کو اپنے امامؑ کا انتظار ہے۔ اگر انتظار ہوتا تو انتظار کی حالت میں انسان پر جو بے چینی طاری ہوتی ہے وہ ان لوگوں پر بھی ہوتی۔ اگر انہیں انتظار ہوتا تو وہ غیرِ معصوم لوگوں کے پیچھے آنکھ بند کر کے نہ بھاگ لیتے۔ اگر انتظار ہوتا تو وہ ہر کس و ناکس کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوتے بلکہ یہ یقین رکھتے کہ ان کی پیشانیاں ان کے امامؑ کے قدموں کی امانت ہیں اور اس امانت میں خیانت نہیں کی جا سکتی۔

یہاں ضمنی طور پر یہ جاننا ضروری ہے کہ غیبتِ امامؑ کا مکمل دار و مدار آپؑ سے پہلے گزرنے والے گیارہ ائمہؑ کی معرفت پر ہے۔ کیونکہ غیبت کے بارے میں جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ انہی مقدس ہستیوں کے ذریعے پہنچا ہے لہٰذا غیبت پر ایمان اور یقین وہی رکھے گا جو گیارہ ائمہؑ کی زبانِ اقدس سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو فرمانِ خدا

سمجھتا ہو، جو ان کی حقانیت پر مکمل اعتماد رکھتا ہو اور فکر و عمل کے ہر مرحلے پر انہی کا تابعِ فرمان ہو۔ ایسی صورت میں وہ اتنا ہی مانے گا جتنا انہوں نے بتادیا ہے، اس میں اپنی طرف سے موشگافیاں نہیں کرے گا۔ یہی تو اس کا امتحان ہے کہ وہ انؑ کے ارشادات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ایک ایسی ہستی کو مان لے جسے اس نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔ لیکن جس کو اپنے ائمہؑ پر اعتماد نہ ہوگا وہ تو حضرتِ حجتؑ کو ماننے کیلئے انہیں دیکھنے کی شرط لگائے گا۔ گویا غیبتِ امامؑ وہ کسوٹی ہے جس پر انسانوں کو پرکھا جائے گا کہ وہ گیارہ ائمہؑ پر کس حد تک ایمان، یقین اور اعتماد رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھ لیجئے کہ اپنی مرجعیت کا جھنڈا گاڑنے والے اور ان کے پیچھے بھاگنے والے نہ صرف یہ کہ ولایتِ امامؑ سے خارج ہیں بلکہ نہ تو انہیں غیبتِ امامؑ پر یقین ہے اور نہ انہیں امامؑ کا انتظار ہے۔

غیبت کے عنوان پر ہم نے اپنی کتاب ''کشف التضاد'' میں ایک مختصر بحث کی ہے جو تفہیمِ غیبت کیلئے انتہائی مفید ہے۔ ہم اِس مقام پر ان مباحث کو دوہرائیں گے نہیں لیکن یہ توقع ضرور رکھیں گے کہ ہمارے قارئین اس کا مطالعہ ضرور فرمائیں گے۔

معرفتِ غیب

معرفت کی بنیاد علم پر ہوتی ہے اور علم کا دار و مدار ان ذرائع پر ہوتا ہے جن کے ذریعے علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم چند حدود میں گھرے ہوئے ہیں جن سے باہر ہم

قدم نہیں رک سکتے۔ لہٰذا علم ہو یا معرفت، دونوں صورتوں میں انسان کو اپنے حدود میں رہ کر ہی کام کرنا ہوتا ہے کیونکہ ان سے باہر وہ نکل ہی نہیں سکتا اور اگر نکلنے کی کوشش کرے گا تو لازماً بہکے گا۔ اللہ نے بھی ہماری ہر تکلیف کو بقدرِ استطاعت رکھا ہے اور جتنی ہماری طاقت ہے اتنا ہی وہ ہم سے سوال کرے گا۔ اب حدودِ انسان کو یوں سمجھئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پانچ قسم کے علوم حاصل کرسکتا ہے۔ ایک وہ علم جو آنکھ کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ دوسرا وہ جو کان کے ذریعے ملتا ہے۔ تیسرا ناک کے ذریعے، چوتھا زبان کے ذریعے اور پانچواں ہاتھ پاؤں کے ذریعے۔ اب اگر انہی علوم پر غور کریں تو عجیب تماشہ نظر آتا ہے۔ آنکھ اُس علم کا تصور بھی نہیں کرسکتی جو ناک کے پاس ہے۔ ناک اس علم کا تصور بھی نہیں کرسکتی جو کان کے پاس ہے، کان اس علم کا تصور بھی نہیں کرسکتا جو ہاتھ کے پاس ہے۔ اس طرح ہر حس کیلئے باقی حسّیات غیب ہیں۔ گویا ہمارا پورا وجود مختلف غیبوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور ہم کسی کے بتائے بغیر بھی جان سکتے ہیں کہ غیب کیا ہوتا ہے اور اللہ نے اس طرح ہم پر حجت قائم کردی ہے کہ اب ہم کسی صورت بھی غیب کا انکار نہیں کرسکتے۔ لیکن جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ ناقصِ غیب ہے۔ غیبِ مطلق وہ ہوگا جو ہماری پانچوں حسّیات سے باہر ہو، یعنی جس کا ادراک نہ ہماری آنکھ کرسکے نہ ناک نہ کان نہ زبان اور نہ ہاتھ پاؤں۔ یہی غیبِ مطلق ہے جسے اللہ نے ''الغیب'' کہا ہے۔

لفظِ ''مطلق'' ہم نے اپنی کتابوں میں بار ہا استعمال کیا ہے، دوسری کتابوں میں بھی

آپ پڑھتے رہے ہوں گے لیکن حیرت ہمیں اس وقت ہوئی جب ایک صاحب نے بھری محفل میں ہم سے پوچھ لیا کہ ''یہ مطلق کیا ہوتا ہے؟''۔ تب ہمیں احساس ہوا کہ اس لفظ کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر چیز کی ایک ضد ہوتی ہے۔ مثلاً علم کی ضد جہل اور قدرت کی ضد عجز ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کسی شے کا علم رکھتا ہے اور کسی کا نہیں رکھتا، کسی شے پر قدرت رکھتا ہے اور کسی پر نہیں رکھتا۔ گویا اس کے علم میں جہل اور اس کی قدرت میں عجز شامل ہے۔ یعنی اس میں دونوں ضدیں موجود ہیں۔ مطلق وہ ہوتا ہے جس میں اُس کی ضد کا گزر نہ ہو۔ یعنی ایسا علم جس میں جہل کا گزر نہ ہو جیسا کہ امام رضاؑ نے فرمایا کہ ''امامؑ وہ ہوتا ہے جس سے کوئی بھی چیز پوچھی جائے تو وہ یہ نہ کہے کہ میں نہیں جانتا''۔ یہ علمِ مطلق ہے۔ قدرتِ مطلقہ وہ ہوگی جہاں عجز کا گمان تک نہ ہو اور جس کیلئے کہنا پڑے کہ **''علیؑ'' علیٰ کُلِّ شئٍ قدیرا''**۔ اب اگر ''مطلق'' آپ کی سمجھ میں آ گیا تو اب جانیئے کہ غیب کی ضد ہے شہود۔ پس غیبِ مطلق یعنی ''الغیب'' وہ ہوگا جس میں شہود کا گزر تک نہ ہو یعنی عقلاً محال ہو۔ غیبِ مطلق وہ نہیں ہوسکتا جو کبھی غیب ہو جائے اور کبھی شہود بن جائے۔ یا کسی کیلئے غیب بن جائے اور کسی کیلئے ظاہر ہو جائے۔ ورنہ ایسا غیب تو میں بھی ہوں اور آپ بھی ہیں۔ جب ہم اپنے گھر میں ہوتے ہیں تو باہر والوں کیلئے غیب ہوتے ہیں اور جب باہر نکلتے ہیں تو ظاہر ہو جاتے ہیں۔ امامؑ کے لئے ایسی غیبت تجویز کرنے والا وہی ہوسکتا ہے جس کو غیبت کے بارے میں کوئی علم ہی نہ ہو۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ غیبتِ مطلقہ کے ساتھ ساتھ شہود کا موجود ہونا محالات عقلیہ سے ہے۔ اس بات کو غیبتِ ناقصہ سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے جانا کہ آنکھ کیلئے ناک کا علم غیب ہے۔ اب آپ ایمانداری سے بتایئے کہ کیا آنکھ کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ غیب کی حدود پھلانگ کر سونگھنے کا عمل شروع کر دے، چاہے وہ صرف ایک لمحے کیلئے ہی کیوں نہ ہو؟۔ جب غیبتِ ناقصہ تک پہنچ جانا محال ہے تو پھر غیبتِ مطلقہ تک کون پہنچ سکتا ہے؟ اور کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ ایک لمحے کیلئے بھی امامؑ کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، یا یہ کہے کہ وہ بعض لوگوں کو نظر آتے ہیں اور بعض کو نہیں؟۔ اسی بات پر ائمہ طاہرینؑ نے زور دیا ہے کہ جب تک ہمارے امامؑ غیبت میں ہیں تو ان کی غیبت، غیبتِ مطلقہ ہے۔ اور جب وہؑ ظہور فرمائیں گے تو انؑ کا ظہور شہودِ مطلق ہوگا۔ یہ "کسی کو نظر آتے ہیں اور کسی کو نظر نہیں آتے" والی بات سراسر باطل ہے:۔

۱۔ امام رضاؑ فرماتے ہیں۔ "نہ ہمارے قائمؑ کو دیکھا جائے گا اور نہ ان کا نام لیا جائے گا"۔ (کمال الدین وتمام النعمہ۔ ج ۲ صفحہ ۶۱۳، ۶۱۴)

۲۔ امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے۔ "امامِ قائمؑ جب غیبت میں جائیں گے تو لوگوں کی نظروں سے چھپ جائیں گے اور اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آئیں گے، یہاں تک کہ (جب وہ ظہور فرمائیں گے تو) سب لوگ انہیں دیکھیں گے"۔

(القطرۃ من بحارج ۲صفحہ ۳۱۰)

۳۔القطرۃ من بحارج ۲صفحہ ۲۶۸)۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''حضرتِ حجتؑ کی غیبت طولانی ہوجانے کی وجہ سے مومنین بہت زیادہ شک اور تردید میں پڑجائیں گے۔اکثر ان میں سے دین سے مرتد ہوجائیں گے اور اسلام سے خارج ہوجائیں گے اور اسلام کی اتباع اور اطاعت کا بندھن اپنی گردنوں سے اتار دیں گے۔ یہ وہی ولایت کا رشتہ ہے جس کے بارے میں اللہ فرماتا ہے۔''ہر انسان کے مقدرات کو ہم نے اس کی گردن میں ڈال دیا ہے''۔(بنی اسرائیل ۱۳)۔ کچھ لوگ دین سے خارج ہوجائیں گے اور تیرہ یا اس سے زیادہ اماموں کے قائل ہوجائیں گے۔ایک گروہ اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کہے گا کہ حضرتِ قائمؑ کی روح کسی کے جسم میں بات کرتی ہے''۔

یہ ایک انتہائی اہم حدیث ہے اور ممکن ہے کہ ہم کسی اور مقام پر بھی اسے نقل کریں کیونکہ اس میں معصومؑ نے بہت سے اشتباہات دور فرمادیئے ہیں۔ یہ خیال رہے کہ یہاں امامؑ نے عام لوگوں کی بات نہیں کی ہے بلکہ مومنین کا ذکر کیا ہے لہٰذا جو شخص بھی مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اسے اس فرمانِ معصومؑ کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا چاہیئے۔ اس میں آپؑ نے ولایت سے روگردانی کا بھی ذکر کیا ہے، تیرہ امامی لوگوں کا بھی تعارف کرایا ہے اور ان لوگوں کا بھی جو امامِ زمانہؑ کا مظہر ہونے کا

دعویٰ کرتے ہیں۔

ایک اور الجھن لوگوں نے پھیلا رکھی ہے کہ ظہورِ امامؑ کے بعد انؑ کی اولاد میں امامت جاری رہے گی۔ حالانکہ ایسا کہنا مذہبِ اثنا عشری کی نفی کرنا ہے۔ بارہ کی تعداد میں ایک کی کمی کرنا یا ایک کی زیادتی کرنا انسان کو مذہبِ شیعہ سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ ساری غلط فہمی امام محمد باقرؑ کی ایک حدیثِ مبارکہ کی بنیاد پر پھیلائی گئی ہے، ہم اس کا بھی قلع قمع کئے دیتے ہیں۔ کمال الدین وتمام النعمہ ج ۲ صفحہ ۳۶۲۔ ابو بصیرؓ نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ "اے فرزندِ رسولؐ! میں نے آپ کے والدؑ سے یہ حدیث سنی ہے کہ قائمؑ کے بعد بارہ مہدی ہوں گے"۔ آپؑ نے فرمایا۔ "انہوں نے کہا تھا کہ بارہ مہدی ہوں گے، یہ نہیں کہا تھا کہ امام ہوں گے۔ بلکہ یہ ہمارے شیعوں میں وہ قوم ہوگی جو لوگوں کو ہماری ولایت اور ہمارے حق کی معرفت کی طرف بلائے گی"۔

یہ اور اس جیسی اور بہت سی باتیں ہیں جو لوگوں میں پھیلائی جاتی ہیں اور بہت سے لوگ ان باتوں کو تسلیم بھی کر لیتے ہیں اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقتِ غیبت سے واقف نہیں ہیں۔ لوگوں کو جان لینا چاہیئے کہ یہ ایسی غیبت ہے کہ جس شے کا اس سے تعلق ہو جائے وہ خود غیب بن جاتی ہے۔ جو اس غیبت کی دلیل ہیں مثلاً حضرتِ عیسیٰؑ، حضرتِ خضرؑ، حضرتِ الیاسؑ اور اصحابِ کہف، وہ بھی غیب بن گئے۔ انؑ کے تیں

خادم جو ہر وقت اُنؑ کے ساتھ رہتے ہیں، وہ بھی غیب بن گئے۔ اور ایک عجیب بات آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ امامؑ کا وجودِ پاک تو رہا ایک طرف، یہاں تو یہ حال ہے کہ اُن کا نام بھی غیب میں ہے۔ ظاہر بظاہر ان کو "م ح م دؑ" کہتے ہیں لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ ان کا اصل نام کیا ہے۔ یہاں ہم تین احادیث پیش کر رہے ہیں جو ہماری بات پر دلیل ہیں:۔

۱۔ کمال الدین وتمام النعمہ ج ۲ صفحہ ۶۱۴۔

عمر نے امیر المومنینؑ سے حضرتِ قائمؑ کے متعلق دریافت کیا اور کہا کہ "اے ابنِ ابی طالبؑ! مجھے یہ بتائیں کہ مہدیؑ کا نام کیا ہوگا؟"۔ آپؑ نے فرمایا۔ "میرے حبیب و خلیل (رسولؐ اللہ) نے مجھ سے عہد لیا ہے کہ میں اس کا نام کسی کو نہ بتاؤں یہاں تک کہ وہ ظہور کرے اور یہ وہ چیزیں ہیں جو اللہ نے اپنے رسولؐ کے علم میں دیں"۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ امیر المومنینؑ جنابِ رسولِ خدا کا حوالہ دے رہے ہیں کہ انہوںؐ نے حضرتِ قائمؑ کا نام بتانے سے منع کیا ہے جبکہ رسولؐ اللہ پہلے ہی بتا گئے کہ "قائمؑ کا نام میرا نام اور اس کی کنیّت میری کنیّت ہوگی"۔ یعنی انہوں نے بتا دیا تھا کہ امامؑ کا نام "م ح م د" ہوگا۔ پھر یہ کون سا نام ہے جس کو بتانے سے آپ منع فرما رہے ہیں؟۔ پتہ چلا کہ جس نام کو ہم جانتے ہیں وہ آپؑ کا ظاہری نام ہے جبکہ آپ کا اصل نام غیب میں ہے۔

۲۔ کمال الدین وتمام النعمہ ج ۲ صفحہ ۶۱۸۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا۔

''قائمؑ کے دو نام ہوں گے۔ایک خفی اور دوسرا اعلانیہ''

۳۔قرآنِ مجید میں اللہ نے فرمایا۔''(اے رسولؐ) ہم نے تجھے سبع من المثانی اور قرآنِ حکیم عطا فرمائے ہیں''۔ہمیں یہ تلاش کرنا ہے کہ یہ ''سبعِ مثانی'' کیا چیز ہے۔ سبع کے معنی ہیں سات اور مثانی کا مطلب دو مرتبہ۔لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سبعِ مثانی سے مراد چہاردہ معصومینؑ ہیں لیکن یہ ان لوگوں کا قیاس اور تفسیر بالرائے ہے۔ہم معصومؑ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ سبعِ مثانی کون ہیں؟۔

القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۷۷۔امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔

''اللہ نے کسی نبی کو وہ سبعِ مثانی عطا نہیں فرمائے جو ہمارے نبیؐ کو عطا فرمائے ہیں۔ اور وہ سات ائمہؑ ہیں جن کے گرد آسمان چکر کاٹتا ہے''۔

ہمیں معلوم ہو گیا کہ سبعِ مثانی سے مراد ائمہؑ طاہرین ہیں جو ناموں کے اعتبار سے سات ہیں۔اب اگر تمام ائمہؑ کے اسمائے مبارکہ کی تلخیص کی جائے تو وہ کُل چھ بنتے ہیں۔۱۔علیؑ ۲۔حسنؑ ۳۔حسینؑ ۴۔محمدؑ ۵۔جعفرؑ ۶۔موسیٰؑ۔اب آپ سے ہمارا سوال یہ ہے کہ ساتواں کون ہے؟۔اگر حضرتِ حجتؑ کا نام ''م ح م د'' مانا جائے تو وہ تو چھ ناموں میں آ چکا؟۔پس یہ ساتواں نام وہی ہے جسے اللہ نے پردۂ غیبت میں رکھا ہے اور جو اپنے مسمّٰی کے ساتھ ہی ظہور فرمائے گا۔

اب ہم اپنے موضوع یعنی معرفتِ غیبت کی طرف پلٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مومن کیلئے یہ اتنی اہم کیوں ہے۔لیکن آپ کی یاددہانی کیلئے پہلے یہ عرض کر دیں کہ غیبتِ

امامؑ کے چار اسباب ہیں۔ مومن کا امتحان، ظالموں کو مہلت، اُن مومنین کا انتظار جو ابھی صُلبِ پدر سے باہر نہیں آئے اور آخری اور حتمی سبب مشیتِ خدا۔ صورتحال کچھ یوں ہے کہ مدتِ ظہور ائمہ کُل ۳۱۸ سال ہے، یعنی ۱۱ھ سے لیکر ۳۲۹ھ تک۔ اور مدتِ غیبت کسی کو معلوم نہیں۔ اس طرح مدتِ ظہور میں جتنے مومن گزرے، ان سے کہیں زیادہ تعداد اُن مومنین کی ہے جو دَورِ غیبت میں رہے ہیں، رہ رہے ہیں اور رہیں گے۔ گویا مومنین کا تعلق ظہور سے بہت کم رہا ہے اور غیبت سے بہت زیادہ۔ یہ ظاہر ہے کہ سلسلۂ امامت کا قیام اپنے اندر ایک انتہائی اہم مقصد رکھتا ہے جس میں فیوضِ باری تعالیٰ کو مخلوق تک پہنچانا، ان کی ہدایت و حفاظت کرنا، ان کے شکوک و شبہات دور کرنا، ان کو دولتِ یقین و ایمان عطا کرنا اور ان جیسے دیگر بہت سے معاملات شامل ہیں اور یہ بات عدلِ خداوندی کے خلاف ہے کہ وہ اپنے بندوں کی ایک قلیل تعداد کو تو یہ مواقع میسر کرے اور ایک کثیر تعداد کو ان سے محروم رکھے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کو اگر عدلِ خدا پر یقین ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ لطفِ خداوندی کا ایک لمحے کیلئے بھی منقطع ہو جانا عدلِ خدا کے خلاف ہے۔ امامؑ چونکہ لطفِ خدا ہے اسلئے فیوضِ امامؑ کا ہم تک نہ پہنچ پانا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ اس طرح بہ اعتبارِ افادیت، ظہورِ امامؑ اور غیبتِ امامؑ میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔ جن ادوار میں ائمہؑ طاہرین ظاہر تھے تب بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جن کی پہنچ ان تک نہیں ہو پاتی تھی۔ مثلاً افریقہ، وسطی ایشیا اور برِصغیر کے لوگ ان تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ پھر آخر

ان کی ہدایت کون کرتا تھا؟، وہ معرفتِ امامؑ کس طرح حاصل کرتے تھے؟، ان کے مسائل کون حل کرتا تھا؟۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیبت فیوضِ امامؑ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ اور یہ نہ سمجھئے کہ یہ کوئی خیالی بات ہے۔ بلکہ اس کی عملی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔حضرتِ اویس قرنی نے زندگی بھر رسولؐ اللہ کی زیارت نہیں کی، پھر انہوں نے معرفت کیسے حاصل کی؟۔ وہ میدانِ غدیر میں موجود نہیں تھے۔ پھر ولایتِ علیؑ ان تک کیسے پہنچ گئی؟۔ وہ ایک تارک الدنیا شخص تھے اور جنگل میں ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔ دنیا اور دنیا والوں سے ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ پھر انہیں کس نے بتا دیا کہ مولا علیؑ میدانِ صفین میں معاویہ سے برسرِ پیکار ہیں اور وہ کیسے وہاں ان کی نصرت کیلئے پہنچ گئے؟۔حضرتِ ختمی مرتبتؐ اور امیرؑ المومنین کے درمیان جو ۲۴ سال کا عرصہ گزرا اس میں بھی بے شمار جنگیں ہوئی تھیں لیکن حضرت اویسِ قرنی کسی ایک جنگ میں بھی نہیں گئے۔ پھر آخر صفین میں انہیں کس نے بھیجا؟۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امامؑ کے فیوض حاصل کرنے کیلئے مشاہدہ شرط نہیں بلکہ کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ایک برادرِ مومن نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا امامؑ سے رابطہ ممکن ہے؟۔ تو میں نے انہیں جواب دیا تھا کہ امامؑ سے رابطہ نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ واجب و اَوجب ہے۔ البتہ جب تک وہ پردۂ غیب میں ہیں اس وقت تک ان کا مشاہدہ ناممکن ہے۔ معلوم نہیں میرے اُس بھائی نے میرا مطلب سمجھا یا نہیں کیونکہ بات

ٹیلیفون پر ہو رہی تھی۔ لیکن یہاں میں عرض کرتا ہوں کہ بغیر امامؑ سے رابطہ رکھے انؑ کا کوئی فیض ہدایت و معرفت ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور رابطے سے مراد جسمانی رابطہ نہیں ہے بلکہ قلبی رابطہ ہے۔ خود زمانۂ امامؑ میں جن لوگوں نے انؑ سے فیضِ ہدایت و معرفت حاصل کیا اس کا ذریعہ رابطۂ قلبی ہی تھا، ورنہ مشاہدہ تو ان کا سبھی کرتے تھے لیکن اس کے باوجود منافق کے منافق ہی رہے۔

ارتباطِ امامؑ

سورۂ آلِ عمران ۲۰۰۔ **"یا ایھا الذین اٰمنوا اصبروا و صابروا ورابطوا واتّقوا اللہ لعلکم تفلحون"** (اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر دلاؤ اور رابطہ رکھو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم فلاح پاؤ)۔

اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "اصبروا۔ یعنی ہماری محبت کی وجہ سے جو ناگوار باتیں تمہیں سننا پڑیں ان پر صبر کرو۔ وصابروا۔ یعنی اپنے امامؑ کے ساتھ شامل ہو کر دشمنوں کے مقابلے میں پامردی کا مظاہرہ کرو۔

ورابطوا! یعنی اپنے امامؑ سے ارتباط قائم رکھو"۔

جب تک قرآن میں یہ آیت موجود ہے اُس وقت تک ہم پر واجب ہے کہ ہم اپنے امامؑ سے رابطہ رکھیں۔ یعنی دل کو ہمہ وقت اُن کی طرف متوجہ رکھیں، انؑ سے باتیں

کریں، انؑ سے سوال پوچھیں اور اُنؑ سے جواب لیں اور یہ باتیں کسطرح ہوتی ہیں، یہ بھی ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۱۹۰۔

ایک شخص نے امام علی نقیؑ کو لکھا کہ ایک شخص چاہتا ہے کہ اپنے امامؑ کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کرے اور اپنی مشکلات کو ان کے سامنے پیش کرے جیسے کہ وہ اپنے اللہ کے ساتھ راز و نیاز کرتا ہے اور اپنی حاجتوں کا اظہار کرتا ہے۔ امامؑ نے اسے اِس طرح جواب لکھا۔ ''جب بھی تمھاری کوئی حاجت ہو تو تم فقط اپنے لبوں کو حرکت دو اور مطمئن ہو جاؤ کہ جواب تم تک پہنچ جائے گا''۔

اِن باتوں کا انکار صرف ناصبی ہی کیا کرتے ہیں کیونکہ وہی ہیں جن کے نزدیک امامؑ معاذ اللہ معطل بیٹھے ہیں۔ ان بدبختوں سے کوئی پوچھے کہ جب تم استخارہ دیکھتے ہو تو اس صورت میں تمھیں جواب کیونکر مل جاتا ہے؟۔ اور استخارۂ سجادیہ میں تو ''ہاں اور نا'' کے بجائے پورے پورے جملوں میں جواب آتا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟۔ مولوی کے یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ رہی ہے۔ جو چیز محال ہے اُس کا وہ دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ امامؑ اُس سے ملاقات کرتے ہیں اور جو چیز واجب ہے اس کا وہ انکار کرتا ہے۔ چنانچہ ایران میں اگر کوئی ارتباطِ امامؑ کی بات کرے تو اس کو زہر کا انجکشن دے کر مار دیتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ارتباطِ امامؑ کوئی وقتی چیز نہیں ہے بلکہ قائم و دائم چیز

ہے۔ چوبیس گھنٹے آپ کے دل پر دوقسم کے اثرات وارد ہوتے رہتے ہیں۔ایک آپ کے امامؑ کی طرف سے اور دوسرا شیطانِ رجیم کیطرف سے۔امامؑ کی طرف سے جو شے دل تک پہنچتی ہے اسے الہام کہتے ہیں اور شیطان کی طرف سے جو شے آتی ہیں وہ وسوسہ کہلاتی ہے۔اگر آپ امامؑ کی طرف متوجہ ہیں تو وسوسے خود بخود ختم ہوتے رہتے ہیں اور آپ کو احساس بھی نہیں ہوتا۔ وسوسہ صرف اسی صورت میں طاری ہوتا ہے جب آپ امامؑ سے غافل ہوتے ہیں۔مقصّر اور منافق چونکہ غفلت میں رہتے ہیں اس لئے وسوسے ان کے دل میں جڑ پکڑتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ شک میں تبدیل ہوجاتے ہیں، جو کفر کی ابتداء کا نام ہے۔اسی لئے ہم نے عرض کیا تھا کہ امامؑ کیطرف ہمہ وقت متوجہ رہنا انتہائی ضروری ہے۔ امام زین العابدینؑ نے زمانۂ حاضر کے مومنین کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''ان کیلئے غیبت بمنزلۂ شہود ہوگی''۔تو اِس شہود سے مراد یہی توجہ ہے اور اس لئے امیرؑ المومنین نے فرمایا تھا کہ ''میں نے اللہ کو سر کی آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے''۔یہ وہ مقام ہے جہاں غیب شہود بن جاتا ہے، امامؑ ہمیں دیکھتے ہیں اور ہم امامؑ کو دیکھتے ہیں، امامؑ ہم سے باتیں کرتے ہیں اور ہم امامؑ سے باتیں کرتے ہیں۔اسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''لوگوں پر وہ کیونکر حجت ہوسکتے ہیں جو ان کی نظروں سے غائب ہوں، نہ تو خود امامؑ ان کو دیکھ سکتے ہوں اور نہ لوگ امامؑ کو دیکھ سکتے ہوں۔اور کیسے ان پر حجت ہوسکتے ہیں اور اللہ کے حکم کو ان کے درمیان جاری کرسکتے ہیں جبکہ

ان کے اور امامؑ کے درمیان فاصلہ اور رکاوٹ ہو؟۔ امامؑ لوگوں کے رہبر ہیں۔ جہاں بھی ان کے درمیان کوئی جھگڑا یا اختلاف پیدا ہو، وہ فیصلہ کرنے والے ہیں اور وہی لوگوں کے حقوق کے محافظ ہیں"۔

ہم نے غیبت کو آپ کیلئے تفصیل سے بیان کیا ہے تا کہ آپ معرفتِ امامؑ زمانہ کو سمجھیں اور مکرِ ابلیس سے خود کو محفوظ رکھیں۔ یہ دل سے دل کا معاملہ ہوتا ہے اور اسے محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں، دو اور دو چار کرنے والے گمراہوں کی سمجھ میں یہ باتیں کبھی نہیں آئیں گی۔

وقارِ محبت..........ولایت

بیانِ معرفت بڑھتے بڑھتے اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں سے دولتِ معرفت لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ وہ نقطہ ہے جہاں انسان براہِ راست توحید کا مشاہدہ کرتا ہے۔ میں اکثر اپنے احباب سے کہتا ہوں کہ علیؑ کو مناقب کی کتابوں میں تلاش مت کرو، وہاں تمھیں علیؑ نہیں ملے گا۔علیؑ کو ڈھونڈ نا ہے تو اُن مقامات کی سیر کرو جہاں توحید بیان کی گئی ہے کیونکہ یہ وہ نقطہ ہے جو مظہرِ ذات ہے۔انسان جب اس بارگاہ میں داخل ہوتا ہے تو ہر طرف سے **"سبحانک لاعلم لنا الّا ما علّمتنا"** کی گونج سنائی دیتی ہے۔

تیرے عُلوِ ذات کی ملتی نہیں ہے حد
اِتنی تری صفات کہ حیران ہیں عدد
اِس اعترافِ عجز و جہالت کے باوجود
میں مدح کر رہا ہوں تری، یا علیؑ مدد!

سو ہم بھی اپنی کوتاہ نظری کے باوجود اس وادی میں قدم رکھ رہے ہیں، اس بات کا یقین کر کے کہ ہم اوصافِ علیؑ نہیں بلکہ خود اپنی اوقات بیان کر رہے ہیں۔

نادِعلیؑ

ہم اپنے بیان کی ابتداءمعرفت سے نہیں بلکہ اپنی عقیدت سے کرنا چاہتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ کچھ عرض کرنے سے پہلے ہم دامن پھیلا کر اپنے محبوب سے مدد کی بھیک مانگیں اور پھر جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ وہ عطا فرما دے وہی ہم آپ کی خدمت میں پیش کر دیں۔اسی لئے ہم نے نادِعلیؑ سے آغاز کیا ہے تا کہ استمداد کا صحیح طریقہ آپ تک پہنچا سکیں کیونکہ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ دینی رہزنوں نے ہمارے عقائد کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہ چھوڑا جہاں انہوں نے لُوٹ مار نہ مچائی ہو۔امورِ دین میں اس قدر تحریفات کردی گئی ہیں کہ اب حقیقتِ دین کو تلاش کرنا ایسا ہو گیا ہے جیسے ایک وسیع ریگستان میں سُوئی تلاش کرنا۔ یہاں تک کہ اُس ایک جملے کو بھی صحیح سلامت نہ چھوڑا جس کے ذریعے ہم اپنے مولاؑ سے طلب استعانت کیا کرتے ہیں۔ یہ آپ سب جانتے ہیں کہ نادِعلیؑ اللہ کا ایک حکم ہے جو اس نے اپنے نبیؐ کو دیا ہے اور وہ حکم یہ ہے کہ اے رسولؐ! ساری دنیا کو چھوڑ کر صرف علیؑ سے مدد مانگ۔ یہاں حکم دینے والا اللہ ہے، حکم لینے والا رسولؐ ہے اور مدد کرنے والا علیؑ ہے۔اتنا سادہ سا جملہ ہے لیکن اس میں **"بعظمتک یا اللہ"** اور **"بنبوتک یا محمدؐ"** شامل کر کے اسے ایک بے معنی اور مہمل جملے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔مقصد صرف یہ تھا کہ علیؑ کی انفرادیت نظروں میں نہ آئے۔دوسرا کمال یہ کیا گیا کہ حکمِ خدا تو،غلط یا صحیح،ہم تک

پہنچا دیا گیا لیکن یہ بات چھپالی گئی کہ رسولؐ اللہ نے اللہ کے اِس حکم پر عمل کسطرح کیا؟۔ ہمارا مقصدِ حیات ہی اِن مکّاروں کی حیلہ سازیوں کو بے نقاب کرنا ہے تا کہ جتنا دین بھی آپ تک پہنچے وہ خالص ہو لہٰذا ہم دونوں چیزیں آپ کی خدمت میں پیش کرر ہے ہیں۔ پہلے ملاحظہ فرمائیے وہ اصل نادِ علیؑ جو ایک بامعنی جملہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب خیبر کی جنگ فتح ہوتی نظر نہ آئی اور لشکرِ اسلام میں مایوسی پھیلنے لگی تو حضرتِ جبرئیلؑ نازل ہوئے اور رسولؐ اللہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ''اللہ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ یا تو میں فرشتوں کی فوج بھیج دوں اور تمھارے لئے جنگ فتح کردوں۔ یا پھر آپ علیؑ کو اپنی مدد کیلئے بلالیں''۔ حضرتِ ختمی مرتبتؐ چونکہ ''سلطاناً نصیرا'' کو پہچانتے تھے اس لئے انہوں نے بلاتوقف فرمایا۔ ''میں علیؑ کو اختیار کرتا ہوں''۔ جبرئیلؑ نے کہا کہ اچھا اگر آپ علیؑ کو اختیار کرتے ہیں تو پھر:۔

''نَادِ عَلِيّاً مَظْهَرَ الْعَجَائِبِ، تَجِدْهُ عَوناً لَکَ فِي النَّوائِبِ، كُلُّ هَمٍّ وَّ غَمٍّ سَيَنجَلِي بِعَلِيٍّ بِعَلِيٍّ بِعَلِيٍّ بِعَلِيٍّ''

ترجمہ اس کا یہ ہے کہ اے رسولؐ! علیؑ کو پکارو۔ (نداء کا مطلب ہوتا ہے چلّا کر آواز دینا)۔ جن سے عجائبات ظاہر ہوتے ہیں۔ تم ان کو ہر مصیبت میں اپنا مددگار پاؤگے۔ تمام دکھ اور پریشانیاں دُور ہوجائیں گی علیؑ کی مدد سے، علیؑ کی مدد سے، علی کی مدد سے،

علیؑ کی مدد سے۔

آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس جملے میں **"بعظمتک یا اللہ"** اور **"بنّبوتک یا محمدؐ"** کی گنجائش کہاں ہے؟۔اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ جب رسولؐ اللہ نے اللہ کا یہ حکم سنا تو اس پر عمل کیسے کیا۔آپؐ نے اپنا رخ مدینے کیطرف کیا اور بہ آوازِ بلند کہا۔ **"یا اَبَا الغیث اَغیثنی، یا علیُّ اَدرِکنی، اَدرِکنی یا علیؑ"**۔(القطرۃ من بحار ج ا صفحہ ۲۷۹)

ترجمہ:۔ "اے فریاد کرنے والوں کی فریاد کو پہنچنے والے !میری فریاد کو پہنچ۔یا علیؑ! میری مدد کر،میری مدد کر یا علیؑ"۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد آپ کو اپنے مولاؑ سے مدد مانگنے میں اور بھی زیادہ لطف آیا کرے گا۔اور اب ہم اپنے موضوع یعنی ولایت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

ولایتِ مطلقہ

اس موضوع پر ہم نے کشف العقائد اور کشف المعارف میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔یہاں اس کے چند خصائص پر تدبر کرنا مقصود ہے۔ہوتا یہ ہے کہ لفظِ ولایت سن کر لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کوئی معیّن شے ہے اور اس کے مختلف درجات میں تمیز نہیں کرتے۔مولا امیرؑ المومنین کی معرفت کے باب میں جو ٹھوکریں کھائی جاتی ہیں وہ اسی کوتاہیِ فکر کا

نتیجہ ہے۔اسی لئے وہ ایک انجانے خوف میں مبتلا رہتے ہیں اوراسی خوف کا نتیجہ ہے کہ ہمارے محدّثین، مفسّرین، مورّخین اور علماء نے مولاعلیؑ کی جوتصویر کشی کی ہے اسے اگر آپ غور سے دیکھیں تو ایسا محسوس ہوگا جیسے آپ کی حیثیت اسلام کے ایک ادنٰی کارکن سے زیادہ نہیں تھی۔سورۂ نجم کی ایک آیت ہے۔ **"عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ"** ۔یعنی اُس (رسولؐ) کوشدید قوت والے نے تعلیم دی۔آپ مختلف قرآن اٹھایئے اورترجمے اورتفسیریں ملاحظہ فرمایئے جن میں شدید القویٰ سے مراد جبرئیل کو لیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کلیجہ حیرت سے پھٹ جائے۔ جبرئیل جو اِس گھر کا نوکر ہے، اس کے بچوں کا جھولا جھلانے والا ہے، اس کی چکیاں چلانے والا ہے، اس کومعلّمِ رسولؐ ماننے میں انہیں کوئی عار نہیں ہے اور وہاں انہیں کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا لیکن جہاں میرے مولاؑ کی بات آتی ہے تو انہیں اس مقام پر رکھا جاتا ہے کہ "یاعلیؑ یہ کردو، یاعلیؑ وہ کردو، یاعلیؑ میرے بستر پر سو جاؤ، یاعلیؑ سورۂ براءت کی آیات مشرکین کو جا کر سنادو"۔ یا پھر بہت ہی مہربان ہوئے تو یہ کہا کہ "جنت چار آدمیوں کی مشتاق ہے۔علیؑ، سلمان، ابوذر اور مقداد"۔ان باتوں سے شیعوں میں ایک ذہنیت ایسی پیدا ہوگئی جن کے نزدیک ولایت و امامت کی رتّی برابر بھی وقعت نہیں ہے اور اپنی اِس خباثتِ فکری پر پردہ ڈالنے کیلئے وہ خندق وخیبر بیان کرکر کے خوش ہوتے ہیں۔کبھی کہتے ہیں کہ آپؑ ایک رات میں ایک ہزار رکعات نماز پڑھا کرتے تھے اور کبھی کہتے ہیں کہ آپؑ فیصلے بہت اچھے کیا کرتے تھے۔ایسی ہی باتوں سے اقتدار کے بھوکے

لوگوں کو یہ حوصلہ ہوا کہ وہ خود کو ائمہؑ طاہرین کی برابری پر لانے لگے اور ان کے پیروکاروں کو بھی ان کے دعووں کو تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔اسی لئے ہم بار بار ولایت کی تفہیم پر زور دیتے ہیں۔یاد رکھیئے کہ اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید ہے اور توحید کی بنیاد ولایت ہے۔اگر ولایت پر دھیان نہ دیا گیا تو توحید فقط ہونٹوں کی زینت بن کر رہ جائے گی اور ایسی توحید نہ کسی کے کام آئی ہے اور نہ آئے گی۔

مطلق کے معنی آپ جان چکے ہیں اسلئے ولایتِ مطلقہ کو سمجھنے میں آپ کو دشواری پیش نہیں آنا چاہیئے۔جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ولایت کے تین اجزاء ہیں۔علم،قدرت اور تصرف۔ جب ولایت اطلاق کی منزل پر آتی ہے تو لازم ہے کہ یہ تینوں اجزاء بھی اطلاق کی منزل پر ہوں۔افسوس کی بات یہ ہے کہ جو کچھ میرے علم میں ہے وہ میں اس مقام پر لکھ نہیں سکتا کیونکہ پڑھنے والوں کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں اور میں ان حدود کو پھلانگنا نہیں چاہتا لیکن عقلی اعتبار سے یہ بات ماننی پڑے گی کہ علم جب منزلِ اطلاق پر آتا ہے تو اس کے بارے میں یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی کا دیا ہوا ہے۔ کیونکہ جو علم دیا ہوا ہوتا ہے وہ اطلاع بن جاتا ہے،علم نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ نے یہ علم اُن کو دیا تھا تو یہ بھی مناسب نہیں کیونکہ اللہ کا کام لینا دینا نہیں ہے۔وہ اپنے علم کو اپنے ولیِ مطلق کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔اب اس علم کو آگے بڑھانا یا کسی کو دینا اُس ولیِ مطلق کا کام ہے۔وہ کس پر کتنا علم ظاہر کرتا ہے اور کس سے کتنا چھپاتا ہے،یہ اس کا کام ہے اور اُسی کا کرنا اللہ کا کرنا کہلاتا ہے۔یہی

حال قدرت اور تصرف کا ہے کہ وہ کسی کی عطا نہیں ہوتی بلکہ حسبِ مشیت ظاہر ہوا کرتی ہے۔ جو ولیِ مطلق ہوتا ہے وہ ہر شے کا خالق، ہر شے کا عالم اور ہر شے پر قادر و متصرف علی الاطلاق ہوتا ہے۔ ہر وہ شے جو خلق ہو چکی اور ہر وہ شے جو ابھی خلق نہیں ہوئی، سب کی سب اُس ولیِ مطلق کے احاطۂ علم و قدرت و تصرت میں قید ہوتی ہیں۔ تمام اشیاء مظروف ہوتی ہیں اور ولی ان کا ظرف۔ جیسا کہ خود اللہ فرماتا ہے کہ "ہم نے ہر شے کو گن گن کر امامِ مبین میں رکھ دیا ہے"۔ اور جیسا کہ خطبۂ نورانیہ میں امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ "میں ہر شے کا علم رکھتا ہوں اور یہ علم اخباری نہیں بلکہ احاطی ہے"۔ پس معرفتِ ولایت کی طرف قدم بڑھانا صرف اس صورت میں ممکن ہے جبکہ اسے ہر شے سے ماوراء جان کر سوچا جائے ورنہ اگر فکرِ انسانی غلط سمت میں چل پڑے تو پھر وہ نبوت و امامت میں جا کر پھنس جاتی ہے اور پھر یہ ہوتا ہے کہ خود نبوت و امامت بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ اندھیروں میں ہی بھٹکتا رہتا ہے اور قدم قدم پر اپنے قیاس یا پھر سنی سنائی باتوں پر اپنے عقیدے کا محل کھڑا کرتا رہتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیئے کہ نبوت و امامت خدائی عہدے ہوتے ہیں جو اللہ اپنے ولیِ مطلق کے ذریعے عطا فرماتا ہے اور اسی لئے میرے مولاؑ کا ارشاد ہے کہ "میں نے ہی انبیاءؑ کو مبعوث کیا ہے"۔

بنیادِ اسلام

یہ ایک حقیقت ہے کہ معرفتِ خدا کے بغیر دین کے دروازے میں داخل نہیں ہوا جاسکتا۔اور جب ہم معرفتِ خدا کی بات کرتے ہیں تو یہ بات ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ معرفت ہمیشہ صفات کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے اور اللہ کی تمام صفات تحتِ ولایت ہیں۔پس ولایت کی معرفت حاصل کئے بغیر اللہ کی معرفت حاصل نہیں کی جاسکتی۔اللہ کی معرفت حاصل نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ توحید کی معرفت نہ ہوئی۔ توحید کی معرفت نہ ہوئی تو نبوت کی معرفت نہیں ہوسکتی کیونکہ نبوتِ فرع توحید ہے۔ نبوت کی معرفت نہ ملی تو امامت کی معرفت نہیں مل سکتی کیونکہ امامت کا تعارف نبوت کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے اور اگر امامت کی معرفت نہ ہوئی تو سمجھو کہ انسان غرق ہوگیا۔اسی کی آئینہ دار وہ دعا ہے جو ہر مومن مانگتا ہے کہ "پروردگار مجھے اپنی معرفت عطا فرما۔کیونکہ اگر میں نے تیری معرفت حاصل نہ کی تو میں تیرے نبیؐ کی معرفت حاصل نہ کرسکوں گا۔اور پروردگار مجھے اپنے نبیؐ کی معرفت عطا فرما۔کیونکہ اگر میں نے تیرے نبیؐ کی معرفت حاصل نہ کی تو تیری حجتؑ کی معرفت حاصل نہ کرسکوں گا۔اور پروردگار مجھے اپنی حجتؑ کی معرفت عطا فرما۔کیونکہ اگر میں نے تیری حجتؑ کی معرفت حاصل نہ کی تو میں دین سے خارج ہوجاؤں گا"۔اس طرح آپ دیکھیں تو دین کا مکمل دارومدار معرفتِ ولایت پر ہے۔یہی وجہ ہے کہ جو دشمنانِ دین ہوتے ہیں وہ سب

سے پہلے ولایت پر حملہ کرتے ہیں، ولایت کو محدود کرتے ہیں، ولایت کے حصے بخرے کرتے ہیں، ولایت میں شرک کرتے ہیں اور اپنی ولایت کا جھنڈا گاڑتے ہیں۔ ولایت کی اس کلیدی حیثیت کے پیشِ نظر ہی میرے مولاؑ نے فرمایا ہے کہ "میری ولایت کے بغیر نہ توحید تمھارے کسی کام آئے گی اور نہ نبوت"۔ اللہ نے بھی صرف ایک ہی بات کی نصیحت کی ہے، اور وہ ہے ولایت، سورۂ صبا میں ارشاد ہوتا ہے۔ "(اے رسولؐ) کہہ دو کہ میں تم لوگوں کو ایک ہی نصیحت کرتا ہوں"۔ اس کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ "میں تمھیں علیؑ کی ولایت رکھنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ یہی ایک چیز ہے جس کے متعلق اللہ نے کہا ہے کہ میں تمھیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں"۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ ولایتِ علیؑ ہی دین کی کنجی ہے۔ ذیل میں ہم وہ احادیث پیش کررہے ہیں جن سے اہمیتِ ولایت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تفسیرِ نورالثقلین ج ۳ صفحہ ۸۵۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

"جس طرح اہلِ کتاب اگر کتبِ سماویہ کو قائم نہ کریں تو ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسی طرح اہلِ اسلام اگر ولایتِ علیؑ کا عقیدہ نہ رکھیں تو ان کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے"۔

اس حدیث میں تو بغیر عقیدۂ ولایتِ علیؑ، انسان کا اسلام ہی خطرے میں نظر آرہا ہے، کجا یہ کہ وہ مومن ہونے کا دعویٰ کرے۔

۲۔ القطرۃ من بحار ج ۱ صفحہ ۱۶۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''اللہ نے ہماری ولایت کو قرآن اور تمام آسمانی کتابوں کا مدار قرار دیا ہے، قرآن کی محکم آیات اِس مدار کے اِردگرد چکر کاٹتی ہیں۔ ہماری ولایت کی وجہ سے ہی آسمانی کتابوں کی آواز میں بلندی پیدا ہوئی اور ایمان ظاہر ہوا''۔

یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا تعلق صرف اور صرف ولایت سے ہے اور یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ثواب ونجات کا تعلق اسلام سے نہیں بلکہ ایمان سے ہوتا ہے۔ لہٰذا بغیر ولایتِ علیؑ انسان دنیا میں تو مسلمان کہلایا جاتا ہے لیکن آخرت میں جب وہ اٹھایا جائے گا تو وہ نرا کافر ہوگا اور عذابِ خدا اس پر لازم ہوگا۔ سورۂ جن کی آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''جو اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کرے گا تو وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہے گا''۔ جہنم میں ہمیشہ رہنا کافر ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ اللہ و رسولؐ کی نافرمانی سے یہاں کیا مراد ہے۔ کیونکہ نافرمانیوں (گناہوں) کو معاف کرنے کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہوا ہے لیکن یہ کوئی ایسی نافرمانی ہے جس کی معافی نہیں ہے۔ تفسیرِ فرات صفحہ ۳۵۹ پر امام محمد باقرؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ ''اس کا مطلب ہے کہ جو اللہ و رسولؐ کی نافرمانی کرے گا علیؑ کی ولایت کے بارے میں''۔ اور جو ولایتِ علیؑ کے بارے میں اللہ کی فرماں برداری کرے گا وہ نہ صرف یہ کہ نجات کا حقدار ہوگا بلکہ اللہ کے نزدیک صاحبِ عزت ہوگا جیسا کہ ارشاد ہوا **''هُمْ فِي جَنّٰتٍ مُكْرَمُونَ''**۔ وہ جنتوں میں صاحبانِ عزت ہوں گے اور جیسا کہ سورۂ یونس ۲ میں ارشاد ہوا۔ ''اور اہلِ ایمان کو بشارت دے دو کہ ان کے لئے ان کے

پروردگار کے پاس سچی عزت اور سرفرازی ہے"۔امام جعفرصادقؑ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ "سچی عزت سے مرادولایتِ امیرؑالمومنین ہے"۔(تفسیرِ نور الثقلین ج ۴صفحہ ۲۰۰)

۳۔القطرۃ من بحارج ۳صفحہ ۶۳۔امام جعفرصادقؑ نے فرمایا۔

"اے مفضل! اللہ نے آدمؑ کو خلق نہیں کیا اور اُس میں اپنی روح نہیں پھونکی مگر ولایتِ علیؑ کے ذریعے۔ اور اللہ نے موسیٰؑ سے کلام نہیں کیا مگر ولایتِ علیؑ کے ذریعے سے اور عیسیٰؑ کو عالمین کے لئے نشانی قرار نہیں دیا مگر اُس خضوع کی وجہ سے جو انہوں نے حضرتِ امیرؑالمومنین کی بارگاہ میں کیا۔ خلاصہ یہ کہ مخلوقات میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو ہماری عبودیت کے بغیر اللہ کی نظرِ لطف وکرم کا سبب بنی ہو"۔

یہ بہت اہم حدیث ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق کرنا، روح پھونکنا، کلام کرنا، کسی کو نشانی قرار دینا، غرض ہر اُس کام کا تعلق جسے اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہو، ولایتِ علیؑ سے ہے۔اس حدیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خضوع وخشوع بھی علیؑ ہی کی بارگاہ میں کیا جاتا ہے اور عبودیت بھی علیؑ ہی کے ذریعے کی جاتی ہے۔ مگر یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کام وہی کرسکتا ہے جس کی طینت پاک ہو، جس کی ولادت پاک ہو اور جس کا دل پاک ہو۔ اِس بات کو حضرتِ ختمی مرتبتؐ نے یوں بیان

فرمایا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ جن وانس میں سے جس کا دل پاک کرنا چاہتا ہے اس تک علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کی ولایت پہنچادیتا ہے۔ اور جس کے دل پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اسے علیؑ کی ولایت کے قریب نہیں آنے دیتا''۔ (القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۳۴۲)۔

شرک

ہر چند کہ یہ باتیں آپ کی سنی ہوئی ہیں لیکن موضوع کی تکمیل کیلئے ہم چاہتے ہیں کہ ولایت کے بارے میں بنیادی باتیں آپ تک پہنچادیں تا کہ آپ کی یاد دہانی بھی ہوجائے اور کوئی گوشہ خالی بھی نہ رہے۔ تب ہی ہم اس قابل ہوں گے کہ اپنی استطاعت کے مطابق حقائقِ ولایت بیان کرسکیں۔

یہ تو آپ جانتے ہیں اور اللہ نے بھی قرآن میں بار بار اس کا اعادہ کیا ہے کہ وہ ہر گناہ بخش دے گا لیکن شرک کو ہرگز ہرگز نہیں بخشے گا لہٰذا شرک کی طرف سے ہوشیار رہنا انسان کیلئے انتہائی ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ وہ شرک کا ادراک رکھتا ہو اور اسے پہچانتا ہو۔ ہم پہلے ہی عرض کر چکے کہ اللہ کو جاننے کا واحد ذریعہ ولایتِ علیؑ ہے لہٰذا جو جو امور اللہ سے وابستہ ہیں ان کا جائزہ بھی ولایتِ علیؑ کے حوالے سے ہی لیا جاسکتا ہے اور ان امور میں سب سے اہم شے شرک ہے۔ شرک کی چار اقسام ہیں۔ شرک فی الذات، شرک فی الصفات، شرک فی الفعل اور شرک فی الامر۔

شرک فی الذات:۔اگر چہ عملی اعتبار سے ذات میں شرک کرنا ایک امرِ محال ہے لیکن فکری اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو پھر ہمیں یہ جاننا پڑے گا کہ مظہرِ ذات کون ہے اور پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ذات میں شرک کرنے کا مطلب اسی مظہرِ ذات میں شرک کرنا ہے۔ہم نے کشف المعارف میں عرض کیا تھا کہ جیسے دعویٰ بغیر دلیل کے باطل ہوتا ہے اسی طرح دلیل بھی بغیر دعوے کے بیکارِ محض ہوا کرتی ہے۔ہم اپنے دل سے فرض کرکے کسی صفت کو کسی سے منسوب نہیں کرسکتے۔جب تک اس کا دعویٰ موجود نہ ہو۔ اور اوّلین و آخرین صرف میرے مولاؑ کی ذات ہے جس نے نقطہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔اور پھر فرمایا کہ "تمام اشیاء نقطے پر منتہی ہوتی ہیں اور نقطہ ذات پر دلالت کرتا ہے"۔(نہج الاسرار صفحہ ۳۴)

پس یہی نقطہ مظہرِ ذات ہے اور شرک فی الذات کا مطلب اسی نقطے میں شرک کرنا ہے۔

شرک فی الصفات:۔نہج الاسرار صفحہ ۴۴ پر اسی نقطے کے بارے میں امیرؑالمومنین فرماتے ہیں۔"اللہ کی ذات بشر کیلئے غیر معلوم ہے۔پس اس کی معرفت اس کی صفات سے حاصل کی جاتی ہے۔نقطہ صفت ہے اللہ کی اور صفت دلالت کرتی ہے موصوف پر کیونکہ اس صفت کے ظہور سے اللہ پہچانا جاتا ہے"۔یہاں سے معلوم ہوا کہ میرا مولاؑ جامعِ صفاتِ خدا ہے اور اس کی ذاتِ پاک میں شرک کرنا ہی شرک فی

الصفات کہلاتا ہے۔

شرک فی الفعل:۔اسی نقطے کے بارے میں جنابِ امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے۔''یہی وہ نقطہ ہے جو خداوندِ ذوالجلال کا فعلِ اوّل ہے''۔(نہج الاسرار جلد۱ صفحہ ۳۴)۔فعل کے بارے میں اچھی طرح جان لیجئے کہ اس کا کوئی تعلق اللہ کی ذات سے نہیں ہوسکتا کیونکہ فعل ایک حالت سے دوسری حالت میں آنے کا نام ہے اور اللہ کیلئے نہ حال ہے اور نہ تغیر۔پس یہ فعلِ اوّل وہ ہے جو مشیّت کے روپ میں ظاہر ہوا اور تمام افعالِ خداوندی کا ظہور اسی سے ہوا۔اسی لئے آپؑ نے خود فرمایا ہے۔''میں یداللہ ہوں، جو کچھ وہ (اللہ) کرتا ہے، مجھ سے کرتا ہے۔جو کچھ اس سے صادر ہوتا ہے، میرے ہاتھ سے ہوتا ہے۔کرتا میں ہوں کہلاتا اس کا ہے''۔(کوکبِ دری صفحہ ۳۵)۔معلوم ہوگیا کہ جس کو ہم اللہ کا فعل کہتے ہیں وہ میرے مولا علیؑ کا فعل ہوتا ہے اور شرک فی الفعل اسی مقدس وجود میں کسی کو شریک کرنے کا نام ہے۔

شرک فی الامر:۔اس بارے میں ہمیں زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں کیونکہ امر کے بارے میں ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور مولاؑ کا یہ فرمان بھی آپ تک پہنچا چکے ہیں کہ ''میں ہوں اللہ کا امر اور اس کی روح''۔لہٰذا یہی وہ امرِ خدا ہے جس میں کسی کو شریک کرنے کو شرک فی الامر کہا جاتا ہے۔

ہم نے مختصراً شرک کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کردیں اور اب ان کی توثیق

کیلئے دو احادیثِ معصومؑ پیش کرتے ہیں۔

ا۔تفسیرِ نورالثقلین ج ۳۔صفحہ ۱۷۱۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اتنی معافی دے گا جس کا تصور بھی کسی کے دل میں نہ ہوگا۔ اور اللہ کی رحمت کو دیکھ کر اہلِ شرک یہ کہنے لگ جائیں گے کہ خدا کی قسم ہم مشرک نہیں تھے۔ وہ کہیں گے کہ اے پروردگار ہم ولایتِ علیؑ میں شرک کرنے والے نہیں تھے''۔

۲۔قرآن کی آیت ''اللہ اسے نہیں بخشے گا جو کسی کو اس کا شریک قرار دے''۔اس کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔

''جو شخص علیؑ کی ولایت اور اطاعت میں کسی کو شریک کرے گا، اللہ اسے نہیں بخشے گا''۔(تفسیرِ فرات صفحہ ۶۳)

افشاءِ راز

یہ چونکہ ہمارا محبوب موضوع ہے اور اس بارے میں ہمیں بہت کچھ عرض کرنا ہے اس لئے آگے بڑھنے سے پیشتر ہم چاہتے ہیں کہ ایک ضروری وضاحت کر دیں کیوں کہ یہ وہ پھانس ہے جو مومن اور غیر مومن دونوں کو کھٹکتی ہے۔ ہمارے ایک بہت ہی عزیز اور محترم دوست ہیں جو ایک متبحر عالم دین، مبلّغِ ولایت علیؑ اور دولتِ حبِّ علیؑ سے مالا مال ہیں۔اللہ اُن پر اپنی رحمتوں، برکتوں اور توفیقات کی بارش کرتا ہے۔ جب ہماری

کتاب کشف المعارف منظرِ عام پر آئی تو انہوں نے ہمیں فون کیا اور انتہائی مشفقانہ انداز میں کہا کہ "جو باتیں آپ نے اس کتاب میں لکھی ہیں وہ ایسی ہیں کہ انسان اپنے گھر میں جائے اور دروازہ بند کرے۔ پھر کمرے میں جائے اور اس کا دروازہ بند کرے۔ پھر تہہ خانے میں جائے اور اس کا دروازہ بند کرے، تب یہ باتیں کرے"۔ ہم ان کے خلوص اور بے لوث محبت کے تہہِ دل سے معترف ہیں۔ ان کا اشارہ غالباً اُن روایات کی طرف تھا جن میں آلِ محمدؐ کے راز کو افشاء کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے اور ہم اپنے محبوب دوست سے سو فیصد متفق ہیں کہ اسرارِ آلِ محمدؐ کو ہرگز فاش نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ یہ انؑ کے ساتھ دوستی نہیں بلکہ دشمنی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ پہلے خود "راز" کو سمجھا جائے۔ راز وہ ہوتا ہے جو انسان کے دل میں ہو اور اس کی دو صورتیں ہیں۔

۱۔ یا تو وہ کسی کو نہ بتائے اور دل کی بات دل ہی میں رکھے۔ ایسی صورت میں افشاءِ راز کا کوئی امکان سرے سے ہے ہی نہیں۔

۲۔ یا پھر وہ کسی کو اپنا راز دار بنا کر اپنے راز سے اُسے آگاہ کرے اور راز داری کی تاکید کر دے۔ ایسی صورت میں تمامتر ذمہ داری اُس راز دار پر آجاتی ہے۔ اگر وہ راز کو فاش کر دے اور وہ بات ساری دنیا میں پھیل جائے تو پھر باقی لوگوں کیلئے وہ بات راز نہیں رہتی اور نہ ہی اسے چھپانے سے کوئی فائدہ ہوتا ہے اگر آپ نے ہماری کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہے تو آپ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ہم نے فضائلِ آلِ محمدؐ میں جتنی

بھی روایات نقل کی ہیں ان کا ماخذ وہ کتابیں ہیں جو آج کل مارکیٹ میں موجود ہیں اور ساری دنیا انہیں پڑھتی ہے۔ یہ وہ روایات ہیں جو ائمہؑ طاہرین نے بھری محفلوں میں بیان فرمائی ہیں۔ یہ وہ خطبات ہیں جو امیرالمومنینؑ نے ہزاروں کے مجمعے میں ارشاد فرمائے ہیں جبکہ وہ جانتے تھے کہ ان مجمعوں کی اکثریت منافقین پر مشتمل تھی۔ لہٰذا ان روایات وخطبات میں راز داری کا کوئی پہلو موجود نہیں ہے۔ یہ عام باتیں ہیں جو سب کے سامنے بیان کی گئیں، نسل در نسل نقل کی گئیں، کتابوں کا حصہ بنیں اور آج وہ کتابیں مختلف زبانوں میں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں لہٰذا ان باتوں کو چھپانا چاند پر خاک ڈالنے کے مترادف ہے۔ اب اگر کسی شخص کو جاہل رہنے کا شوق ہے اور وہ آل محمدؐ کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں اور اسے اس قسم کی روایات پڑھ کر دھچکا لگتا ہے تو اس کی ذمہ داری تو ہم نہیں اٹھا سکتے۔

دوسری صورت میں اگر ائمہؑ نے کسی سے راز داری میں کوئی بات کی اور اسے افشاء نہ کرنے کی تاکید کی لیکن اس شخص نے جوشِ محبت میں اس بات کو عام کر دیا اور وہ سب کو معلوم ہوگئی تو اس صورت میں بھی وہ بات راز نہ رہی اور اب اسے چھپانا یا نہ چھپانا دونوں برابر ہیں۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے آلِ محمدؐ کا کوئی راز افشاء کیا ہے اور نہ ہی ہم کوئی ایسی روایت نقل کرتے ہیں جو کتابوں کے ذریعے عام نہ ہوگئی ہو۔ رہی مقصروں کی بات تو وہ بد بخت تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ راز کے نام پر آلِ محمدؐ کے تمام فضائل چھپا دیے جائیں اور ایسا ہم ہونے نہیں دیں گے۔ انشاءاللہ!

اوّل وآخر

یہ عنوان قائم کرنے سے ہمارا مقصد امیر اؑلمومنین کے اس فرمان پر ایک سرسری نظر ڈالنا ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "میں ہی اوّل ہوں میں ہی آخر ہوں"۔اور یہ تمام گفتگو ذہنی لذت کے حصول کیوجہ سے نہیں کی جارہی بلکہ اس کا تعلق خالصتاً ہمارے موضوع یعنی معرفتِ ولایتِ علیؑ سے ہے

سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ اوّل اور آخر، دونوں کا تعلق عدد سے ہے۔یعنی یہ دونوں شمار میں آنے والی چیزیں ہیں۔اور جو چیز شمار میں آجائے وہ مخلوق ہوتی ہے۔لہٰذا معنوی اعتبار سے ان دونوں الفاظ کا اطلاق کسی ایسی شے پر نہیں ہوسکتا جو قدیم ہو کیونکہ قدیم کہتے ہی اس کو ہیں جس کا نہ آغاز ہو نہ انجام۔اس اعتبار سے ان الفاظ کو نہ تو اللہ کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے اور نہ میرے مولاؑ کیلئے۔اس کے باوجود اللہ نے بھی اوّل وآخر ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور امیر اؑلمومنین نے بھی۔لہٰذا ہر مومن کا فرض ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کرے کیونکہ قولِ معصومؑ سن کر واہ واہ کر دینے سے معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ضروری نہیں کہ فرمانِ معصومؑ کے تمام اسرار و رموز سمجھ میں آجائیں لیکن جہاں تک ذہن جاسکتا ہے وہاں تک ضرور غور و تدبّر کرنا چاہیئے۔اس طرح مختلف عقلیں جدا جدا نتیجوں پر پہنچتی ہیں اور اس طرح مجموعی اعتبار سے ایک خاکہ تیار ہوتا ہے جو تفہیمِ معنی میں مدد و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ہم نے بھی اپنی

استطاعت کے مطابق اس پر غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس فرمان کا تعلق اصلِ وجود سے نہیں بلکہ ظہور و جود سے ہے۔یاد رکھیئے کہ **"کُنتُ کنزاً مخفیّا"** مقامِ خفی ہے اور اس کا ظہور مقامِ الوہیت ہے۔یعنی ہُوئیت جب منزلِ ظہور پر آتی ہے تو **"لا الٰہ الّا اللہ"** کہلاتی ہے۔یہ مقامِ الوہیت یعنی **"لا الٰہ الّا اللہ"** بذاتِ خود ایک مقامِ خفی ہے اور یہ مقام جب مرتبۂ اظہار میں آتا ہے تو **"علیٌ ولی اللہ"** کہلاتا ہے اور دونوں کا مقصود و مطلوب ولایت ہے۔گویا **"لا الٰہ الّا اللہ"** باطنِ ولایت ہے اور **"علیٌ ولی اللہ"** ظاہرِ ولایت ہے اور ان دونوں کے درمیان جو **"محمدٌ الرسول اللہ"** ہے اس کا کام اس باطن کو ظاہر کرنا یعنی تعارفِ ولایت کرانا ہے۔اگر کسی کے دل کو ٹھیس پہنچی ہو تو میں اس کیلئے معذرت خواہ ہوں لیکن میرے نزدیک فضائلِ علیؑ کو چھپانا ایک سنگین ترین جرم ہے جس کا میں کسی حال میں بھی مرتکب نہیں ہوسکتا۔ آپ چاہے کچھ بھی کہیئے۔ملکوتیت کہیئے،ہُوئیت کہیئے،لاہُوتیت کہیئے،بلکہ اگر اور بھی الفاظ ذہن میں آتے ہوں تو وہ بھی کہیئے۔آپ ان مقامات کا نام لیتے رہیں گے اور میں کہتا رہوں گا "علیؑ،علیؑ،علیؑ،علیؑ"۔ ہمارے علماء نے لوگوں کو لفظوں میں الجھا رکھا ہے لیکن موٹے موٹے الفاظ بول کر ذات تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ ذات کے بارے میں غور کرنے کی انتہائی سختی سے ممانعت کی گئی اور امیر المومنین نے انتہائی تاکید سے

فرما دیا ہے کہ ''اللہ کی ذات بشر کیلئے غیرِ معلوم ہے''۔ جب غیرِ معلوم ہے تو کوئی اس خام خیالی میں نہ رہے کہ وہ بھاری بھاری الفاظ کے ذریعے ذات کا تعارف کرا دے گا بلکہ جس جس مقام تک اس کے ذہن کی رسائی ہوگی وہاں اسے علیؑ ہی جلوہ فرما نظر آئے گا۔

یہاں ہم نے ''اوّل و آخر'' کی ایک ممکنہ توجیہ بیان کی اور وہ یہ کہ دین کا اوّل بھی ولایت اور آخر بھی ولایت ہے۔ بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ جب مقصد و مقصودِ خداوندی ذاتِ علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کا تعارف کرانا ہے تو کلمہِ **''علیٌ ولی اللہ''** سب سے آخر میں کیوں ہے؟۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس سوال کا جواب بھی اس طرح دے دیں کہ بات لمبی بھی نہ ہو اور سمجھ میں بھی آ جائے۔

ترتیبِ ذہنی اور ترتیبِ عملی

جب بھی کوئی کام کیا جاتا ہے تو ہمیشہ ایک خاص ترتیب سے کیا جاتا ہے۔ اِس ترتیب کی دو قسمیں ہیں۔ ترتیبِ ذہنی اور ترتیبِ عملی، اور یہ دونوں ایک دوسرے کے برعکس ہوتی ہیں مثلاً اگر آپ ایک چھپّر ڈالنے کا ارادہ کریں تو آپ کے ذہن میں سب سے پہلے چھپّر آئے گا۔ پھر آپ سوچیں گے کہ چھپّر تو بغیر بانسوں کے قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ تو دوسرے نمبر پر آپ کے ذہن میں بانس آئیں گے۔ پھر خیال آئے گا کہ بانس تو کھڑے ہی نہیں ہو سکتے جب تک گڑھے کھود کر ان میں بانسوں کو گاڑا نہ جائے۔ اس

طرح تیسرے نمبر پر آپ کے ذہن میں گڑھے آئیں گے۔ یہ ترتیب اس طرح ہوئی کہ پہلے چھپّر، پھر بانس، پھر گڑھے۔لیکن جب آپ عملی طور پر چھپّر ڈالنے جائیں گے تو یہ ترتیب الٹ جائے گی۔ اب آپ سب سے پہلے گڑھے کھودیں گے، پھر بانس گاڑیں گے اور سب سے آخر میں چھپّر ڈالیں گے۔ یہی حال معرفتِ توحید کا ہے کہ جب آپ اس کا ارادہ کریں گے تو سب سے پہلے **لا الٰہ الّا اللہ** آئے گا اور سب سے آخر میں **علیٌ ولی اللہ** آئے گا۔لیکن جب آپ عملی طور پر معرفتِ توحید کی طرف بڑھیں گے تو ابتداء **علیٌ ولی اللہ** سے کریں گے اور انتہاء **لا الٰہ الّا اللہ** پر ہوگی۔ یہ بھی علیؑ ہی کا ایک مقام ہے، مگر الوہیت کی منزل پر۔ گویا اوّل بھی علیؑ اور آخر بھی علیؑ۔ طالب بھی علیؑ اور مطلوب بھی علیؑ۔ شاہد بھی علیؑ اور مشہود بھی علیؑ، عابد بھی علیؑ اور معبود بھی علیؑ اور آپؑ کا ارشاد "**انا اوّلُ وانا الآخر**"، **انا مطلوبِ کلِّ طالبٍ**"، "**انا الشاھدُ والمشود**" اور "**انا عابدُ والمعبود**" اس پر دلیل ہے۔

اوّل وآخر کا دوسرا گوشہ یہ ہے کہ اوّل بھی سجدہ علیؑ ہی کو کرایا گیا تھا جبکہ آدمؑ کو قبلہ بنایا گیا تھا اور قیامت میں آخری سجدہ بھی علیؑ ہی کو کیا جائے گا جبکہ ساق پر سے حجاب اٹھایا جائے گا۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ اوّلین وآخرین ولایتِ علیؑ ہی کے مکلّف تھے اور ان کی نجات کا

دار ومدار میرے مولاؑ کی ولایت پر ہی تھا۔ یہاں ہم عقلی بحث میں نہیں پڑیں گے کیونکہ یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ **لا الٰہ الّا اللہ** تک **علیؑ ولی اللہ** کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے اور ہر نبی نے اپنی اپنی امت تک پیغامِ توحید ہی پہنچایا ہے اس لئے ان کیلئے لازم تھا کہ وہ لوگوں کو ولایتِ علیؑ ہی کی دعوت دیتے کیونکہ اس کے بغیر ان کا مقصد ہی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم اس سلسلے میں چند احادیثِ معصومینؑ آپ تک پہنچانا چاہتے ہیں جن سے ہمارا مدعا ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۴۹۱۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''یا علیؑ! تو وہ ہے کہ اللہ نے ابتدائے تخلیق کے وقت تیرے ذریعے حجت قائم کی تھی''۔

۲۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۰۸۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''خدا کی قسم جو لوگ تم سے پہلے ہلاک ہوئے اور جو قیامِ قائمؑ تک ہلاک ہوں گے وہ ہماری ولایت چھوڑنے اور ہمارے حق کے انکار کی وجہ سے ہلاک ہوئے اور ہوتے رہیں گے''۔

۳۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۷۹ ۳۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔

''جس کتاب کی تعلیمات پر اہلِ کتاب کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی اس میں مولا علیؑ کی ولایت بھی شامل ہے''۔

۴۔ سورۂ نساء ۴۴۔ ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے، وہ گمراہی کا کاروبار کر رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ''۔ اس

آیت کی تفسیر میں معصومؑ فرماتے ہیں۔ ''اہلِ کتاب امیرالمومنینؑ کے متعلق بھٹک گئے تھے اور وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی ولایتِ علیؑ سے، جو کہ صراطِ مستقیم ہے، بھٹک جائیں''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۳۷۸)۔

یہ اوّل تھا جس کا تعلق اوّلین سے تھا۔ اب آخر کے متعلق چند احادیث پیش خدمت ہیں جن کا تعلق آخرین سے ہے۔

۱۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۵۶۔ جنابِ امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔

''غدیرِ خم کے مقام پر آنحضرتؐ نے اپنے خطاب میں فرمایا۔ ''لوگو اللہ نے میرے ذمے ایک پیغام لگایا ہے جس کی وجہ سے میرا سینہ تنگ ہو گیا ہے اور مجھے یہ گمان ہوا کہ اس حکم سے لوگوں کی آزمائش کی جائے۔ لیکن اللہ نے مجھے دھمکی دی اور فرمایا کہ میں اس پیغام کو پہنچاؤں ورنہ وہ مجھے عذاب دے گا''۔

۲۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۲۷۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔

''یا علیؑ! اللہ نے مجھے تیری ولایت کے اعلان کا حکم صادر کیا اور یہ بھی فرمایا کہ اگر میں نے تیری ولایت کا اعلان نہ کیا تو میرے عمل ضائع ہو جائیں گے''۔

یہ آخر تھا جس کا تعلق آخرین سے ہے۔

تقدیم

یہ لفظ ''قِدَم'' سے بنا ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں کسی شے کا اقرار یا انکار ممکن نہیں

ہوتا کیونکہ اقرار اور انکار کا تعلق ظہور سے ہے۔ ایمان بالغیب بھی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی ایسی چیز ظاہر نہ ہو جس کے ذریعے غیب پر ایمان لایا جا سکے۔ کیونکہ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ مجہول کو معلوم کے ذریعے جانا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ سے یہ پوچھا جائے کہ اگر ایک گیند کی قیمت دس روپے ہو تو پچاس گیندوں کی قیمت بتایئے، تو آپ فوراً ضرب کے طریقے سے یہ قیمت معلوم کر لیں گے کیونکہ یہاں ایک معلوم، یعنی ایک گیند کی قیمت، آپ کے علم میں ہے۔ لیکن اگر آپ کے پاس کوئی معلوم نہ ہو اور آپ سے یہ پوچھا جائے کہ پچاس گیندوں کی قیمت بتایئے تو آپ قیامت تک نہیں بتا سکیں گے۔ قِدم کا ادراک بھی اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب کوئی قدیم مقامِ احداث پر ظہور کرے اور ہم اس کے ظاہر سے اس کے باطن کا ممکنہ ادراک حاصل کریں۔ عام فہم زبان میں قدیم اس کو کہتے ہیں جس کی نہ ابتداء ہو نہ انتہاء۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کو قدیم ماننا تو سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن امیرالمومنین کی تقدیم کو کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے؟۔ یہاں ہم ایک بار پھر یہی عرض کریں گے کہ اللہ کی کسی بھی صفت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ ظاہر نہ ہو جائے۔ تقدیم بھی ایک صفت ہے اور اس کا بھی کوئی نہ کوئی مظہر ہونا لازمی ہے۔ یہاں پھر کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ ہم تو ایک قدیم کو ماننے والے ہیں، اگر مظہر کو بھی قدیم مانا جائے تو پھر تو دو قدیم ہو جائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس ایک قدیم کو ہم مانتے ہیں وہ قدیم بالذات ہے، یعنی اپنے وجود میں وہ کسی کا محتاج نہیں

ہے۔ جب کہ مظہر، اگرچہ قدیم ہے، لیکن قدیم بالغیر ہے۔ یعنی اس کا وجود اُس قدیم بالذات پر منحصر ہے۔ اس کو ہم آگ اور حرارت کے ذریعے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ آگ اپنی ذات پر قائم ہوتی ہے، وہ حرارت کی محتاج نہیں ہوتی۔ جبکہ حرارت کا وجود آگ پر انحصار کرتا ہے۔ اس کے باوجود کوئی ایک لمحہ بھی ایسا فرض نہیں کیا جاسکتا جب آگ ہو مگر حرارت نہ ہو کیونکہ حرارت آگ کا اثر ہے۔ اسی طرح مظہر بھی ذات کا اثر ہوتا ہے اور اسے پلک جھپکنے کی مدت کیلئے بھی ذات سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا مظہر کا قدیم ہونا عقلاً واجب ہے۔ لیکن ذات اور مظہر میں تمیز اس طرح قائم ہوتی ہے کہ ذات کا ظاہر ہوجانا محالِ عقلی ہے کیونکہ وہاں تغیر ہے ہی نہیں۔ لیکن مظہر کو چونکہ مقامِ اظہار پر آنا ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے علم، اپنی قدرت اور اپنے تصرف کو کام میں لاتا ہے اور جس شکل میں چاہتا ہے منقلب ہوجاتا ہے۔ تعارفِ ذات اس کے بغیر ہو نہیں سکتا اور یہی تغیر و انقلاب ذات اور مظہر کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے اور اسی سے اثباتِ ذات ہوتا ہے کیونکہ ذات دعویٰ ہے اور مظہر دلیل۔ اسی لئے مظہر کو ذوجہتین (دوپہلو والا) کہا جاتا ہے۔ یعنی جب وہ قربِ ذات میں ہوتا ہے تو قدیم ہوتا ہے اور یہی اس کی اصل ہے۔ لیکن تعارفِ ذات کیلئے جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو اُسے مرحلۂ احداث میں آنا ضروری ہوتا ہے اور یہ اس کی مجبوری نہیں بلکہ کمالِ قدرت ہے اور "**انا اللہ علیٰ کُلِ شئٍ قدیر**" کا دعویٰ اس کے احداث

سے ہی ثابت ہوسکتا ہے،اس کے علاوہ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔اب یہ کس طرح مختلف صورتوں میں منقلب ہوتا ہے،اس کا ایک اجمالی جائزہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

وجود، واجد اور موجود

سب سے پہلے تین چیزوں کا سمجھنا اور ان میں فرق کرنا ضروری ہے اور وہ ہیں مخلوق، اثر اور احداث۔مخلوق وہ ہوتی ہے جو وجود نہ رکھتی ہو اور اسے وجود دیا جائے۔جب تک اسے وجود نہ دیا جائے اس وقت تک وہ معدوم ہوتی ہے اور جب اسے وجود مل جاتا ہے تو وہ موجود کہلاتی ہے۔اسے معدوم سے موجود بنانے والے کو واجد کہتے ہیں یعنی وجود بخشنے والا۔اثر ان دونوں سے مختلف شے ہے۔وہ چونکہ ذات کا مظہر ہے اسلئے وہ کبھی معدوم ہو ہی نہیں سکتا۔اسے کسی نے خلق کیا ہی نہیں اسلئے اسے مخلوق بھی نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ خود وجود ہے۔جب یہ تعارفِ ذات کیلئے مرتبۂ ظہور پر آتا ہے تو اسے احداث کہتے ہیں۔ائمہؑ طاہرین نے بعض مقامات پر خود کو مخلوق کہا ہے اس لئے اس لفظ کو اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔اثر جب ظہور کرتا ہے تو اس کی پہلی منزل مشیّت ہوتی ہے جسے ابداع بھی کہا جاتا ہے۔اس کے بارے میں امام رضاؑ فرماتے ہیں۔"ابداع،مشیت اور ارادہ اگر چہ تین الگ الگ الفاظ ہیں مگر ان تینوں کے معنی ومفہوم ایک ہیں"(عیونِ اخبارالرضاؑ حصہ اوّل صفحہ ۲۹۷)۔اب یہ ابداع،

مشیت یا ارادہ جب خود کو مخلوق کہتا ہے تو اس سے کیا مراد ہوتا ہے، یہ بات آپ امام رضاؑ کی ہی زبانِ مبارک سے سنئے۔ آپؑ فرماتے ہیں۔ "ابداع مخلوقِ ساکن ہے جس کا اقرار سکون سے نہیں ہوتا (یعنی جب تک یہ اپنی شکل نہ بدلے اس وقت تک اسے جانا نہیں جا سکتا) اسے مخلوق کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اس کا احداث کیا ہے (یعنی پہلے یہ پوشیدہ تھی پھر اسے ظاہر کیا، یعنی اس کی حالت میں تغیر کیا)۔ اللہ نے اسے اس وقت بنایا جب ان دو (یعنی ذات اور اثر) کے علاوہ کوئی تیسری چیز موجود نہ تھی۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ اللہ کی ہر پیدا کردہ (یعنی احداث کردہ) چیز کو لفظِ "مخلوق" سے تعبیر نہیں کیا جاتا"۔ (عیونِ اخبار الرضاؑ ج ا صفحہ ۳۰۰)۔

ہمیں یقین ہے کہ آپ اس علّت کو سمجھ گئے ہوں جس کی بناء پر ائمہؑ طاہرین نے بعض مقامات پر خود کو مخلوق کہا ہے۔ اب یہ سمجھیئے کہ وجود ذات ہے جس کا مظہر اس کا اثر ہے۔ اسلئے ہمارے لئے اثر ہی عینِ وجود ہے کیونکہ ذات ہمارے لئے غیر معلوم ہے۔ جب یہ تعارف کی منزل پر آئے گا تو اس کیلئے معروف کے ساتھ ساتھ عارف (یعنی مخلوق) کی بھی ضرورت پڑے گی لہٰذا یہی وجود، واحد کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے اور موجودات کو خلق کرتا ہے اور اس کا کمالِ قدرت یہ ہے کہ عینِ وجود ہوتے ہوئے بھی یہ نہ صرف یہ کہ واحد کا روپ اختیار کرتا ہے بلکہ مخلوق کی خلقی مجبوریوں کے پیشِ نظر خود بھی مخلوق کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ گویا وجود

بھی یہی، واحد بھی یہی اور موجود بھی یہی ہوتا ہے۔ظاہر بین نگاہیں اس مقام پر دھوکا کھاتی ہیں اور اس کی شان میں تقصیر کرتی ہیں اسی لئے انہیں ''میں ہی عابد ہوں اور میں ہی معبود ہوں'' کا مطلب آج تک سمجھ نہیں آیا اور نہ انشاءاللہ آئندہ کبھی آئے گا۔ حیرت ہوتی ہے کہ جولوگ اپنی ناک سے آگے نہ دیکھ سکتے ہوں وہ کیونکر ان مقاماتِ عالیہ کاانکار کرتے ہی اور پھر اپنے انکار پر اصرار کرتے ہیں۔

صفاتِ ذات اور صفاتِ فعل

اسی بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے اور احداث کی صحیح تفہیم کیلئے ہم صفاتِ خداوندی کی اقسام پر ایک مختصر گفتگو کرتے ہیں۔لیکن یہ ہمیشہ ذہن میں رکھیئے گا کہ ہر شے کا ایک وجودِ باطنی ہوتا ہے اور ایک وجودِ خارجی اور اللہ کی صفات کا وجودِ باطنی اور وجودِ خارجی، دونوں میرا مولا امیر المومنین ہے کیونکہ نقطہ ہونے کے ناتے وہ جامع صفاتِ خدا ہے

اللہ کی صفات دو اقسام پر ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کا تعلق اس کی ذات سے ہے۔ ان صفات کو صفاتِ ذات کہا جاتا ہے۔ ان صفات میں تغیر و تبدّل نہیں ہوتا۔ یہ قدیم ہوتی ہیں اور ان کا عدم محال ہے۔ کچھ صفات وہ ہوتی ہیں جن کا تعلق احداث سے ہوتا ہے۔ان صفات کو صفاتِ فعل کہا جاتا ہے۔ یہ قدیم نہیں ہوتیں، ان میں تغیر و تبدّل بھی ہوتا ہے اور ان کا عدم بھی ممکن ہوتا ہے۔ یہ ہرگز نہ سمجھیئے کہ ہم یہ سب کچھ اپنے دل

سے گھڑ کر یا علماء کے قیاسات ومفروضات کی بنیاد پر لکھ رہے ہیں۔ بلکہ یہ علمِ توحید کا ایک اہم موضوع ہے اور اصولِ کافی میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں وہ فرمائشاتِ معصومینؑ سے ہی ماخوذ ہے۔

صفاتِ ذات اور صفاتِ فعل کی پہچان کا طریقہ یہ ہے کہ جس صفت کی ضد کا اطلاق اللہ پر نہ ہوتا ہو وہ صفتِ ذات ہے۔ مثلاً علم کی ضد ہے جہل۔ قدرت کی ضد ہے عجز۔ اب چونکہ جہل اور عجز اللہ کے لئے جائز نہیں اس لئے علم وقدرت صفاتِ ذات ہیں۔ اس کے برخلاف مشیت، ارادہ، امر، خلاّقیت، رحمانیت اور ان جیسی دیگر صفات ایسی ہیں جن کی ضد کا بھی اللہ پر اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کبھی چاہتا ہے کبھی نہیں چاہتا، وہ کبھی ارادہ کرتا ہے کبھی نہیں کرتا، وہ کبھی امر کرتا ہے کبھی نہیں کرتا، وہ کبھی خلق کرتا ہے کبھی نہیں کرتا، وہ کبھی رحم کرتا ہے کبھی نہیں کرتا۔ لہٰذا ایسی تمام صفات، صفاتِ فعل ہیں۔ اور صفاتِ فعل کا ظہور میں آنا ممکن ہی نہیں جب تک صفاتِ ذات کی مدد شاملِ حال نہ ہو۔ اس کو یوں سمجھیئے کہ اللہ کی جتنی بھی صفاتِ فعل ہیں ان کی بنیاد مشیت ہے جو خود بھی صفتِ فعل ہے لیکن مشیت علم سے ظاہر ہوتی ہے اور علم صفتِ ذات ہے۔ صفتِ ذات کا صفتِ فعل کو ظاہر کرنا ہی احداث کہلاتا ہے۔ یہ خلق ہرگز نہیں ہوتا بلکہ اظہار ہوتا ہے اور اظہار تغیر چاہتا ہے۔ پس مشیت ہو یا ارادہ ہو یا امر ہو، یہ مخلوق نہیں ہیں لیکن احداث کی وجہ سے تقدیم سے خارج ہیں۔ اسی لئے صرف سمجھنے اور

سمجھانے اور انہیں قدیم سے ممیّز کرنے کیلئے انہیں مخلوق کہا جاتا ہے۔ ان کا احداث کرنا ہی اللہ کے قدیم ہونے پر دلیل ہے کیونکہ اگر یہ احداث نہ ہوتا تو خدائے قدیم کا تعارف کرانے والا ہی کوئی نہ ہوتا۔ چونکہ جامع صفاتِ ذات بھی میرا مولاؑ ہے اور جامع صفاتِ فعل بھی وہی ہے اسی لئے انسانیت کو اس کی ذات میں ہمیشہ اشتباہ رہتا ہے کیونکہ وہ احداث کو نہیں سمجھتے اور بغیر اسے سمجھے ہوئے قدیم و حادث کا ایک جگہ جمع ہونا لوگوں کی سمجھ میں کبھی نہیں آسکتا۔ لیکن جو لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں وہ کبھی اُس کی بشریت سے دھوکا نہیں کھاتے۔ وہ کبھی نہیں گڑبڑاتے جب وہ اپنے مولاؑ کو یہ فرماتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ "میں ہوں اللہ کا علم، میں ہوں اللہ کی قدرت" کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہؑ جامع صفاتِ ذات ہیں۔ اور وہ کبھی حیرت میں نہیں پڑتے جب وہ سنتے ہیں کہ "میں ہوں اللہ کی مشیت، ارادہ اور امر"۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ جو جامعِ صفاتِ ذات ہے وہی جامعِ صفاتِ فعل بھی ہے۔ چونکہ عملی اعتبار سے ہمارا واسطہ صفاتِ فعل سے پڑتا ہے۔ اس لئے ہم جب بھی اپنے مولاؑ کا ذکر کرتے ہیں تو ابتداء مشیت سے کرتے ہیں۔ یہ ہماری کوتاہ نظری ہے، یہ ہمارا نقصِ تخلیقی ہے، یہ ہماری حد ہے اور یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے۔ لیکن اپنے نقص کو ان کا نقص سمجھ لینا، اپنی حد کو ان کی حد تصور کرلینا اور اپنی مجبوری کو ان کی مجبوری جان لینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ "عصر کی قسم! پوری انسانیت گھاٹے میں ہے"۔

حقِ ظلّی اور حقِ وجودی

حقِ مطلقہ اور عالمِ کون و مکاں کی اصل حقیقت یہی مشیت ہے جو ذاتِ خدا کا مظہرِ اوّل ہے۔اس کے اثبات اور تائید کیلئے ایک پورا نظام خلق کیا گیا اور اس نظام کو حق کہا گیا۔ نظامِ تکوینی ہو یا نظامِ تشریعی، دونوں کا مقصد اسی کا تعارف کرانا تھا۔ ہر وہ شے جو ولیِٔ کبریا کا تعارف کرائے اس کا حق ہونا ضروری ہے کیونکہ حق کی دلیل صرف حق ہوتا ہے۔نبوت حق ہے، امامت حق ہے، قرآن حق ہے، زندگی حق ہے، موت حق ہے، جنت حق ہے، جہنم حق ہے۔لیکن یہ تمام چیزیں حقِ ظلّی ہیں۔ظل کا مطلب ہے سایہ۔ انسان اگر روشنی میں کھڑا ہو تو اس کا سایہ اس کے ساتھ ہوتا ہے جو اس سے مشابہ ہوتا ہے۔سائے کا اپنا ایک الگ وجود ہوتا ہے اور یہ بات قولِ معصومؑ اور سائنس، دونوں سے ثابت ہے کہ سائے کا وزن بھی ہوتا ہے لیکن یہ اپنے وجود کیلئے صاحبِ ظل کا محتاج ہوتا ہے اور وہی کچھ کرتا ہے جو اصل وجود کرتا ہے۔ وہ اگر ساکن ہو تو سایہ بھی ساکن رہتا ہے۔ وہ اگر حرکت کرے تو سایہ بھی حرکت کرتا ہے اور اسی سمت میں سفر کرتا ہے جس میں اصلِ وجود سفر کرے اور کسی صورت بھی اپنے اصل سے جدا نہیں ہوتا۔ اسی مفہوم کو سمجھانے کیلئے رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''حق علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ حق کے ساتھ ہے۔ پروردگار! پھیر دے حق کو اس طرف جدھر علیؑ پھرے''۔ یہ حدیث ہی یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ اصل وجودِ حق علیؑ ہے اور باقی جتنی چیزیں ہیں وہ حقِ ظلّی

ہیں کیونکہ حرکت وجودِ اصلی ہی کیا کرتا ہے اور سائے کا کام اس کا اتباع کرنا ہوتا ہے۔

اسم اور معنی

ہم نے کشف المعارف میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے جہاں ہم نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ مجید میں بیشتر مقامات پر لفظِ ''اللہ'' اسم کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کی بہت سی مثالیں بھی ہم نے پیش کی تھیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ تمام باتیں آپ کے اذہان میں محفوظ ہوں گی۔ اب ہم اس سے آگے قدم بڑھاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس لفظ کی حقیقت کیا ہے۔

''اللہ'' اسم ہے یا معنی؟

لوگوں کے خودساختہ شرک کی جڑیں کاٹنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس بات کی تہہ تک پہنچا جائے کہ لفظِ ''اللہ'' کی حقیقت کیا ہے؟ یہ اسم ہے یا معنی؟۔ تا کہ توحید کی روح کو سمجھا جا سکے ورنہ جیسا کہ ہم نے کشف العقائد میں عرض کیا تھا کہ جس طرح لوگوں نے اللہ کا تصور اپنے ذہن میں بنا رکھا ہے اور جس اللہ کی وہ پرستش کر رہے ہیں، اس اعتبار سے انسانوں کی ایک غالب اکثریت نصیریوں کے زمرے میں آتی ہے۔ پہلے ہم قرآن سے پوچھیں گے کہ اے کلام اللہ! تو ہی بتا کہ یہ ''اللہ'' جو جا بجا تیری زینت بنا ہوا ہے، اسم ہے یا معنی؟۔ اس کا جواب ہمیں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۰ میں ملا اور

ہم آیت پڑھنے سے پہلے ہی صرف اس کا عدد یعنی ۱۱۰ دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ کون ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "(اے رسولؐ) کہہ دو کہ اسے اللہ کہکر پکارو یا رحمٰن کہکر پکارو، جس نام سے بھی پکارو، پس سب اچھے نام اسی کے ہیں"۔ اس آیت نے ہمیں بتایا کہ رحمٰن اور دیگر اچھے ناموں کیطرح اللہ بھی اسم ہے نہ کہ معنی۔ اس بات میں کوئی ابہام نہیں ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہمیشہ کیلئے طے ہو جائے اس لئے اب ہم اس بات کی توثیق کیلئے معصومینؑ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جس شے کا بھی ہم نام لیتے ہیں اُس شے کا تصور ہمارے ذہن میں ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر اللہ کو معنی سمجھا گیا تو لفظ "اللہ" زبان سے ادا کرتے ہوئے اس کا کوئی نہ کوئی تصور ذہن میں ضرور پیدا ہوگا اور یہی عینِ شرک ہے کیونکہ امیرؑ المومنین نے فرمادیا ہے کہ "توحید یہ ہے کہ تم اس کو گمان میں بھی نہ لاؤ"۔ (تجلیاتِ حکمت صفحہ ۳۱۶)

۱۔ تفسیر نورالثقلین ج ۳ صفحہ ۵۰۷۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

"جو شخص اللہ اللہ کہہ رہا ہے وہ بھی اس کے اسم کو پکار رہا ہے"۔

۲۔ تفسیرِ نورالثقلین ج ۱ صفحہ ۳۹۔ امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

"لفظِ "اللہ" اس ذاتِ پاک کا سب سے بڑا نام ہے"۔

۳۔ بقرہ ۲۱۰۔ "کیا ان لوگوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ ان کے پاس بادلوں کے

سائے میں اللہ اور فرشتے آجائیں اور ہر بات کا فیصلہ ہو جائے اور تمام امور کی بازگشت اللہ کی طرف ہے"۔ اس آیت کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔

"وہ (حضرت صاحب الزمانؑ) نور کے سات قبوں میں نازل ہوگا۔ کسی کو معلوم نہ ہوگا کہ وہ کس قبۂ نور میں ہے اور وہ کوفہ کی پشت پر نازل ہوگا"۔

۴۔ تفسیر نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۳۲۹۔ حضرت صاحب الزمانؑ فرماتے ہیں۔

"تو نے جو یہ پوچھا ہے کہ میرے خاندان والے اور میرے چچازاد میرے مخالف کیوں ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی کسی انسان سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے"۔

۵۔ القطرۃ من بحار ج ا صفحہ ۲۳۵۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

"سورج کے دو اطراف ہیں۔ ایک طرف وہ ہے جو اہلِ آسمان کی طرف ہے جس پر لکھا ہوا ہے۔ **"اللہ نور السموات"** ۔(اللہ آسمانوں کا نور ہے)۔" اور دوسری طرف زمین کی طرف ہے، اس پر لکھا ہوا ہے۔ **"علیؑ نور الارضین"** ۔(علیؑ زمینوں کا نور ہے)۔

اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ زمینوں پر جس کا نام علیؑ ہے، آسمانوں پر اس کا نام اللہ ہے۔

ضمائر

اب ہم ایک اور پہلو سے اس مسئلے پر نظر کرتے ہیں اور گرامر کی رُو سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ اسم ہے یا معنی؟۔ یہ اصول ہے کہ "ضمیر" ہمیشہ اسم کیلئے بولا جاتا ہے، معنی کیلئے نہیں۔ مثلاً کہا جائے کہ "زید بہت بہادر ہے"۔ اب اس کے بعد اگر زید کی دیگر خصوصیات بیان کرنا مقصود ہو تو لفظِ زید کی تکرار نہیں کی جائے گی بلکہ کہا جائے گا کہ "وہ بہت سخی ہے۔ وہ بہت نیک ہے"۔ "وہ" ضمیر ہے جو زید یعنی اسم کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ پس یہ معلوم ہو گیا کہ جس کیلئے بھی ضمیر کا استعمال کیا جائے گا وہ اسم ہوگا نہ کہ معنی۔ عربی میں واحد غائب کیلئے "ہٗ"، "ہٖ" اور "ھُوَ" کی ضمیریں استعمال کی جاتی ہیں۔ جب ہم قرآن پر نگاہ کرتے ہیں تو ایسی ضمیروں سے پورا قرآن مزیّن نظر آتا ہے اور جگہ جگہ اللہ کیلئے یہ ضمیریں استعمال کی گئی ہیں جنہیں اگر نقل کیا جائے تو تقریباً پورا قرآن ہی نقل کرنا پڑے گا اور یہ کوئی ایسی بات ہے بھی نہیں کہ جس کی تردید کی جاسکے۔ سورۂ محمدؐ میں۔ **"فاعلم اَنّہٗ لاالٰہ الّا اللہ"**۔ آلِ عمران میں **"ھُوَ العزیزالحکیم"**، بقرہ میں **"من ذاالّذی یشفعُ عندہٗ الّا باذنہ"**۔ یہ تمام ضمیریں اللہ کیلئے استعمال کی گئی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نے جس اللہ کا تعارف کرایا ہے وہ اسم ہے نہ کہ معنی، اور اسی

لئے ائمہؑ طاہرین نے بار بار فرمایا ہے کہ پورا قرآن ہماری شان میں نازل ہوا ہے۔

ھُوَ

یہ لفظ قرآن میں دو طرح استعمال کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر اللہ کا تعارف **"ھُوَ"** سے کرایا گیا ہے اور دوسرے مقام پر **"ھُوَ"** کا تعارف اللہ کے ذریعے کرایا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا۔ **"اللہُ لا الٰہ الّا ھُوَ"**۔ یہاں اللہ کا تعارف **ھُوَ** سے کرایا گیا ہے یعنی وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ **ھُوَ** ہے۔ سورۂ اخلاص میں یہ ترتیب الٹ گئی اور وہاں ارشاد ہوا۔ **"قل ھُوَ اللہُ احد"** یہاں **ھُوَ** کا تعارف اللہ کے ذریعے کرایا گیا ہے۔ یعنی **ھُوَ** وہ اللہ ہے جو اَحَد ہے۔ ہم سمجھ گئے کہ اگر ہم نے اِس **"ھُوَ"** کو ڈھونڈ لیا تو یقیناً ہمیں اللہ مل جائے گا۔ لیکن ہم ڈھونڈ نے کہاں جاتے، سوچا کہ خود قرآن سے ہی کیوں نہ پوچھ لیں۔ اس پر تعجب نہ کریں کیونکہ یہ قرآن اگر چہ صامت ہے لیکن مومن سے کلام کرتا ہے۔ ہم اسی فکر میں تھے کہ سورۂ بقرہ سے آواز آئی۔ **"وھُوَ العلّی العظیم"**۔ یعنی باقر صاحب! آپ جس ھُوَ کو تلاش کر رہے ہیں وہ علیِ عظیم ہے۔ ہم نے بہت سوچا، بہت دیکھا کہ اوّلین و آخرین میں شاید کوئی ایسا ہو جس نے علّیِ عظیم ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ لیکن نہیں! ہر طرف خاموشی تھی۔ کسی کو جراءت نہ ہوتی تھی کہ اتنا بڑا دعویٰ

کر سکے۔ پھر اچانک یہ خاموشی ٹوٹی اور ہمیں ایک آواز آئی کہ ''میں ہوں علیؑ العظیم''۔ ہمیں ہمارا گوہرِ مراد مل گیا اور گویا زندگی بھر کی ساری آرزوئیں ایک لمحے میں پوری ہوگئیں۔ ہم نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ ہمارا مولا علیؑ تھا۔ ہم نے سوچا کہ موقع ملا ہے تو آج اپنے مالک سے اس کا نام ہی پوچھ لیں۔ پھر خیال آیا کہ ایسا نہ ہو کہ اُس بارگاہِ ذوالجلال میں اسے گستاخی تصور کیا جائے، تو کیوں نہ اللہ کے رسولؐ سے یہ بات پوچھی جائے؟۔ تب تفسیرِ نور الثقلین ج ا صفحہ ۳۰۲ پر ہمیں یہ عبارت نظر آئی کہ جب رسولؐ اللہ شبِ معراج تکبیر اور افتتاح سے فارغ ہوئے تو اللہ نے فرمایا۔ ''اے محمدؐ! اب تم میرے نام تک پہنچ چکے ہو لہٰذا میرا نام لو''۔ تو رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''۔ کیسا پیارا نام ہے میرا مولاؑ کا!

لیس کمثلہ شئ

ہم نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ ہر محبّ اپنے محبوب کو تنہا کرنا چاہتا ہے لیکن اس کیلئے اسے خود کو بھی تنہا کرنا پڑتا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم بھی تنہا ہیں اور ہمارا محبوب بھی تنہا ہے۔ یہی وقت ہے کہ ہم اُن آنکھوں کے بھنور میں ڈوب جائیں، اُن معطّر زلفوں کے سائے میں چند لمحے گزاریں، اُن ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹوں کا آبِ حیات پئیں، اُس چہرے کے ایک ایک خدوخال کو دیکھیں اور دیکھتے ہی رہیں۔ لیکن کیا کریں کہ وہاں تو سوائے یکتائی کے اور کچھ ہے ہی نہیں، ایسی یکتائی، ایسی تنہائی کہ جہاں دوئی کا

گزر تک نہیں لیکن یہ اس کا کرمِ خاص ہے کہ وہ ان تمام یکتائیوں اور تمام تنہائیوں کے ساتھ ہمارے دل میں آموجود ہوتا ہے اور ہمیں تنہا نہیں رہنے دیتا۔ ہم اپنے دوستوں سے بھی یہی کہتے ہیں کہ معرفت اجتماعی سفر نہیں ہے بلکہ یہ تنہائی کا سفر ہے جو ہر شخص کو انفرادی طور پر طے کرنا ہوتا ہے۔ اور جب انسان تنہائیوں میں سفر کرتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں اسے اپنے گردوپیش، یہاں تک کہ خود اپنی خبر بھی نہیں رہتی تو یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اسے بولنے کے لئے زبان اور سننے کے لئے کانوں کی احتیاج نہیں رہتی۔ وہ دل کی زبان سے بات کرتا ہے اور دل ہی کے کانوں سے سنتا ہے۔ دل کے کانوں میں صرف ایک آواز آتی ہے۔ "لَیس کمثلہٖ شیٔ اور دل کی زبان سے ایک ہی بات نکلتی ہے۔ "لبیکَ لبیکَ لا شریکَ لکَ"۔

مِثل کے معنی ہیں ذات میں ایک جیسا ہونا۔ سورۂ شوریٰ میں اعلان ہوا۔ **"لَیس کَمِثلِہٖ شَیٔ"**۔ یعنی ہُ کے مثل کوئی شئے نہیں۔ اب یہ **"ہُ"** جو کوئی بھی ہے وہ بے مثل ہے۔ یعنی جس پر بھی لفظ "شے" کا اطلاق ہوتا ہو، وہ اس سے جدا ہے۔ جب وہ ہر شے سے جدا ہے تو عقلاً اس کا واحد و اَحد ہونا لازم ہے، اور جب وہ واحد و اَحد ہے تو اس کا موازنہ کسی اور سے نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ موازنہ کرنے کیلئے مِثل ہونا ضروری ہے، غیرِ مِثل کا موازنہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ "x" کو "x" میں ہی جمع یا تفریق کیا جا سکتا ہے، "Y" میں ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔

لہٰذا جب ہم یہ جان لیں کہ یہ ''ھ'' کون ہے تو پھر اُس کا موازنہ کسی اور سے کرنے کا خیال دل سے نکالنا پڑے گا چاہے آبائی عقائد کتنا ہی تعاقب کیوں نہ کریں۔ اور یہ دھیان بھی رکھنا پڑے گا کہ یہ ''ھ'' واحدِ مطلق ہے جس کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے اور نہ کسی ایسی شے کو واحد کہنا جائز ہے جس کے ٹکڑے ہو سکتے ہوں۔ یہ باتیں عالمِ خلق اور عالمِ احداث سے پہلے کی ہیں، ان کو عالمِ خلق پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

''ھ'' ضمیر ہے اس لئے بغیر کسی دلیل کے یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا مصداق اسم ہے نہ کہ معنی۔ لیکن یہ کوئی ایسا اسم ہے جو اُس ذاتِ بے مثل کا مظہرِ تامّہ ہے لہٰذا اس میں ذات کی تمام خصوصیات کا موجود ہونا لازمی ہوگا۔ یہ واحد بھی ہوگا، لاشریک بھی ہوگا، معبود بھی ہوگا، مسجود بھی ہوگا۔ لیکن جو شے اس کو ذات سے ممیّز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جب اس کیلئے لفظِ بے مثل بولا جائے گا تو ہر شے اس کی مِثلیت سے خارج ہو جائے گی۔ لیکن جب ذات کیلئے یہ لفظ استعمال کیا جائے گا تو یہ اسم خود بھی اِس مِثلیت سے خارج ہو جائے گا۔ یہ بات ہم نے ''بدگمانوں'' کی زبانیں بند کرنے کیلئے کی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا واسطہ ذات سے پڑتا ہی نہیں، نہ ہی ہم اس کے بارے میں کچھ سوچ سکتے ہیں یا کہہ سکتے ہیں۔ ہمارا دائرۂ فکر و عمل تو فقط اسم تک محدود ہے لہٰذا ہم بات بھی فقط اسم ہی کی کرتے ہیں۔ اگر کسی کو برا لگتا ہے تو اسے اس کی توحید مبارک ہو۔

جب ہم اِس ''ہ'' کی کھوج میں نکلے تو ایک بار پھر ہمیں کسی کے دعوے کو تلاش کرنا پڑا، کیونکہ بغیر دعوے کے ہر دلیل بے کار ہے۔ ہم اپنی خوش عقیدگی اور اپنے قیاس کو بنیاد بنا کر یہ باتیں طے نہیں کر سکتے اور معرفت اسی چیز کا نام ہے کہ انسان وہ باتیں بھی خوشدلی سے برداشت کر لے جنہیں برداشت کرنے کی بظاہر اس میں طاقت نہ ہو۔ بہر حال اِس ''ہ'' کی تلاش میں ساری دنیا کی خاک چھان کر جب ہم بابِ علم پر پہنچے تو ''ہُ'' اور ''ہ'' دونوں کا مطلب سمجھ میں آ گیا اور ان دونوں کا تعلق خطبۃ البیان سے ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا۔ **''عندہٗ مفاتیح الغیب''** (''ہُ'' کے پاس غیب کی چابیاں ہیں)۔ بابِ علم سے آواز آئی۔ **''انَا الّذی عندی مفاتیح الغیب''**۔ یعنی ''جس ''ہُ'' کے پاس غیب کی چابیاں ہیں وہ میں ہوں''۔ قرآن میں فرمایا گیا۔ **''لَیس کمثلہٖ شیٔ''**۔ (''ہ'' کے مثل کوئی شے نہیں ہے)۔ تو بابِ علم سے آواز آئی۔ **''انا الّذی لیس کمثلہٖ شیٔ''**۔ یعنی ''جس ''ہ'' کے مثل کوئی شے نہیں وہ میں علیؑ ہوں''۔

ہم نے بڑا جی کڑا کر کے یہ باتیں لکھی ہیں، محض اس خیال سے کہ ہمارا شمار اُن بخیل لوگوں میں نہ ہو جو اپنا علم اپنے سینے میں لے کر مر جاتے ہی۔ پھر بھی اگر کسی مومن کو کسی قسم کی زحمت ہوئی ہو تو ہم اس سے معذرت خواہ ہیں۔ لیکن یہ بات بہر حال ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ مذہبِ شیعہ کا اوّل و آخر اور ظاہر و باطن میرے مولاؑ کی ذاتِ اقدس ہے

اور جو کوئی بھی خود کو شیعہ کہتا ہے وہ اس لفظ کو اپنے لئے استعمال کرنے کیلئے علیؑ ہی کا مرہونِ منّت ہے۔ رہی معرفت کی بات، تو ہر شخص جانتا ہے کہ درجاتِ معرفت جدا جدا ہیں اور ان درجات پر کبھی اختلاف نہیں کرنا چاہیئے بلکہ جب معرفت کے باب میں کسی ایسی شے کا علم ہو جو معرفت میں اضافہ کرنے والی ہو تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اس معاملے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ وہ معرفت ہے جو ہم اور آپ پر ہی نہیں بلکہ تمام انبیاءؑ و اوصیاءؑ و اولیاءؑ، یہاں تک کہ حضرتِ خاتمؐ النبیین پر بھی واجبِ عینی ہے جس کی گواہی آپؐ خود ان الفاظ میں دے رہے ہیں کہ "یا علیؑ! آپ کیلئے بس یہی کافی ہے کہ اللہ آپ کے نفس سے آگاہ ہے۔ اور میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں آپ کے مقام و مرتبے سے آگاہ ہوں"۔ (القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۴۲۴)۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ معرفتِ علیؑ کو خود اللہ نے بھی اپنے اوپر لازم کیا ہوا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ ختمی مرتبتؐ بھی صرف علیؑ کے مقام و مرتبے ہی کی معرفت رکھتے تھے، علیؑ کے نفس کی نہیں کیونکہ علیؑ کے نفس کی معرفت صرف خداوندِ قدوس کیلئے ہی مخصوص ہے۔ یعنی علیؑ کیلئے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ اللہ اس کے نفس کی معرفت رکھتا ہے اور علیؑ کے سوا جو بھی ہے اس کیلئے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ وہ علیؑ کے مدارج و مراتب کی معرفت رکھتا ہو۔ شاہ عبدالحق محدّثِ دہلوی نے اپنی کتاب شواہدالنبوۃ میں لکھا ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی روایت کیا

ہے کہ فتحِ مکّہ کے موقعے پر جب جنابِ امیرؑالمومنین دوشِ مبارکہٴ پیغمبرؐ پر جلوہ افروز ہوئے اور بتوں کو توڑنے لگے تو رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''یا علیؑ! خوشا حالِ تو کہ کارِ حق می کنی و خوشا حالِ من کہ بارِ حق می کشم''۔ یعنی اے علیؑ! کیا اچھا حال ہے تیرا کہ تو حق کا کام کر رہا ہے اور کیا اچھا حال ہے میرا کہ میں حق کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ (کوکبِ دری صفحہ ۲۴۶)۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسولؐ اللہ کیلئے حق علیؑ کی ذات تھی اور علیؑ کیلئے حق وہ ذات تھی جس کا وہ مظہر ہے۔ اللہ نے بھی علیؑ کے ذکر کو اپنے ذکر سے ملا رکھا ہے اور ان دونوں کو جدا کرنا کسی کیلئے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ القطرۃ من بحار ج ۱ صفحہ ۲۷۸ پر خطبہٴ غدیر کے دوران رسولؐ اللہ کا ایک جملہ درج ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں۔ ''اے گروہِ قریش تمھارا اس وقت کیا حال ہوگا جب تم کافر ہو جاؤ گے اور مجھے ایک لشکر گاہ کے درمیان دیکھو گے کہ میں تمھارے چہروں پر مار رہا ہوں گا''۔ فوراً جبرئیل نازل ہوئے اور عرض کی۔ ''اے محمدؐ! کہو کہ اگر اللہ نے چاہا اور علیؑ نے چاہا''۔

یہاں ہر معصومؑ کا یہی رویّہ ہے، یہاں تک کہ وہ معظّمہ جس کے گرد عصمت گردش کرتی ہے، انؑ سے جنابِ امیرؑالمومنین اس طرح گفتگو فرماتے ہیں۔

القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۳۷۷۔

''ایک روز حضرتِ امیرؑالمومنین گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ جنابِ سیدہؑ وہاں

تشریف فرما ہیں اور آپؑ کے چہرۂ اقدس سے ساطع ہونے والے نور کی روشنی نے پورے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''اے بنتِ محمدؐ! آپؑ جب میرے گھر سے گئیں تو آپ کا چہرۂ اقدس ایسا نہ تھا؟'' ۔ بی بیؑ نے فرمایا۔ ''میرے باباؐ نے آپ کے کچھ فضائل مجھ سے بیان کئے جنہیں سن کر میں وہاں پر رک نہیں سکی۔ اس لئے آپ کے پاس چلی آئی ہوں''۔ مولاؑ نے فرمایا۔ ''اگر رسولؐ اللہ میرے تمام فضائل آپ کے سامنے بیان کر دیتے تو پھر آپ کس حال میں ہوتیں؟'' ۔

یہی وہ مرکز ہے جس کی طرف ہر شے کو پلٹنا ہے، یہی مرجعِ کائنات ہے جیسا کہ خود رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ ''یا علیؑ تجھے مجھ سے وہی منزلت ہے جو کعبے کو مجھ سے ہے''۔ (مناقبِ امیرؑالمومنین صفحہ ۲۴) ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کعبہ خود کسی کے پاس نہیں جاتا بلکہ ہر شخص خود چل کر کعبے کے پاس جاتا ہے۔ یہی وہ وحدتِ تامّہ ہے جس میں کسی کا شریک ہو جانا محالات سے ہے۔ دلیل کے طور پر ہم چند احادیث آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ نہج الاسرار جلد ۱ صفحہ ۱۵۵۔ امیرؑالمومنین نے فرمایا۔

''میں مجسم علمِ خدا ہوں۔ سوائے میرے کوئی اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور مجھے کوئی اس مرتبے سے ہٹا نہیں سکتا''۔

علم اللہ کی صفتِ ذات ہے لہٰذا اس کا منزلِ وحدانیت پر ہونا اور لاشریک ہونا لازم ہے۔

۲۔تفسیرِ نور الثقلین ج ۵ صفحہ ۲۹۸۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نظامِ کائنات میں ایک ہی تدبیر کارفرما ہے۔شمس وقمر اور لیل ونہار کا سلسلہ ایک ہی نظام سے مربوط ہے تو تدبیر کی وحدت اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کا مدبّر صرف ایک ہے۔اس کا کوئی شریک نہیں''۔اس سے قبل آپ یہ جان چکے ہیں کہ افعالِ خدا کا امین میرا مولاؑ ہے اور تدبیر بھی ایک فعل ہے لہٰذا جو بھی اس فعل کا فاعل ہوگا وہی لاشریک ہوگا۔اس میں کوئی شک وشبہ نہیں پیدا کیا جا سکتا۔

۳۔القطرۃ من بحارج ۳ صفحہ ۲۸۰۔جنابِ امیر المومنینؑ نے فرمایا۔

''روزِ قیامت لوگوں کو اعمال کی جزا دینے والا میں ہوں۔آغاز وانتہا کا برانگیختہ ہونے کا مالک میں ہوں۔کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو مجھ سے پنہاں اور مخفی ہو۔کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جو مجھ سے پہلے تھی اور میری دسترس سے باہر ہو۔جس بارے میں مجھ سے گواہی لی گئی اس میں کوئی بھی میرا شریک نہیں ہے۔وعدۂ خدا میرے ہاتھ پر انتہاء پذیر ہوگا۔وہ نعمت میں ہوں جو اللہ نے لوگوں کو عطا فرمائی اور وہ اسلام میں ہوں جو اللہ نے اپنے لئے منتخب کیا''۔

اس حدیثِ مبارکہ میں میرے مولاؑ نے ایک ایسی گواہی کا ذکر کیا ہے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔یہ اشارہ ہے سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت کی طرف جس میں ارشاد ہوا۔''**شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه**''۔یعنی اللہ نے گواہی دی کہ '' ۂ ''

کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس آیت میں دو فریق ہیں۔ایک شاہد ہےاور دوسرا مشہود ہے۔ ان کے درمیان تیسرا کوئی نہیں۔ اور بنظرِ غائر دیکھا جائے تو دو فریق بھی نہیں ہیں بلکہ ایک ہی وجود کے دو مختلف روپ ہیں۔ایک جو شاہد ہے یعنی اللہ، وہ ظاہر ہے اور دوسرا جو مشہود ہے یعنی ''ھُ''، وہ مخفی ہے۔ ظاہر کو گواہی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو ہر ایک کو نظر آتا ہے۔ گواہی کی ضرورت مخفی کو ہوا کرتی ہے کیونکہ وہ نظروں سے، بلکہ حواس تک سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس مخفی کو اگرچہ گواہی کی ضرورت ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ''صمد'' بھی ہے۔ اور صمد کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی طرف محتاج نہیں۔ جب وہ محتاج نہیں تو پھر وہ اس گواہی کی ضرورت کو کسطرح پورا کرے؟ تو وہ خود مسندِ ''ھُ'' سے فرشِ زمین پر آ گیا اور عالمِ بشریت میں ظاہر ہو کر اُس نے اپنے اُس مقام کی گواہی دی جو عقول و اوہام سے بھی ماوراء ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ گواہی اس کے علاوہ کوئی اور دے بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے اُس نے فرمایا۔ **''انا الشاھد و المشھود''** ۔میں ہی گواہی دینے والا ہوں اور میں ہی وہ ہوں جس کی گواہی دی گئی ہے۔ یعنی مدّعی بھی میں ہوں اور اپنے دعوے کا گواہ بھی میں خود ہوں مگر الگ الگ روپ میں، جو حقیقت میں ایک ہیں لیکن مرتبۂ اظہار میں آ کر ایک دوسرے کے غیر بن گئے لیکن دھوکا نہ کھانا کیونکہ میں ہی ظاہر ہوں اور میں ہی باطن ہوں۔ لیکن

حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ خود تو اسمِ ذات ہے لیکن اس کا اپنا اسم کوئی نہیں۔ مریم ۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے۔ **"هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا"** ۔یعنی کیا تمھارے علم میں **"ہ"** کا کوئی ہمنام بھی ہے؟۔ یہ استفہامِ انکاری ہے۔یعنی **"ہ"** کا کوئی اسم نہیں اور اسی کی توثیق میرے مولاؑ نے اسطرح کی ہے کہ "میں وہ ہوں جس پر نہ کسی اسم کا اطلاق ہوسکتا ہے نہ کسی صفت کا۔یعنی میرے ذریعے اللہ کا تعارف ہوتا ہے لیکن میرا تعارف کسی سے نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر کوئی میرا اسم بن جائے تو وہ اسمِ ذات میں شریک ہوجائے گا اور یہ ہونہیں سکتا کیونکہ اپنے معنی کی طرح یہ اسم بھی لاشریک ہے۔

کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ ذاتِ پاک جب عالمِ ظہور میں آئی تو معاذ اللہ وہ ناقص ہوگئی۔یعنی جب ان کا ظہور ہوا تو وہ بچّے کی صورت میں تھے، پھر بڑے ہوئے، پھر جوان ہوئے، پھر بوڑھے ہوئے، پھر شہید ہوکر آنکھوں سے اوجھل ہوگئے اور بظاہر یہ نقص لگتا ہے لیکن یہ یاد رکھیئے کہ ان کو قرآنِ پاک میں "چاند" کہا گیا ہے اور چاند کی صورت یہ ہے کہ پہلے وہ ہمیں باریک قوس کی شکل میں نظر آتا ہے، پھر کچھ موٹا ہوجاتا ہے، پھر کچھ اور موٹا ہوجاتا ہے اور پھر اپنی بھرپور شکل میں نظر آتا ہے۔ پھر چھوٹا ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ غائب ہوجاتا ہے۔لیکن ہر شخص اس بات سے واقف ہے کہ چاند میں کبھی کوئی نقص نہیں ہوتا بلکہ وہ مکمل ہے اور مکمل رہتا ہے۔ یہ نقص اہلِ زمین کا ہے کہ گردشِ زمین کی وجہ سے انہیں چاند بڑھتا گھٹتا اور غائب ہوتا نظر آتا ہے۔ پس

علیؑ کی بشریت سے کسی کو دھوکا نہ ہو بلکہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے حدودِ ادراک پر آنسو بہائے، نہ کہ اپنے نقص کو ان ؑ کا نقص سمجھ لے۔ علیؑ وہی ہے جس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے **"کُلَّ یومٍ ھُوَ فی شان"** یعنی میرا مولاؑ ہر روز ایک نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

اَحَد

میرے مولا امیرؑ المومنین نے فرمایا۔ "اہلِ آسمان میرا نام اَحَد لکھتے ہیں" (کوکبِ دری صفحہ ۳۳۹)۔ اور حضرتِ ختمی مرتبت کا ارشاد ہے کہ "علیؑ کی مثال لوگوں کے درمیان ایسی ہے جیسے قل ھواللہُ احد قرآن میں"۔ (کوکبِ دری صفحہ ۱۵۶)۔ بہت سے کوتاہ فہم یہ سوال کرتے ہیں کہ میرے مولاؑ کیونکر اَحَد ہو سکتے ہیں جبکہ اِس سورے میں تو یہ بھی ہے کہ "نہ وہ کسی سے پیدا ہوا نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا"، اور یہ بھی ہے کہ "اُس کا کُفو کوئی نہیں"۔ جبکہ میرے مولاؑ تو حضرتِ ابو طالبؑ کے بیٹے تھے، حسنینؑ شریفین کے باپ تھے اور جنابِ سیدہؑ کے کُفو تھے؟۔ ایسے ظاہر پرست اور مغز چھوڑ کر چھلکا کھانے والوں کی سمجھ میں یہ بات ہرگز نہیں آئے گی کہ یہ وہ ہستی ہے جو ستر ہزار حجابات سے گزر کر اس عالمِ بشریت میں آئی تھی۔ انؑ کے مقامات اتنے ہیں جو شمار میں نہیں آسکتے اور ہر مقام پر ان کی ایک نئی شان ہے۔ کسی مقام پر یہ عظیم ہوتے ہیں، کہیں اعظم ہوتے ہیں، کہیں **اعظم الاعظم** ہوتے ہیں، کہیں **اعظم**

الاعظم الاعظم ہوتے ہیں اوران تمام مقامات سے پرے وہ مقام آتا ہے جسے **"کُنتُ کنزاً مخفیّا"** کہتے ہیں۔سورۂ اخلاص نے اِس مقدس وجود کے اُسی مقام کو بیان کیا ہے جو مخفی اور مجرّد تھا، پھر اسے اظہار سے محبت ہوئی اور اس نے ایک نور کو خلق کیا اور خود بھی اس نورِ مخلوق میں آبیٹھا۔ پھر ایک حجاب سے دوسرے حجاب میں آتا رہا یہاں تک کہ حجابِ بشریت تک پہنچا اور چونکہ بشریت کا ایک نظام اُس نے خود بنایا تھا اس لئے اُس نظام کو توڑنا اس نے پسند نہ کیا اور یہاں ظاہر ہونے کیلئے اس نے حضرتِ ابوطالبؑ کو اپنے باپ، حسنینؑ کو اپنے بیٹوں اور جنابِ سیّدہؑ کو اپنے کفو کے طور پر خود منتخب کیا۔ اگر ہمارے بیان کی دلیل آپ ہم سے مانگتے ہیں تو سورۂ اخلاص خود ہماری بات پر دلیل ہے جہاں فرمایا گیا۔ **"لَم یَلِد ولَم یولَد ولَم یکُن لَهُ کُفُواً اَحَد"** ۔یہاں تینوں مقامات پر "نہیں" کیلئے لفظِ **"لَم"** استعمال کیا گیا ہے اور **"لَم"** جب "نہیں" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے۔ اس طرح اس آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "نہ تو وہ کسی سے پیدا ہوا تھا نہ کوئی اس سے پیدا ہوا تھا اور نہ کوئی اُس کا کفو تھا"۔ اِن آیات کا مفہوم علیؑ کی بشریت میں تلاش کرنا یا تو کج فہمی ہوسکتی ہے یا پھر بدنیتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآنِ مجید میں جہاں بھی لفظِ "اللہ" استعمال ہوا ہے تو اس کی کسی نہ کسی صفت کے حوالے سے استعمال ہوا ہے اور جب اسی صفت کو ائمہ طاہرینؑ اپنی طرف منسوب کرتے ہیں تو صاحبانِ عقل وفہم اصل معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

مثلاً سورۂ کہف ۵۱ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا''۔ ایک نابینا اور بے بصیرت انسان تو اسے توحید ہی سمجھے گا اور سر ہلا کر خوش ہو جائے گا۔لیکن جو شخص فہمِ دین اور شعورِ توحید رکھتا ہے وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے گا بلکہ اس اللہ کو تلاش کرے گا جو گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا۔نور الثقلین ج ۵ صفحہ ۲۴۳ پر اس آیت کے بارے میں مرقوم ہے کہ جنابِ امیر المومنین کو مشورہ دیا گیا کہ آپ فی الحال معاویہ کو شام کی حکومت پر باقی رکھیں۔ جب آپ کی حکومت مضبوط ہو جائے تو پھر اسے معزول کر دیں۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار نہیں بناتا''۔ لوگ تو ''میں'' سے مراد ذات کو لے رہے تھے مگر یہاں تو کوئی اور نکل آیا۔توحید کو ناقابلِ فہم بنانے اور اس کے خدوخال بگاڑنے کے معاملے میں سب سے بڑا مجرم مولوی ہے۔ بدقسمتی سے مذہبِ شیعہ ہمیشہ مولوی ہی کے ہاتھوں کا کھلونا بنا رہا ہے اور عام لوگ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' سمجھ کر ہر اُس بات کو مذہب سمجھ لیتے ہیں جو مولوی، دانستہ یا نادانستہ، اپنی زبان سے نکال دے۔ اسے چونکہ خود توحید کے بارے میں کچھ معلوم نہیں سوائے چند بھاری بھاری الفاظ کے، لہٰذا اُس نے توحید کی کچھ ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ہر آدمی توحید کو الفاظ کا کھیل سمجھنے لگا ہے کہ اگر یہ لفظ زبان سے نکل گیا تو ہاتھ سے توحید گئی۔اسی لئے ہم اکثر اپنے احباب سے کہتے ہیں کہ سننا اور چیز ہے اور سمجھنا دوسری چیز ہے اور اصل چیز سمجھنا

ہی ہے۔ جس شخص کا مشغلہ صرف سننا ہو، چاہے کتاب سے سنے یا کسی خطیب سے، تو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے گھر میں بجلی کے تاروں کا جال بچھا لے۔ سارے کمروں میں برقی قمقمے لگا لے اور پورے گھر کو ٹی وی، ریفریجریٹر اور دیگر برقی سامان سے مزیّن کر لے لیکن اُس تار سے رابطہ قائم نہ کرے جس سے بجلی آتی ہے، تو یہ سب کچھ کر لینے کے باوجود بھی اس کے گھر میں اندھیرا ہی رہے گا۔ توحید تو ایک خالص عقلی مسئلہ ہے جسمیں انتہائی غور فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سر جھکا کر مان لینے والی چیز نہیں ہے۔ یہ اس جہالت ہی کا نتیجہ ہے کہ نادان لوگ بات بات پر کہتے ہیں کہ "آپ نے تو علیؑ کو خدا بنا دیا" معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا خدا اتنا بے بس ہے کہ جس کا جی چاہتا ہے وہ اس کی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے اور یہ بے چارے اپنے خدا کی حفاظت کرتے کرتے ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ قرآن میں لفظِ اللہ ہر مقام پر کسی نہ کسی صفت یا فعل کے ساتھ استعمال ہوا ہے لہٰذا <u>اصحابِ عقل کا یہ فریضہ ہے کہ لفظِ "اللہ" میں سر نہ کھپائیں بلکہ اُن صفات و افعال میں تفکر کریں جن کو اللہ منوانا چاہ رہا ہے اور پھر تلاش کریں کہ وہ صفات و افعال کس سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی کا نام توحید ہے۔</u> ہم صرف اس اللہ کو مانتے ہیں جسے اس کی صفات و افعال نے سجدے کئے ہیں۔ سورۂ اخلاص میں بھی اللہ کی صفات ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ وہ نہیں ہے جو "**لم یلد و لم یولد ولم یکن لہ**

کفواً احد" ہے۔ بلکہ اللہ وہ ہے کہ جس کی بارگاہ میں "**لم یلد و لم یولد ولم یکن لهٗ کفواً احد**" سجدے کرتا ہے۔ ہم اسی مسجود کو معبودِ حقیقی مانتے ہیں۔ مولوی کے خدا کو ہم نہیں مانتے کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ مولوی کا خدا تو پیسہ ہے۔

قرآن میں ہے کہ اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا اور معصومینؑ نے بھی یہی فرمایا۔ تو کیا اس سے ہم یہ سمجھ لیں کہ اللہ بولتا ہے اور آوازیں نکالتا ہے؟۔ عیونِ اخبار الرضاؑ ج ا صفحہ ۳۴۹ پر امام رضاؑ فرماتے ہیں۔ "اللہ نے موسیٰ سے گفتگو کی جسے ان تمام افراد نے (جو موسیٰ کے ساتھ گئے تھے) اوپر، نیچے، دائیں اور بائیں سے سنا"۔ اب کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ (معاذ اللہ) پروردگارِ عالم نے وہاں کوئی آڈیو سسٹم لگا رکھا تھا اور پیچھے ایک مائیکروفون رکھا ہوا تھا جس پر وہ بذاتِ خود بول رہا تھا؟۔ اِن خرافات میں وقت برباد کرنے کے بجائے ہمارا فرض ہے کہ اللہ کی زبان کو تلاش کریں کیونکہ جو کچھ وہ بولے گی اسی کے بارے میں کہا جائے گا کہ "اللہ نے کہا"۔

اللہ کا کام

ہم یہی عرض کر رہے ہیں کہ ہمارا کام بس اتنا ہے کہ صفات و افعالِ خدا کی حتی المقدور معرفت حاصل کر لیں۔ ہماری توحید فقط یہی ہے اور ہماری تو حیثیت ہی کیا ہے، اللہ نے تو اپنے نبیؐ کی بھی تکلیف یہی قرار دی تھی کہ وہ اللہ کی صفت کی معرفت حاصل

کریں اور لوگوں سے اس کا تعارف کرائیں۔ چنانچہ تفسیرِ نور الثقلین ج ۵ صفحہ ۱۳۱ پر روایت ہے کہ کسی نے امام زین العابدینؑ سے پوچھا کہ اللہ نے اپنی نبیؐ کو آسمانوں کی معراج کیوں کرائی تھی؟۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''اللہ نے انہیں آسمان کی بادشاہت اور اپنی صفت کے عجائبات دکھانے کیلئے آسمانوں کی سیر کرائی تھی''۔ اسی کتاب کے صفحہ ۱۳۲ پر امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں۔ ''اللہ کی مشیت یہ تھی کہ میرا عبد جب زمین پر لوٹ کر جائے تو مخلوقات کو میری عظمت کے عجائب کی خبر دے''۔ اب یہ سوال کہ اللہ کی وہ کون سی صفت تھی جس کے عجائبات دکھانے کیلئے اس نے اپنے نبیؐ کو معراج کرائی تو اس کو سمجھنے کیلئے صرف ایک جملہ کافی ہے اور وہ ہے۔ **''نادِ علیاً مظهر العجائب''**۔

مقصد و غایتِ معراج یہی تھا کہ اللہ اپنے نبیؐ پر اپنی اُس صفت کی فضیلت ظاہر فرمائے جس کا نام ''عظمتِ خدا'' تھا۔ وہ جو علیِ عظیم تھا وہی مطلوب و مقصودِ معراجِ رسولؐ تھا۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۵ صفحہ ۱۶۸ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''جب آنحضرتؐ کو معراج ہوئی تو انہیں وحی میں علیؑ کی عظمت و شرف کے متعلق خبر دی گئی۔ جب آپؐ بیت المعمور پر پہنچے اور انبیاءؑ کو نماز پڑھائی تو آپؐ کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیا یہ فضیلت کچھ زیادہ تو نہیں ہے؟۔ اس وقت وحی نازل ہوئی۔ ''اگر آپؐ کو ہماری نازل کردہ وحی (یعنی فضائلِ علیؑ) میں کوئی شک ہے تو آپؐ اُن سے پوچھیں جو آپؐ سے پہلے کتابیں پڑھتے تھے۔ آپؐ کے رب کی طرف سے آپؐ کے پاس حق ہی آیا ہے۔

پس شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ بننا"۔(یونس۹۴)۔امام جعفر صادقؑ مزید فرماتے ہیں۔"مقصد یہ ہے کہ آپؐ انبیاءِ صادقین سے بھی یہ بات دریافت کر سکتے ہیں کہ ہم نے ان کتابوں میں بھی علیؑ کی فضیلت ہی نازل کی تھی"۔

ہم تو اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے نبیؐ کی جوتیوں کے صدقے میں ہمیں بھی اُس معرفتِ علیؑ میں سے تھوڑا سا حصہ عطا فرمادے جس کو اس نے اپنے نبیؐ کی معراج کا واحد مقصد قرار دیا تھا۔اور جب خود نبیؐ نے فرمایا کہ "**الصلوٰۃُ معراج المومن**" تو ہم فوراً سمجھ گئے کہ نماز سوائے معرفتِ علیؑ کے اور کچھ بھی نہیں۔

یہاں ہمارا مقصد افعالِ خدا کی تفصیل بیان کرنا نہیں ہے کیونکہ اس کیلئے تو ایک پورا دفتر چاہیئے۔ہم اس مقام پر اللہ کا صرف ایک کام بیان کریں گے، وہ کام جو معصومؑ نے خود کر کے دکھایا۔وہ کام کیا تھا، یہ ہم آپ کو امام جعفر صادقؑ کی زبانِ مبارک سے سناتے ہیں۔

تفسیر نور الثقلین ج ا صفحہ ۲۱۸۔

امام جعفر صادقؑ سے کسی نے پوچھا کہ کیا جادوگر اپنے جادو سے کسی انسان کو کتا یا گدھا وغیرہ بنا سکتا ہے؟۔امامؑ نے فرمایا۔"وہ اس سے کہیں عاجز ہے کہ وہ اللہ کی عطا کردہ شکل وصورت میں تبدیلی پیدا کر سکے۔اور جو خدا کی دی ہوئی شکل وصورت میں تبدیلی کر سکتا ہو تو وہ خدا کا شریک بن جائے گا"۔

خطِ کشیدہ میں لکھے گئے امامؑ کے جملے کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھیئے گا تا کہ ہمیں اپنی بات آپ تک پہنچانے میں دشواری نہ ہو۔ اور اب ہم القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۶ تا ۳۰ سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اللہ کا کام کسے کہتے ہیں۔ امام زین العابدین کی یہ گفتگو حضرت جابرؒ بن یزید جعفیؒ سے ہے۔

صفحہ ۲۶ پر امامؑ فرماتے ہیں۔ ''جان لو کہ ہم تمھارے درمیان توحید کے مظاہر اور معانی ہیں۔ اللہ نے ہمیں اپنی ذات کے نور سے پیدا کیا اور لوگوں کے معاملات ہمارے سپرد کر دیئے اور ہم اس کی (دی ہوئی) اجازت اور فرمان سے جو چاہیں انجام دیتے ہیں۔ اگر کوئی ہمارے فضائل یا ہماری بات کا انکار کرے تو درحقیقت اس نے اللہ اور اللہ کی آیات اور اس کے انبیاءؑ اور رسولوں کا انکار کیا''۔

اس فرمان سے چند امور ثابت ہوتے ہیں:۔

۱۔ ائمہؑ طاہرین توحید کے مظہر بھی ہیں اور توحید کے معنی بھی ہیں۔ یعنی اصلِ توحید یہی ہیں۔

۲۔ اللہ نے لوگوں کے تمام معاملات انؑ کے سپرد کر دئے ہیں جن میں پیدا کرنا، مارنا، رزق دینا، اولاد دینا، صحت دینا، ایمان دینا، معرفت دینا، غرض ہر شے شامل ہے اور جب خود اللہ نے تمام معاملات انؑ کو سپرد کر دئے ہیں تو بندوں کا فرض بھی یہی ہے کہ ہر چیز انہی سے مانگیں اور اگر کوئی انؑ کو نظر انداز کر کے براہِ راست اللہ سے مانگے گا تو

یہی اصلِ شرک ہوگا کہ اس نے امرِ خدا میں اپنی خواہشِ نفس کو شریک کرلیا۔

۳۔ وہ تمام افعال جن کی نسبت اللہ نے اپنی طرف دی ہے وہ انہی مقدس ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں اور انہی کی مشیت کے تحت ہوتے ہیں۔

۴۔ جو شخص انؑ کے فضائل یا انؑ کی بات سے انکار کرے وہی حقیقی کافر ہے کیونکہ ایمان کیلئے جو جو چیزیں ضروری ہوتی ہیں اس نے اُن تمام چیزوں کا انکار کردیا۔

جابرؓ نے عرض کیا۔ "اے میرے مولاؑ! آپؑ پر اللہ کی رحمت ہو، اس بناء پر تو اکثر شیعہ مقصر ہیں۔ میں اپنے دوستوں میں سے کسی کو بھی اس صفت کے ساتھ نہیں جانتا جو آپؑ نے بیان فرمائی ہے"۔ (صفحہ ۲۸)

پھر جابرؓ نے چند لوگوں کا ذکر کیا جو ان کے گمان کے مطابق مومنِ کامل تھے۔ امامؑ نے فرمایا۔ "کل ان کی دعوت کرو اور اپنے ہمراہ لے آؤ"۔ دوسرے دن جب وہ لوگ امامؑ کی خدمت میں آئے امامؑ نے فرمایا۔ "اے جابر! یہ تیرے بھائی ہیں لیکن ابھی کامل ہونے میں کچھ کمی باقی ہے"۔ پھر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ "کیا تم اعتراف کرتے ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جو چاہے انجام دے سکتا ہے اور جو چاہے حکم دے سکتا ہے؟" انہوں نے عرض کیا کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ تب آپؑ نے پوچھا۔ "کیا علیؑ ابن الحسینؑ اپنے بیٹے محمد باقرؑ کی صورت میں تبدیل ہو سکتے ہیں؟"۔ وہ لوگ خاموش رہے۔ آپؑ نے پھر سوال کیا۔ "کیا محمد باقرؑ علیؑ ابنِ الحسینؑ کی شکل میں

تبدیل ہوسکتے ہیں؟"۔ وہ لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور بولے۔ "یا ابن رسولؐ اللہ! ہم نہیں جانتے، آپ ہمیں سکھایئے۔ (صفحہ ۲۹)۔ امام زین العابدینؑ نے اپنے بیٹے امام محمد باقرؑ کی طرف دیکھا اور ان لوگوں سے فرمایا۔ "یہ کون ہے؟"۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپؑ کا بیٹا۔ حضرتؑ نے فرمایا۔ "میں کون ہوں؟"۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ علیؑ ابن الحسینؑ، ان کے والد ہیں"۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ ان سوالات و جوابات کے بعد امامؑ نے چند کلمات کہے جن کو ہم سمجھ نہ سکے۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ محمدؐ باقرؑ اپنے والد علیؑ ابن الحسینؑ کی صورت میں اور امام زین العابدینؑ اپنے بیٹے محمد باقرؑ کی صورت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں نے جب یہ دیکھا تو تعجب سے کہنے لگے۔ **"لا الٰہ الّا اللہ"**۔

امامؑ نے فرمایا۔ "اللہ کی قدرت سے تعجب نہ کرو۔ میں محمدؐ ہوں اور محمدؐ میں ہیں"۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "اے قوم! اللہ کے کام سے تعجب نہ کرو۔ میں علیؑ ہوں اور علیؑ میں ہیں"۔ جابر کہتے ہیں کہ جب انہوں نے امامؑ کی زبانِ مبارک سے یہ کلمات سنے تو سب سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کی ولایت اور آپ کے پوشیدہ فضائل پر ایمان لائے اور آپ کی خصوصیات کا اقرار کرتے ہیں۔

اس مقام پر ہم ایک بار پھر آپ کو امام جعفر صادقؑ کا وہ فرمان یاد دلاتے ہیں جسمیں آپؑ نے فرمایا تھا۔ "جو خدا کی دی ہوئی شکل وصورت میں تبدیلی کرسکتا ہو تو وہ خدا کا

شریک بن جائے گا''۔اب آپ کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔ یا تو یہ مانئے کہ اللہ کی دی ہوئی شکل وصورت میں تبدیلی کر کے امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقرؑ (معاذ اللہ) اللہ کے شریک بن گئے۔ یا پھر قہراً یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ کا کام وہی ہے جو یہ سرانجام دیتے ہیں۔اللہ کے کام کا اس کے علاوہ کوئی تصور نہیں ہے اور دونوں ائمہؑ نے اسی بات کو ثابت کرنے کیلئے اس کا عملی مظاہرہ فرمایا۔ قدرت انہوں نے اپنی استعمال کی لیکن فرمایا کہ ''اللہ کی قدرت سے تعجب نہ کرو''۔ کام خود انہوں نے کیا لیکن فرمایا۔ ''اللہ کے کام سے تعجب نہ کرو''۔پس ہم ایک بار پھر اپنے قارئین کی خدمت میں دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ خدا کیلئے ذات کے بارے میں سوچنا اور کلام کرنا چھوڑیئے ورنہ شرک کے دلدل میں پھنسنا اس کا منطقی اور لازمی نتیجہ ہوگا۔ ذات کا وجود اگر ثابت ہو سکتا ہے تو صرف اور صرف ان مقدس ہستیوں کی صفات وافعال سے۔ ہم پھر یہ بات زور دے کر کہتے ہیں کہ ذات تمھاری توحید نہیں ہے، تمھاری توحید یہ مقدس وجود ہیں کیونکہ یہی توحید کے ظاہر اور اس کے معنی ہیں۔ جو لوگ سامنے بیٹھے تھے وہ عقلمند لوگ تھے۔ ورنہ پھر ہمیں بتائیں کہ ائمہؑ کے چہرے تبدیل ہونے پر انہوں نے **''لا الٰہ الّا اللہ''** کیوں کہا؟۔اور ان کی بات سن کر وہ سجدے میں کیوں گرے؟۔ بات صرف اتنی تھی کہ انہوں نے توحید کی حقیقت کو سمجھ لیا تھا۔ ہماری زندگی کا بہترین لمحہ بھی وہ ہوگا جب ہماری محنت رنگ

لائے گی اور کوئی ایک بندہ ہی کھڑے ہو کر کہے گا "ہاں! میں نے حقیقتِ توحید کو پالیا"۔

شہادتِ ولایتِ علیؑ

ولایت کے بیان کو مکمل کرنے کیلئے اب ہم اُس عظیم الشان موضوع کیطرف توجہ کرتے ہیں جس پر ہماری دنیا و آخرت کا مکمل دار و مدار ہے۔ یہ وہ شہادت ہے جو گھروں کے اندر کی باتیں بتاتی ہے اور تنہائیوں کی خبر دیتی ہے کیونکہ انساب اس وقت تک معتبر نہیں ہوتے جب تک یہ شہادت دل سے نکل کر ہونٹوں کی زینت نہ بن جائے۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ لوگ اس مقدس شہادت پر زبانِ اعتراض دراز کرتے ہیں جنہیں اپنے دائیں بائیں کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ انہیں یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ شہادت کہتے کس کو ہیں اور گواہی دینے کیلئے کیا کیا چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ اگر ان کو یہ بات معلوم ہوتی تو یہ ہرگز نہ کہتے کہ "ہم ولایتِ علیؑ کا عقیدہ ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن گواہی نہیں دیتے"۔ یہ ایک انتہائی احمقانہ بات ہے جس نے جہالت، منافقت اور علیؑ کی دشمنی سے جنم لیا ہے۔ انہیں یہ بات معلوم ہونا چاہیئے کہ انہیں **"لا الٰہ الّا اللہ"** اور **"محمدؐ الرسول اللہ"** کی گواہی دینے کا حق اس وقت تک پہنچتا ہی نہیں جب تک وہ **"علیٌ ولی اللہ"** کی گواہی نہ دے دیں کیونکہ اصل گواہی

یہی ہے اور اس بات کو انشا ءاللہ ہم ثابت کریں گے۔

شہادت کیا ہوتی ہے

شہادت کے لفظی معنی گواہی ہے اور کورٹ کچہری میں دی جانے والی گواہی بھی شہادت ہی کہلاتی ہے۔لیکن جب یہ لفظ اصطلاحِ دینی کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس سے ایک خاص معنی مراد ہوتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل چیز عقیدہ ہی ہوتا ہے جو مذہب کو تشکیل دیتا ہے لیکن یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ عقیدہ کوئی ٹھہری ہوئی چیز نہیں ہے بلکہ یہ متحرک ہوتا ہے اور بلحاظِ ضرورت ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتا رہتا ہے۔عقیدے کی مثال خون کیطرح ہوتی ہے جو اگر حرکت نہ کرے تو جسم مردہ ہوجاتا ہے۔جسم کے اکثر حصوں میں اس کی حرکت محسوس نہیں ہوتی لیکن جب یہ مقامِ نبض پر پہنچتا ہے تو ہلکی ہلکی آواز دینے لگتا ہے۔اگر اس مقام پر یہ آواز نہ دے تو یہ خطرے کی علامت ہے۔جب یہ دل کے مقام پر پہنچتا ہے تو اس کی آواز بلند ہوجاتی ہے۔اگر یہ اس مقام پر آواز نہ دے تو یہ موت کی علامت ہے۔عقیدے کے بھی تین مقامات ہیں۔مقامِ اخفاء، مقامِ اظہار اور مقامِ اعلان۔ مقامِ اخفاء بمنزلۂ جسم ہے۔ مقامِ اظہار بمنزلۂ نبض ہے اور مقامِ اعلان بمنزلۂ قلب ہے۔اس طرح عقیدے کا اہم ترین مقام، مقامِ اعلان ہے اور اگر اس مقام پر عقیدہ مفقود ہو تو یہ دینی موت کی علامت ہے۔

عقیدہ جب پوشیدہ ہو یعنی مقامِ اخفاء پر ہو تو یہ ایمانِ باطنی کہلاتا ہے اور اس کا تعلق انسان کی اپنی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ جب یہ مقامِ اظہار پر آتا ہے تو کلمہ کہلاتا ہے اور اپنی ذات سے نکل کر چند لوگوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اور جب یہ مقامِ اعلان پر آتا ہے تو شہادت کہلاتا ہے اور عام ہو جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ جانچا جاتا ہے کہ انسان دینی اعتبار سے زندہ ہے یا مر چکا ہے؟۔ آپ نے یقیناً یہ بات محسوس کر لی ہوگی کہ مختلف مقامات پر صورتیں بے شک مختلف ہوں لیکن ہوتا وہ عقیدہ ہی ہے یعنی مقامِ اظہار تک اور اس سے بڑھکر مقامِ اعلان تک جو چیز آئے گی وہ وہی ہوگی جو دل میں تھی۔ وہ کوئی مختلف چیز نہیں ہوگی، یعنی حقیقت اور متن ایک ہوگا اگر چہ شکلیں مختلف ہوں گی۔ عقیدہ جب دل میں ہوگا تو زبان و بیان سے ماوراء ہوگا، اظہار میں آئے گا تو **"لا الٰہ الّا اللہ، محمدٌ الرسول اللہ، علیٌ ولی اللہ"** بن جائے گا اور اعلان میں آئے گا تو **"اَشھدُ"** بن جائے گا۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ میں ولایتِ علیؑ کا عقیدہ تو رکھتا ہوں مگر گواہی نہیں دیتا تو اس سے بڑا احمق، جاہل اور جھوٹا کوئی نہیں۔

ضروریاتِ شہادت

گواہی کیلئے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں، مشاہدہ اور علم۔ اگر یہ دو چیزیں نہ ہوں تو انسان گواہی دینے کا اہل ہی نہیں بنتا۔ اب تمام گواہی دینے والوں سے یہ سوال ہے

کہ آپ شہادتِ توحید دیتے ہیں تو کیا آپ نے اللہ کو دیکھا ہے؟۔ آپ شہادتِ رسالت دیتے ہیں تو کیا آپ نے ان کو نبی بنتے دیکھا ہے؟۔ تو وہ جواب دیں گے کہ نہیں! ہم نے نہ اللہ کو دیکھا نہ رسولؐ اللہ کو نبی بنتے دیکھا لیکن ہم یہ دونوں گواہیاں اپنے علم کی بنیاد پر دیتے ہیں۔ اب ان سے پوچھا جائے کہ آپ کو ان دونوں کے بارے میں کس نے بتایا؟۔ تو جو آئیں بائیں شائیں جواب وہ دیں گے اس کا ذکر ہم نہیں کریں گے کیونکہ پھر بات طول پکڑ جائے گی۔ لیکن ہم اہلِ ولایہ سے اگر کوئی پوچھے کہ آپ جو ولایتِ علیؑ کی گواہی دیتے ہیں تو کیا آپ نے علیؑ کو دیکھا ہے؟۔ تو ہم جواب دیں گے کہ ہاں! ہم نے علیؑ کو مسندِ ولایت پر جلوہ فرما دیکھا ہے اور انہوں نے ہی ہمیں بتایا ہے کہ اللہ تمھارا معبود اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس طرح ہم علیؑ کی ولایت کی گواہی اپنے مشاہدے کی بنیاد پر دیتے ہیں اور توحید و نبوت کی گواہی اپنے علم کی بنیاد پر، اور یہ علم بھی علیؑ ہی کا دیا ہوا ہے۔

الحمد اللہِ الّذی ھدانالِھٰذا۔

عہد

مذہبِ شیعہ کی معتبر ترین کتابوں میں ایک عہد و پیمان کا ذکر کیا گیا ہے اور قرآن نے اس کی توثیق کی ہے اس لئے ہم حوالے دے کر اپنا اور دوسروں کا وقت برباد نہیں کریں گے۔ یومِ الست اللہ نے ذریّتِ آدمؑ سے نکلنے والے تمام انسانوں کو جمع کیا اور فرمایا۔

"اَلستُ بربکم"۔ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟۔تو سب نے کہا کہ ہاں تو ہی ہمارا رب ہے۔ پھر پوچھا گیا کہ "کیا محمدؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟"۔اس مرتبہ "ہاں" کہنے والوں کی تعداد کچھ کم ہوگئی۔ پھر پوچھا گیا کہ "کیا علیؑ امیر المومنین نہیں ہیں؟"۔ تو اس مرتبہ "ہاں" کہنے والوں کی تعداد بہت ہی قلیل رہ گئی جن کے بارے میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "خدا کی قسم ہمارے شیعوں کے علاوہ اِس عہدِ ولایت کو کسی نے پورا نہیں کیا اور یہ عہد و میثاق ہمارے شیعوں کے علاوہ کسی کو یاد نہیں"۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۴۹۴)۔ یہ ایک کلمۂ شہادات تھا جو ہمیں تعلیم دیا گیا۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۴۹۱ پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ "یا علیؑ! تو وہ ہے کہ اللہ نے ابتدائے تخلیق کے وقت تیرے ذریعے حجت قائم کی تھی۔ اللہ نے اپنی مخلوق سے کہا تھا۔ "کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟"۔ مخلوق نے جواب میں کہا تھا کیوں نہیں! تو ہی ہمارا رب ہے"۔ پھر اللہ نے فرمایا۔ "کیا محمدؐ میرے رسول نہیں؟"۔ مخلوق نے کہا کیوں نہیں! وہ تیرے رسول ہیں۔ پھر اللہ نے کہا۔ "کیا علیؑ امیر المومنین نہیں ہیں؟"۔ اس کے جواب میں چند افراد کے علاوہ باقی مخلوق نے سرکشی کی رَوِش اپنائی اور تیرا اقرار کرنے والے انتہائی کم لوگ تھے اور وہی اصحاب الیمین ہیں"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اللہ کون تھا جس نے یہ تعلیم دی تھی؟۔ شیعہ عقیدے کے مطابق اللہ بالذات نا قابلِ رویت ہے اور کسی حال میں نظر نہیں آ سکتا۔ پس اگر یہ **"الستُ بربکم"** کہنے والا نظر نہیں آیا تھا تو ممکن ہے کہ وہ اللہ ہو، اگر چہ قول اور آواز بھی اِس امکان کو مانع ہے۔ لیکن ہم خود کو

صرف نگاہ تک محدود رکھتے ہیں۔ اور یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر وہ نظر آیا تھا تو یقیناً وہ اللہ نہیں تھا بلکہ کوئی اور تھا۔ اور یہ معلوم کرنے کیلئے ہم رجوع کرتے ہیں تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۴۹۰ کی طرف جہاں منقول ہے کہ "ایک شخص نے میثاقِ الست کی آیت پڑھکر امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا۔ "کیا یہ سب کچھ بہ چشم دید ہوا تھا؟" ۔آپؑ نے فرمایا۔ "ہاں! اور اسی سے معرفت کا اثبات ہوا تھا"۔ پس ہم نے اچھی طرح جان لیا کہ جس نے **"الستُ بربکم"** کہا تھا اور ہمیں ایک مکمل کلمۂ شہادت تعلیم دیا تھا وہ اللہ ہرگز نہیں تھا۔ تو پھر وہ کون تھا؟۔ بقرہ ۱۳۸۔ "رنگ تو اللہ کا ہے اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہوسکتا ہے"۔ اس کی تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "اس آیت میں اللہ کے رنگ سے مراد عالمِ میثاق میں علیؑ ہیں"۔ (تفسیرِ فرات)۔ اور حضرتِ امیرؑ المومنین نہج الاسرار ج ۱ صفحہ ۱۲۸ پر فرماتے ہیں۔ "میں نے ہی قیومِ لایزال کے حکم سے ان کیلئے **الستُ بربکم** کی ندا دی تھی"۔ معلوم ہوگیا کہ جس نے ہم سے عہد و میثاق لیا تھا اور جس نے ہم کو کلمۂ شہادات تعلیم دیا تھا وہ ہمارا اور کائنات کا مولا علیؑ ابنِ ابی طالبؑ تھا۔ اُسی کو ہم نے دیکھا اور اسی کو ہم نے جواب دیا اور اُسی نے ہم کو تعلیم دی۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ ہم نے ولایتِ علیؑ کی گواہی علیؑ کو دیکھ کر دی ہے اور توحید و رسالت کی گواہی علیؑ کے حکم سے دی ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ اصلِ شہادت ولایت کی شہادت ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد مشاہدہ ہے، یہ نہ ہوتو باقی دونوں شہادتیں دی ہی نہیں جاسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہنشاہِؑ ولایت نے فرمایا

ہے کہ ''میری ولایت کے بغیر نہ توحید تمھارے کسی کام آئے گی نہ نبوت، ہمیں یہ بھی پتہ چل گیا کہ شیعہ صرف وہی ہیں جنہیں یہ عہد یاد ہے اور جو اس عہد پر قائم ہیں۔ جنہیں یہ عہد یاد ہی نہیں اور وہ برملا ولایتِ علیؑ کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں، وہ لاکھ خود کو شیعہ کہیں لیکن معصومؑ نے غیر مبہم طور پر یہ فرما دیا ہے کہ وہ ہرگز ہرگز شیعہ نہیں ہیں بلکہ وہ شیعوں سے مشابہ ایک قوم ہیں جو شیعوں کی طرح نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، عزاداری کرتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں لیکن انہیں ایمان مستعار دیا گیا ہے اور جب یہ اس دنیا سے جائیں گے تو یہ ایمان ان سے واپس لے لیا جائے گا لہٰذا ایسے لوگوں سے الجھنا، بحث و مباحثہ کرنا اور جھگڑا کرنا بیکار ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے جیسے کہ اللہ نے انہیں چھوڑا ہوا ہے۔ جب ہمارے امامؑ ظہور فرمائیں گے اس وقت ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں بھی طمع پیدا ہو لیکن وقت ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہو گا جیسا کہ مولا امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''اُس مخصوص دن (یعنی یومِ ظہور) اُس شخص کو ایمان لانے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا جو میثاق میں ایمان نہ لایا ہوگا اور جس نے انبیاءؑ، اوصیاءؑ، اور بالخصوص امیرالمومنینؑ کی ولایت کا اقرار نہ کیا ہوگا''۔ (تفسیر نورالثقلین ج ۳ صفحہ ۳۱۲)۔ اور اسی کتاب کے صفحہ ۱۵۴ پر سورۂ اعراف کی آیت ۱۰۱ ''وہ جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے ہیں، وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے'' کی تفسیر میں امام محمدؑ باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''عالمِ ذر میں جن لوگوں نے ہماری ولایت کا انکار کیا تھا وہ اس دنیا میں بھی انکار ہی کریں گے''۔ اسی لئے ہم نے عرض کیا

کہ ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ لوگ مطعون ہیں۔ انہیں تو اللہ نے قرآن میں طعنہ دیا ہے، ان سے ہمارا کیا واسطہ۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۰۲ "ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد کا پاس نہیں پایا بلکہ ہم نے ان کی اکثریت کو فاسق ہی پایا" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام جعفر صادقؑ نے ابوبصیرؒ سے فرمایا۔ "اللہ نے تم سے ہماری ولایت کا جو اقرار لیا تھا، تم نے اسے پورا کیا۔ اگر تم اپنے عہد کا پاس نہ کرتے تو اللہ تمھیں بھی اسی طرح سے طعنہ دیتا جیسا کہ اس نے اکثریت کو طعنہ دیا ہے"۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۴۱۶)۔

یہ تو تھی ہم جیسے گنہگاروں کی بات۔ اب ہم اس سے آگے بڑھ کر یہ دیکھتے ہیں کہ ولایتِ علیؑ کے سلسلے میں انبیاءؑ و اوصیاءؑ و اولیاءؑ کا کیا حال ہے اور کیا اللہ نے اس معاملے میں انہیں کوئی رعایت دی ہے؟۔

۱۔ القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۰۹۔ امام حسن عسکریؑ نے فرمایا۔

"موسیٰ کلیم اللہ نے ہمارے عہد و پیمان کے ساتھ وفاداری کرنے کی وجہ سے خلعتِ اصطفٰی پہنی اور روح القدس نے بہشتِ بریں میں ہمارے باغ کے تازہ رس میووں سے چکھا ہے"۔

۲۔ آپ یقیناً انبیاءؑ کی طبقہ بندی سے واقف ہوں گے اور "انبیاءِ اولوالعزم" کا لفظ آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ مولوی اس لفظ کی خدا جانے کیا تعبیر کرتا ہے لیکن یہاں ہم معانی الاخبار صفحہ ۹۰ کی پہلی حدیث پیش کرتے ہیں جسمیں معصومؑ نے اس لفظ کے معنی

بتائے ہیں۔آپؑ فرماتے ہیں۔''نوحؑ ،ابراہیمؑ ،موسیٰؑ ،عیسیٰؑ اور محمدؐ کا نام اولی العزم رکھا گیا۔یعنی یہ لوگ محمدؐ اور ائمہؑ کے سلسلے میں ان سے لئے گئے عہد پر اقرار کے ساتھ عزم رکھنے والے تھے''۔

۳۔سورۂ احزاب ۷،۸''اور (اے رسولؐ) اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے انبیاءؑ سے، اور تجھ سے،اور نوحؑ سے اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ ابنِ مریم سے ان کا عہد لیا۔اور ہم نے ان سے بڑا پکا عہد لیا تا کہ وہ سچوں سے ان کی سچائی کے بارے میں سوال کرے اور اس نے کافروں کیلئے دردناک عذاب تیار کیا ہوا ہے''۔اس آیت کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔''اللہ نے انبیاءؑ سے ولایتِ علیؑ کا میثاق لیا تھا''۔

ہم نے میثاقِ ولایت کے متعلق ضروری معلومات انتہائی اختصار کے ساتھ آپ تک پہنچائیں۔حیرت ہوتی ہے اُن دیدہ دلیروں پر جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ولایتِ علیؑ سے (معاذ اللہ) کلمہ،اذان،اقامت اور نماز باطل ہو جاتی ہے۔لیکن یہی لوگ جب حج پر جاتے ہیں اور حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں تو کہتے ہیں۔''(اے حجرِ اسود!) میں نے اپنی امانت ادا کر دی ہے اور میں نے اپنا میثاق پورا کر دیا ہے اور تو میری وعدہ وفائی کی گواہی دینا''۔یہ سارا فساد ملّا پرستی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ اس مقام پر اُن ''پتھروں کے ڈھیروں'' کی ایک ہلکی سی جھلک آپ کو دکھائیں جنہیں لوگ ''علم کا پہاڑ'' کہتے ہیں تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ یہ بیماری کہاں سے شروع ہوئی۔ایک کتاب ہے جس کا نام ''انوارِ قرآنی'' ہے۔اس کے مؤلف کا نام

ہے''(بزعمِ خود آیت اللہ) محمد ہادی معرفت''۔اس میں میثاقِ یوم الست کے بارے میں چار بڑوں کے عقائد بیان کئے گئے ہیں اور پانچویں خود مؤلف ہیں جو انہی کے ہم خیال ہیں۔ یہ انکشافات تمام مومنین کی آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہیں۔

سیدمرتضٰی علم الھدیٰ

صفحہ۱۹۲پر بحوالہ امالی سیدمرتضٰی ج ۱صفحہ ۲۸ یہ عبارت درج کی گئی ہے۔

''بعض وہ لوگ جو بصارت اور ذکاوت اور ذوقِ سلیم نہیں رکھتے، وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے ذرّیتِ آدمؑ کو ان کی پشت سے نکالا، اس حالت میں کہ وہ لوگ سب عالمِ ذر میں تھے۔اور پھر خدا نے اپنی معرفت کو ان پر مقرر کیا۔ اس طرح کی تفسیر و تاویل مخالفِ عقل ہے اور عقل اس چیز کو باطل اور محال جانتی ہے''۔

شیخِ مفید

صفحہ۱۹۳پر بحوالہ ''المسائل السرویہ'' ج ۷ صفحہ ۴۷ شیخِ مفید کا یہ قول درج کرتے ہیں۔

''حقیقتِ مطلب یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے آدمؑ کی نسل کو ان کی کمر سے نکالا جو کہ چھوٹے چھوٹے ذرّات کی صورت میں تھے یہاں تک کہ انہوں نے موجودہ تمام فضا کو پُر کر دیا۔ان میں سے بعض چمک رہے تھے اور بعض سیاہ و تاریک تھے اور بعض کی

چمک اور سیاہی برابر تھی۔ حضرت آدمؑ ان کی کثرت کو دیکھ کر تعجب سے پوچھتے ہیں کہ یہ سب کیا ہیں؟۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے ان کو جواب دیا کہ یہ سب تمھاری اولادیں ہیں۔ حضرت آدمؑ نے دوبارہ سوال کیا کہ ان میں یہ چمک اور تاریکی کیسی ہے؟۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جواب دیا کہ جو، ان میں چمک رہے ہیں یہ میرے اولیاء و جانشین ہوں گے زمین پر۔ اور جو سیاہ ہیں وہ کافر ہوں گے اور جن میں چمک اور سیاہی کو مساوی دیکھ رہے ہو یہ میرے گنہگار بندے ہیں۔

لہٰذا جو روایات کے لحاظ سے متفق علیہ بات ہے، وہ اسی حد تک کی ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہنا کہ ان سے اقرار لیا گیا اور انہوں نے اقرار کیا، یہ سب اضافی باتیں ہیں اور اس طرح سے حق و باطل کو آپس میں مخلوط کرنا ہے''۔

شیخِ طوسی

صفحہ ۱۹۴ پر بحوالہ تفسیر تبیان ج ۵ صفحہ ۲۸ شیخِ طوسی کا عقیدہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

''جو روایات اس بات کو بیان کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کے صلب سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان سے اپنی وحدانیت کی گواہی لی، اس طرح کی بات ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ ان ذرّات پر نہ کوئی تکلیفِ شرعی عائد ہوتی ہے اور نہ کوئی حجت تمام ہوتی ہے اور نہ ان کو ایسی چیز کی طرف بلانا صحیح ہے جس پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہو''۔

ابنِ شہر آشوب

صفحہ ۱۹۶ پر لکھتے ہیں

''اسی طرح ابنِ شہر آشوب نے اپنی کتاب ''متشابہات القرآن'' میں بھی عالمِ ذر کا شدید انکار کیا ہے''۔

مؤلف

صفحہ ۱۹۶ پر لکھتے ہیں

''مؤلفِ کتاب کا نظریہ یہ ہے کہ کسی قسم کا عالمِ ذر وجود نہیں رکھتا''۔

صفحہ ۱۹۷ پر لکھتے ہیں

''مذکورہ مطالب جو عالمِ ذر کے اثبات میں بیان کئے گے وہ آیت کے ظاہری معنی سے بھی تضاد رکھتے ہیں۔ یا کم از کم اس آیت کے ذریعے عالمِ ذر کے وجود پر گواہ کے طور پر قرار نہیں دیا جا سکتا''۔

یہ تمام بیانات آپ نے ملاحظہ فرمائے اور ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مذہب شیعہ آج جس حال کو پہنچا ہے اور ولایتِ امیرؑالمومنین کی مخالفت اپنے عروج پر پہنچی ہوئی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ابتداء سے ہی مذہبِ شیعہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا جو بظاہر شیعہ تھے لیکن بباطن دشمنانِ علیؑ تھے۔ سونے پر

سہا گہ یہ کہ سادہ لوح شیعوں نے انہیں عالم سمجھ کر اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے سروں پر مسلط کر لیا تھا۔ اب آپ کو یہ احساس کر لینا چاہیئے کہ ہمارا کام کتنا مشکل ہے، کیونکہ گیارہ سو سال کی خرابی کو جڑ سے اکھاڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

وجوبِ ولایت

ہم ولایتِ امیرؑ المومنین کو اس سطح پر دیکھنے کے عادی نہیں ہیں لیکن یہ امر مجبوری ہمیں یہ گفتگو کرنی پڑ رہی ہے۔ ولایتِ علیؑ عقیدہ ہے اور واجب و مستحب جیسے الفاظ کا استعمال اعتقادی امور کیلئے نہیں ہوا کرتا۔ آج تک کسی کو یہ کہتے نہیں سنا گیا کہ لا الٰہ الّا اللہ کہنا واجب ہے یا محمدؐ الرسول اللہ کہنا واجب ہے کیونکہ عقیدہ واجب نہیں بلکہ شرطِ وجوب ہوا کرتا ہے۔ جب تک کوئی شخص ایمان نہ لے آئے اس وقت تک نہ اس پر نماز واجب ہوتی ہے نہ روزہ اور نہ دیگر ارکان۔ ولایتِ علیؑ کے بارے میں واجب و مستحب کی بحث چھیڑنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ ولایت کو اپنے عقائد میں شامل نہیں سمجھتے اور یہ بات اس وقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی جب تمام علماءِ سوء اس بات پر متحد و متفق ہو گئے اور اس بات پر ان کا اجماع ہو گیا کہ ولایتِ علیؑ سے ہمارے مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ جب تمھارا کلمہ وہی ہے جو عام مسلمانوں کا ہے تو پھر تم نے یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کیوں بنا رکھی ہے اور لفظِ شیعہ اپنے ساتھ کیوں لگا رکھا ہے؟۔ جب تمھارا عقیدہ ایک ہے تو پھر تمھارا نام بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ تم نے

اپنے ساتھ شیعہ لگا کر سُنّی اور شیعہ دونوں کو غلط فہمی میں ڈالا ہوا ہے حالانکہ تم تو نہ اِدھر ہو نہ اُدھر، بلکہ کوئی بیچ کی چیز ہو جس کے بارے میں سورۂ نساء کی آیات ۱۵۰، ۱۵۱ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ اس کے بیچوں بیچ ایک راستہ اختیار کریں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کیلئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے''۔ خدارا یہ نہ سمجھیئے کہ ہم خواہ مخواہ اس آیت کو کسی پر چسپاں کر رہے ہیں بلکہ یہ آیت حقیقتاً انہی جیسے لوگوں کیلئے نازل ہوئی ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں معصومؑ فرماتے ہیں۔ ''یہ لوگ وہ ہیں جو رسولؐ اللہ کا اقرار کرتے ہیں اور حضرتِ امیرؑ المومنین کا انکار کرنے والے ہیں''۔ (مولودِ کعبہ صفحہ ۳۵ بحوالہ تفسیرِ قمی ج ۱ صفحہ ۱۵۷)۔ کلمہ، اذان، اقامت اور نماز تو رہی ایک طرف، اب تو یہ تلقین میں بھی علیؑ کا نام لینے کے روادار نہیں۔ چنانچہ جدید فقہی مسائل سیستانی، صفحہ ۱۱۴، مسئلہ ۱۲۹ میں یہ فتویٰ دیا گیا ہے کہ ''مستحب ہے کہ مرنے والے کو کلمۂ شہادتین پڑھائے جائیں''۔ یہ لوگ شدید خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ چلو دو شہادتیں تو ہم نے دے ہی دی ہیں۔ اگر قیامت کے دن دیکھا کہ بغیر تیسری شہادت کے کام نہیں چل رہا تو وہاں معافی تلافی کر لیں گے۔ ان کو شاید معلوم نہیں کہ دنیا میں تو یہ اپنی دانست میں اللہ کو دھوکا دے لیں گے لیکن آخرت میں جو منصوبہ یہ بنائے بیٹھے ہیں وہ پورا ہونے والا نہیں ہے کیونکہ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''جن لوگوں نے علیؑ کی ولایت کا اقرار نہیں کیا ہوگا ان کے دلوں

سے اللہ تعالیٰ کلمۂ **لا الٰـہ الّا اللہ محمدؐ الرسول اللہ** سلب کرے گا اور اس کلمے کو صرف ہم اور ہمارے شیعہ ہی کہہ سکیں گے، ان کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں کہہ سکے گا"۔ (تفسیرِ فرات۔ صفحہ ۳۷۵)۔

تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۲۱۴ پر جناب امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ "اہلِ قبلہ میں سے شہادتین کا اقرار کرنے والا ہر شخص مومن نہیں ہوتا کیونکہ عہدِ رسالت کے منافق بھی لا الٰہ الّا اللہ محمدؐ الرسول اللہ کی گواہی دیا کرتے تھے لیکن آنحضرتؐ نے جو اپنے وصیؑ کے متعلق بیان دیا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ رسولِ خدا کے اس پختہ عہد کو کمزور کریں۔ ایسے ہی لوگوں کے الٹے پاؤں پھرنے کیلئے اللہ نے فرمایا۔ "محمدؐ تو بس اللہ کے رسول ہیں، ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کردیئے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟"۔

بہرحال اتمامِ حجت کیلئے ہم وجوبِ ولایت کے بارے میں چند نصوصِ معصومینؑ پیش کررہے ہیں تاکہ کسی کے پاس لاعلمی کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔

۱۔ القطرۃ من بحار ج ا صفحہ ۲۷۷۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

"میں علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کی ولایت کو زیادہ پسند کرتا ہوں بہ نسبت اس کے کہ میں اولادِ علیؑ ہوں۔ کیونکہ ولایت علیؑ واجب ہے اور ان کی اولاد سے ہونا ایک فضیلت"۔

آپ یہ غور فرمایئے کہ آپؑ کی امامت و ولایت کا مکمل دارومدار اس بات پر ہے کہ آپؑ اولادِ علیؑ ہیں۔ اس کے باوجود آپ اس امر کو زیادہ پسند فرما رہے ہیں کہ آپؑ ولایتِ علیؑ پر ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ولایتِ علیؑ پر ہونا بنیادی ضرورت ہے اور باقی مراتب اس سے مشروط ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص سیّد ہو لیکن ولایتِ علیؑ کو واجب نہ سمجھتا ہو تو اولادِ علیؑ ہونا اس کے کسی کام نہیں آئے گا اور اس کا انجام پسرِ نوحؑ جیسا ہوگا۔ سادات کو اس بات پر خصوصی توجہ دینا چاہیئے۔

۲۔ امام رضاؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا۔ ''اے عبدالسلام! کیا تم بھی دوسروں کی طرح ہماری ولایت کے وجوب کے منکر ہو؟'' (عیونِ اخبار الرضا ج ۲ صفحہ ۳۵۸)۔

۳۔ ایک اعرابی نے رسولؐ اللہ سے اس آیت کے معنی پوچھے کہ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو۔ آپؐ نے فرمایا۔ ''میں اللہ کا نبی ہوں اور علیؑ اللہ کی رسّی ہے''۔ اعرابی یہ کہتے ہوئے چلا کہ ''میں اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی رسّی پر ایمان لایا''۔ اس بارے میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ ''علیؑ کی ولایت وہ رسّی ہے کہ جس نے اِس رسّی کو پکڑا وہ مومن بنا اور جس نے نہ پکڑا وہ ایمان سے نکل گیا''۔ (تفسیرِ فرات صفحہ ۳۷۵)

۴۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔ ''منکرِ ولایت، منکرِ فضیلت، منکرِ نبوت اور منکرِ ربوبیت میں کوئی فرق نہیں''۔ (نہج الاسرار ج ا صفحہ ۷۸)۔

۵۔امیرالمومنین کا ارشاد ہے۔ ''یہ دو نام (یعنی محمدؐ وعلیؑ) نفع نہیں پہنچاتے مگر دونوں مل کر''۔ (نہج الاسرار ج ۱ صفحہ ۲۱۸)۔ میرے مولاؑ نے ایک کلّیہ بیان فرمادیا ہے کہ وقت، موقعہ اور مقام چاہے کوئی بھی ہو، ان دو ناموں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اب یہ فلسفہ بگھارنا کہ کلمے میں تو ہم پڑھیں گے لیکن نماز میں نہیں پڑھیں گے ایک احمقانہ بات ہوگی۔ یہ بات آنے والی حدیث سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔

۶۔تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۲۶۵۔ امام رضاؑ نے فرمایا۔

''اللہ نے فرمایا کہ میں محمدؐ کی نبوت اور علیؑ کی ولایت کے اقرار کے بغیر کسی کا عمل قبول نہیں کروں گا''۔

۷۔امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''ولایتِ علیؑ کا انکار نا قابلِ معافی جرم ہے۔ اس کے علاوہ محبانِ علیؑ کے جن گناہوں کو خدا چاہے معاف کردے گا''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۳۸۱)۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ کا محبّ ہونے کیلئے بھی ولایت کا اقرار لازمی ہے۔

۸۔القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۳۱۴۔

سورۂ الحاقہ آیت ۵۱۔ ''اور اس میں شک نہیں کہ وہ یقیناً حق الیقین ہے'' کہ تفسیر میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ ''حق الیقین سے مراد علیؑ کی ولایت ہے کہ جو کوئی بھی اسے جھٹلائے گا وہ پشیمانی اور ندامت میں مبتلا ہوگا۔ اس نے درحقیقت حق الیقین کی تکذیب کی ہے کیونکہ آنجنابؑ کی ولایت واجب ولازم ہے''۔

۹۔نحل ۹۰۔ **"اِنَّ اللہ یا مُرُ بالعدلِ وَ الاحسان"** ۔(بے شک اللہ عدل اوراحسان کا حکم دیتا ہے)۔ یہ دونوں یعنی عدل اوراحسان امر ہیں اورواجب ہیں۔ اس کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔"**لا الٰـہ الّا اللہ محمدؐ الرسول اللہ** کی گواہی عدل ہے اوراحسان سے مراد امیرؑ المومنین ہیں"۔(تفسیرِ نورالثقلین ج۵صفحہ۹۹)۔

اتنی معصوم گواہیوں کے بعد اب یہ گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ولایتِ علیؑ سے بچنے کیلئے کوئی بہانہ تلاش کیا جائے اورہمیں یقین ہے کہ جس کا نفس پاک ہوگا اورجس کے دل میں علیؑ کی تھوڑی سی بھی محبت ہوگی،اس کی غلط فہمی ضرور ختم ہوگئی ہوگی اور وہ یقیناً اپنی اصلاح کے بارے میں سوچے گا۔**انشاء اللہ اَو انشاء علیؑ**۔

شہادتِ ولایت قرآن میں

ہر کتاب کاایک موضوع ہوتا ہے اورقرآن کاموضوع توحید ہے۔توحیدایک باطن ہے جس کا ظاہرولایت ہے۔اس طرح اگرقرآن کو دولفظوں میں بیان کرنا ہوتو ہم کہیں گے کہ قرآن گلدستۂ ولایت ہے۔لیکن جولوگ قرآن کے حروف والفاظ کی پرستش کرتے ہیں اوراس کے مفاہیم کی طرف توجہ نہیں کرتے ،وہ اسی شش وپنج میں مبتلا

رہتے ہیں کہ قرآن میں ذکرِ شہادتِ ولایت کہاں ہے؟۔ انہیں آیات دکھاؤ تو کہتے ہیں کہ ان کی تفسیر دکھاؤ۔ تفسیر دکھاؤ تو کہتے ہیں کہ اس کا راوی کون ہے؟، اس کے باپ کا نام کیا تھا، اس کے بھائی کون تھے، اس کی بہنوں کا نام کیا تھا، اس کے غلاموں کا اتا پتہ کیا ہے، اس کا قبیلہ کون تھا؟۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مقصد ماننا ہے ہی نہیں، یہ تو فقط ہمیں الجھائے رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم نے سوچا کہ بجائے اس کے کہ ہم ان کو بتائیں، کیوں نہ ہم ان سے پوچھیں؟۔ ویسے بھی ہم تو ایک طالبِ علم ہیں اور کسی سے بھی پوچھنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ منکرینِ شہادتِ ولایت بھی اگر ہمیں دیانت داری کے ساتھ کوئی معقول جواب دیں گے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اسے مان لیں گے۔ ذیل میں ہم چند آیات نقل کررہے ہیں اور منکرینِ ولایت سے التماس کرتے ہیں کہ وہ ان کا مطلب ہمیں بتائیں لیکن ایمانداری شرط ہے۔

ا۔ بقرہ ۱۴۰ ''اور اس سے زیادہ ظالم (اظلم) اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے''۔

اس آیت میں ایک گواہی کا ذکر کیا گیا ہے جس کی تین خصوصیات ہیں:۔

(الف)۔ وہ گواہی ایک ہے، متعدّد نہیں۔

(ب)۔ وہ گواہی کورٹ کچہری کی گواہی نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے ہے۔

(ج)۔ اس گواہی کو لوگ چھپاتے ہیں۔

حضراتِ منکرین جن شہادتین کا ذکر کرتے ہیں وہ تو دو ہیں۔ اور ان دونوں گواہیوں کو

کوئی ایک مسلمان بھی نہیں چھپاتا چاہے وہ خارجی ہو، ناصبی ہو، شیعہ ہو یا سنّی۔ پھر وہ ''ایک شہادت'' کون سی ہے جسے لوگ چھپاتے ہیں اور جسے چھپانے والوں کو اللہ نے بدترین ظالم کہا ہے؟۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ کا کلام (معاذاللہ) مہمل نہیں ہوسکتا اور نزولِ قرآن کا مقصد یقیناً اس کے معنی تک پہنچنا ہے نہ کہ اس کے حروف والفاظ کو رٹنا۔لہٰذا ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ اس ایک شہادت کو پہچانے، نہیں پہچانے گا تو اس کے اظلم ہونے کا امکان ہر صورت میں موجود رہے گا۔ حضراتِ منکرین ذرا ہمت کریں اور علیؑ کو چھوڑ کر کسی اور کا نام لے دیں!

۴۔ بقرہ ۱۱۴۔ ''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس نے اس بات سے منع کیا کہ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اُس کے ''اسم'' کا ذکر کیا جائے اور اس کی بربادی میں کوشش کی۔یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اس بات کا حق نہیں ہے کہ مسجد میں داخل ہوں مگر یہ کہ ڈرتے ڈرتے۔ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کیلئے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہوگا''۔

یہاں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں اللہ کے ذکر پر کوئی اعتراض نہیں ہے مگر وہ اللہ کے اسم کا ذکر گوارا نہیں کرتے اور اس سے منع کرتے ہیں۔اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مساجد کا مصرف ہی یہ ہے کہ ان میں اللہ کے اسم کا ذکر کیا جائے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مسجدیں بارگاہِ خداوندی نہیں ہیں بلکہ امام بارگاہ ہیں۔

آپ نے خود بھی دیکھا ہوگا کہ آج کل نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مسجدوں میں مجلسِ حسینؑ برپا کرنے سے روکا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مجلس کرنی ہے تو امام بارگاہ میں کرو۔ یہ آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہمیں حیرت ہوئی جب ہم نے ایک قرآن میں اس آیت کی تفسیر یہ دیکھی کہ ان لوگوں سے مراد مشرکین ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ <u>مشرکین مسجدوں میں کب داخل ہوتے ہیں کہ انہیں ڈرتے ڈرتے داخل ہونے کی اجازت دی گئی ہے؟۔</u>

حضراتِ منکرین ذرا ہمت کریں اور علیؑ کو چھوڑ کر کسی اور کا نام لے دیں!

۳۔ المعارج ۳۲ تا ۳۵۔ ''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی شہادات پر قائم رہنے والے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی ''صلوٰۃ'' کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ جنتوں میں عزت پانے والے ہیں''۔

تفاسیرِ معصومینؑ کے مطابق ''امانت'' سے مراد ولایتِ علیؑ ہے۔ ''عہد'' کے بارے میں آپ تفصیل سے پڑھ چکے۔ اس سے بھی ولایتِ علیؑ مراد ہے۔ **شہادات** جمع کا صیغہ ہے اور اس کا اطلاق تین یا اس سے زیادہ گواہیوں پر ہوتا ہے۔ دو شہادتوں یعنی **''شہادتَین''** کے بارے میں تو ہم نے سنا ہے لیکن یہ تیسری **شہادت** کس کی ہے؟۔

حضراتِ منکرین ذرا ہمت کریں اور علیؑ کو چھوڑ کر کسی اور کا نام لے دیں! ان آیات کے بارے میں ہمیں اُن کے جواب کا انتظار رہے گا۔ اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے

ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شہادتِ ولایت علیؑ نماز میں موجود ہے اور جس میں رسولؐ اللہ کو اس کا حکم دیا گیا ہے، کہیں دھیمی آواز میں اور کہیں اعلانیہ۔

سورۂ بنی اسرائیل ۱۱۰۔ **"ولاتجھر بصلاتک ولاتُخافت بِھا وَابتَغ بَینَ ذٰلک سبیلاً"**۔ (اور (اے رسولؐ) تم اپنی نماز میں اپنی آواز کو نہ تو بلند ہی کیا کرو اور نہ اسے بہت آہستہ کیا کرو اور اُس کے بَین بَین راستہ اختیار کرو"۔

تفسیرِ نورالثقلین ج ۵ صفحہ ۲۹۴ پر اس آیت کی تفسیر اس طرح بیان کی گئی ہے:۔

"جابر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقرؑ سے **ولاتجھر بصلاتک** .... کی تفسیر دریافت کی تو آپؑ نے فرمایا۔" (اے رسولؐ) علیؑ کی ولایت کو بلند آواز سے مت بیان کرو۔ پس وہ نماز میں ہے۔ اور میں نے علیؑ کو جو اعزاز واکرام دیا ہے اسے بلند آواز سے بیان نہ کرو۔ اور اِخفات نہ کرو، یعنی خود علیؑ سے یہ باتیں مت چھپاؤ۔ اور جہاں تک **وابتغ بین ذٰلک سبیلاً** کا تعلق ہے تو اللہ یہ کہہ رہا ہے کہ تم مجھ سے ولایتِ علیؑ کو بلند آواز سے بیان کرنے کا سوال کرتے رہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غدیرِ خُم میں اس کے ظہار کی اجازت دی تھی"۔

اس آیت سے دو باتیں واضح طور پر ثابت ہوگئیں۔ اوّل یہ کہ ولایتِ علیؑ نماز میں موجود ہے لہٰذا اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات ہے تو یا تو وہ جاہل ہے اور یا پھر اس کا

مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا اور لوگوں کو ولایتِ علیؑ سے ہٹانا ہے۔ دوئم یہ کہ رسولؐ اللہ کی نماز میں ولایتِ علیؑ شامل تھی البتہ غدیرِ خم سے پہلے تک وہ اپنی نماز میں ولایتِ علیؑ اخفات کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور غدیرِ خم کے بعد اعلانیہ پڑھنے لگے۔ تاریخ اور روایات بتاتی ہیں کہ میدانِ غدیر میں جو اذان دی گئی وہ بلال نے نہیں دی حالانکہ رسولؐ اللہ نے انہیں با قاعدہ موذّن مقرر کیا تھا لیکن اِس موقعے پر آنحضرتؐ نے بطورِ خاص یہ کام حضرت ابوذرؓ غفاری کے سپرد کیا اور انہوں نے اذان میں **''علیٌ ولی اللہ''** پڑھا جس پر بعض صحابہ نے اعتراض بھی کیا لیکن رسولؐ اللہ نے یہ کہکران کا اعتراض مسترد کر دیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو میں نے تمھیں بتایا تھا وہ بھول گئے؟''۔ اور خطبۂ غدیر کے بعد جو نماز پڑھی گئی اس میں بھی شہادتِ ثالثہ موجود تھی اور اسی وجہ سے معاویہ نے وہ نماز نہیں پڑھی۔ اس کی تفصیلات ہم نے کشف المسائل میں لکھی ہیں لہٰذا انہیں وہیں ملاحظہ کیا جائے۔

عملِ معصومؑ

ہم پر یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب معصومینؑ اپنی نمازوں میں شہادتِ ثالثہ نہیں پڑھتے تھے تو پھر ہم کیوں پڑھیں؟۔ اس کا جواب ہم نے کشف المسائل میں فقہ الرضا سے دیا تو کہنے لگے کہ یہ کتاب مجھول ہے۔ پھر کشف الاحکام میں ہم نے القطرۃ من بحار اور بحارالانوار سے اس کا ثبوت دیا جس پر فی الحال کوئی ردِّ عمل ہمارے سامنے

نہیں آیا۔اب ہم دوسری کتابوں سے دلیل لا رہے ہیں،ہمیں بھی دیکھنا ہے کہ یہ کس کس چیز کاانکار کرتے ہیں۔

حضرتِ ختمی مرتبتؐ کی نماز میں شہادتِ ثالثہ ہم سطورِ بالا میں بیان کر چکے ہیں اور اس سلسلے میں ایک حدیث اس مقام پر پیش کرر ہے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ نے اللہ کے قول **"وشاھدو مشھود"** کے بارے میں فرمایا۔
''شاہد رسولؐ اللہ اور مشہود امیرؑالمومنین ہیں''۔(معانی الاخبار صفحہ ۳۴۶ حدیث ۷)۔
یعنی گواہی دینے والے رسولؐ اللہ ہیں اور جس کی گواہی وہ دیتے ہیں وہ امیرؑالمومنین ہیں۔

ریاض القدس صفحہ ۶۳۱ پر آقائی صدرالدین قزوینی لکھتے ہیں۔''روزِ عاشورہ امام حسینؑ نے خود اذان دی۔یہ آوازِ آذان پوری کائنات نے سنی اور قرآنِ مجید میں وارد ہوا ہے کہ اذان سے مراد مولا امیرؑالمومنین ہیں''۔

اور اس کے بعد ہم جو حدیث مبارکہ پیش کرر ہے ہیں وہ اس بارے میں حرفِ آخر ہے جسے ہم نے تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۴۹۱ سے اخذ کیا ہے۔ اس میں مولا امام جعفر صادقؑ نے نماز پڑھنے کے بعد ایک دعا کی تعلیم فرمائی ہے جو ہم آپ کی خدمت میں پیش کرر ہے ہیں۔

''پروردگار! تو نے ہم پر اپنے اولیاء کی مخلصانہ گواہی دینے کا احسان کیا ہے اور تو نے ہم سے یہ گواہی دلائی ہے کہ یہ ہستیاں سراجِ منیر اور نذیر و منذر یعنی رسولؐ اللہ

کے بعدان کے جانشین ہیں اورتو نے ان کی وِلا اوران کے دشمنوں سے بے زاری کے ذریعے سے دین کی تکمیل کی ہے اورتو نے اپنے تجدیدِ عہد کے ساتھ ہم پر اپنی نعمت تمام کی ہے اورتو نے ہم سے ابتدائے تخلیق میں جو میثاق لیا تھا اس کی ہمیں یاددہانی کرائی ہے اور تیرا احسان ہے کہ تو نے ہمیں (اس میثاق کو) قبول کرنے والوں میں سے بنایا اور تو نے ہمیں اپنا ذکر فراموش کرنے سے بچایا۔ چنانچہ تیرے ہی احسان وکرم کی وجہ سے ہم نے گواہی دی کہ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں اورتو ہی ہمارا رب ہے اور محمد مصطفٰی تیرے عبداور رسول ہیں اور وہ ہمارے نبی ہیں اور حضرت علیؑ مومنین کے امیر اور حجتِ عظمٰی اور آیت اللہ الکبریٰ ہیں اور علیؑ ہی وہ عظیم خبر ہیں جس کے متعلق لوگوں کا اختلاف ہے۔ چنانچہ تیرے ہی احسان و کرم کی وجہ سے ہم نے یہ گواہی دی"۔

آپ محسوس فرمائیں گے کہ امامؑ نے نماز پڑھنے پر احسان مندی کا اظہار نہیں کیا بلکہ یہ شہادت دینے پر اللہ کے حضور شکر واحسان ادا کیا ہے جس سے صاحبانِ نظر جان جائیں گے کہ اگر اس شہادت کو نماز سے نکال دیا جائے تو نماز کوئی قابلِ وقعت شے نہیں رہتی۔

تقریرِ معصومؑ

تقریرِ معصومؑ یہ ہے کہ اگر معصومؑ کے سامنے کوئی بات کہی جائے یا کوئی کام کیا جائے اور معصومؑ خاموش رہیں اور منع نہ کریں تو وہ بات یا کام حجت بن جاتا ہے اور سنت کے زمرے میں آتا ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار مواقع ہیں جب کہ رسولؐ اللہ اور ائمہؑ طاہرین کے سامنے مکمل کلمہ پڑھا گیا اور وہ خاموش رہے۔ ان تمام واقعات کو نقل کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے اور آپ خود بھی بہت سے ایسے واقعات سے واقف ہوں گے۔ یہاں اپنے استدلال کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہم چند مثالوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

۱۔ رسولؐ اللہ نے آیۂ ولایت نازل ہونے کے بعد مولا علیؑ کی ولایت کا اعلان کیا تو لوگوں نے کہا کہ <u>ہم اللہ کے رب ہونے اور اسلام کے دین ہونے اور محمدؐ کے نبی ہونے اور علیؑ کے ولی ہونے پر راضی ہیں</u>''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۶۱)

اس سے پتہ چلتا ہے اُس زمانے کے لوگ بھی میدانِ غدیر میں یہ بات سمجھ گئے تھے کہ اُس وقت تک جو کلمہ وہ پڑھتے چلے آئے تھے وہ نامکمل تھا جسے اللہ نے اُس روز کامل کیا۔ اسی لئے بغیر بتائے ہوئے انہوں نے رسولؐ اللہ کے سامنے مکمل کلمہ پڑھا۔ اب آجکل کے لوگ اگر غدیر سے پہلے والے زمانے میں واپس جانا چاہتے ہیں تو انہیں نامکمل دین مبارک ہو مگر یہ بات بہرحال انہیں ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اُس نامکمل

دین سے نہ اللہ راضی تھا نہ اُس کا رسولؐ۔

۲۔ حجاجؒ بن مسروق امام حسینؑ کے موذّن تھے۔ جب وہ میدان میں پہنچے تو یہ رجز پڑھا۔ ''حسینؑ میرے امام، ہادی اور مہدی ہیں۔ اُنؑ کے جد رسولؐ خدا، انؑ کے بابا علیِ مرتضٰی وصیِ رسولِ خدا اور ان کے بھائی حسنِ مجتبٰی ولیِ خدا ہیں''۔ حجاج یہی اذان دیا کرتے تھے اور انہوں نے اذان کی گواہی کو رجز بنا دیا''۔ (ریاض القدس ج ۲ صفحہ ۲۴۸)۔

۳۔ ''ایک یہودی جس کا نام یحیٰی حرانی تھا، ان تماشائیوں کے درمیان موجود تھا جو لٹے ہوئے قافلے کو دیکھنے میں مصروف تھے، کہ اچانک سرِ امام حسینؑ نے تلاوتِ قرآن شروع کی۔ یہ دیکھکر اُس نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟۔ جب امامؑ کا تعارف ہوا تو وہ فوراً مسلمان ہوگیا اور یہ کلمہ پڑھا۔ **''اشھد ان لا الٰہ الّا اللہ و اشھد انّ محمدّ الرسول اللہ و ان ابنہٗ ھٰذا من اولیاء اللہ''**۔ (ریاض القدس ج ۲ صفحہ ۵۸۸)۔

۴۔ ''جب حلب کے راہب کو سرِ حسینؑ ملا تو وہ رونے لگا اور کہا۔ ''اے فرزندِ رسولؐ! مجھ پر بہت گراں ہے اگر میں اپنی جان آپ پر قربان نہ کردوں۔ میں آپؑ سے عرض کرتا ہوں کہ آپؑ مجھے درجۂ شہادت عطا فرمائیں تاکہ میں شہیدانِ کربلا میں محشور ہوں''۔ یہ کہہ کر اس نے یہ کلمۂ شہادت اپنی زبان سے ادا کیا۔ **''اشھد ان لا**

الٰہ الّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ وان محمدؐ الرسول اللہ و ان علیؑ ولی اللہ و انک الامام"۔(ریاض القدس ج۲ صفحہ ۶۰۰)۔

۵۔"دربارِ یزید میں ایک نصرانی نے جب یزید کو سرِ امام حسینؑ سے بے ادبی کرتے ہوئے دیکھا تو یزید کو بہت ملامت کی۔ یزید نے یہ سن کر اس پر قتل کا حکم جاری کر دیا۔ اس نصرانی نے کہا۔"اے نام کے مسلمان! تو مجھے قتل کرنے کا خواہش مند ہے؟۔ سن! میں نے کل شب رسولِؐ خدا کو خواب میں دیکھا کہ آپ مجھ سے فرما رہے ہیں کہ اے نصرانی تو اہلِ جنت میں سے ہے۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا راز ہے لیکن اب مجھے اس خواب کی تعبیر معلوم ہوگئی۔ یہ کہہ کر اس نصرانی نے جست لگائی اور سرِ امام حسینؑ کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور توحید و نبوت و امامت کی شہادت دی"۔(ریاض القدس ج۲ صفحہ ۷۰۰)

۶۔"جب امیرؑالمومنین نے بیرالعلم میں تمام کافر جنّات کو قتل کر دیا تو جنّوں کے چوبیس ہزار قبیلے اسلام لائے۔ اور ان کا رئیس جب قتل ہو گیا تو اس کی جگہ اس کے بیٹے زعفر نامی جن کے سر پر تاجِ شاہی رکھا گیا۔ اُس وقت امیرؑالمومنین نے فرمایا۔"امان ہے اس کیلئے جو ایمان لائے اور صدقِ دل سے یہ کلمہ پڑھے۔ **لا الٰہ الّا اللہ، محمدؐ الرسول اللہ ، علیؑ ولی اللہ**"۔(ریاض القدس

ج ۲صفحہ۲۵۵)۔

اللہ کا احسان و کرم ہے جس نے ہمیں یہ سطور لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ بات ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ولایتِ علیؑ کی شہادت وہی دے گا جس کی اصل پاک ہو۔ اُس کے علاوہ کوئی اور یہ کام کر ہی نہیں سکتا لہٰذا ہمارے لکھنے یا نہ لکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن یہ ساری کوشش ہم نے اپنے مولاؑ کا حقِ نمک ادا کرنے کیلئے کیا ہے تاکہ نمک حراموں میں ہمارا شمار نہ ہو اور اپنے مولاؑ سے ہی ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ ہماری اِس ادنٰی کاوش کو درجۂ قبولیت عطا فرمائیں گے کیونکہ وہ کریم اور سخی ہیں۔

اظہارِ محبت............عمل

محبت جب مرتبۂ اظہار میں آتی ہے تو عمل کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور یہی عمل اسے منزلِ مودّت تک پہنچاتا ہے۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے جب انسان سراپا زبان بن جاتا ہے۔اس کے دل میں چھپی ہوئی محبت آشکار ہونے لگتی ہے اور افشائے راز کرنے والا کوئی اور نہیں بلکہ خود اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کا اضطراب اور اس کی حرکات وسکنات ہوتی ہیں۔ وہ لاکھ چھپائے لیکن جاننے والے جان لیتے ہیں کہ یہ بندہ تجلّیِ جمال کی زد پر ہے۔ یہی عمل ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔اس معاملے میں انسان کا ذہن بالکل شفاف ہونا چاہیئے اور اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ عملِ صالح کس چیز کا نام ہے۔ کیونکہ نجات کیلئے عملِ صالح شرط ہے۔

تفہیمِ عمل

عمل کی دو کیفیات ہیں۔ایک داخلی اور دوسرے خارجی۔ داخلی عمل وہ تحریک ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور اصل عمل یہی ہے۔ جب یہ اپنے وجودِ خارجی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے تو اعضاء و جوارح سے ظاہر ہوتا ہے۔اور عقلی اعتبار سے یہ ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہو سکتے۔اشتباہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بیک وقت کئی

تحریکیں کام کر رہی ہوتی ہیں اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وجودِ خارجی سے ظاہر ہونے والا عمل کس تحریک کا اظہار ہے۔ ہم نماز کی مثال لیتے ہیں جو ایک خارجی عمل ہے اور ضروری ہے کہ یہ اپنے باطنی وجود سے ہم آہنگ ہو۔ لیکن نماز پڑھنے سے قبل انسان کے اندر مختلف تحریکیں موجود رہتی ہیں۔ مثلاً جذبۂ پرستش جو انسان کی فطرت میں ہے اور انسان جب سے کرۂ زمین پر آیا ہے تب سے کسی نہ کسی چیز کو پوج رہا ہے۔ یہ ایک بے کار عمل ہوتا ہے اور اس کا مقصد فقط اپنی جبلّت کو تسکین پہنچانا ہوتا ہے۔ یا یہ تحریک ریاکاری بھی ہو سکتی ہے جس کا مقصد لوگوں میں عزت اور شہرت پانا ہوتا ہے یا لوگوں کو دھوکا دینا ہوتا ہے۔ یہ تحریک عادت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ بعض اوقات انسان ان چیزوں کا اتنا عادی ہو جاتا ہے کہ اگر وہ یہ نہ کرے تو اسے وحشت ہونے لگتی ہے۔ یہ ساری تحریکیں وجودِ خارج میں آنا چاہتی ہیں لیکن جو تحریک باقی تحریکوں پر غالب آجاتی ہے وہ باہر آنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش سے بچانے کیلئے اللہ نے نمازِ داخلی اور نمازِ خارجی کے درمیان ایک چیز رکھ دی ہے تا کہ انسان یہ جان سکے کہ جو شے نمازِ خارجی کی صورت میں باہر آرہی ہے وہ کیا ہے۔ اور اگر غلط چیز ہے تو اسے وہیں روک دے اور صحیح چیز کو آنے دے۔ اس درمیانی چیز کا نام ''نیت'' ہے۔ نیت ایک چیک پوسٹ کی طرح ہے جو غلط چیز کو نماز کی صورت میں باہر نہیں آنے دیتی کیونکہ نیت ایک معیّن شے ہے۔ مقصدِ نماز چونکہ حقِ محبت ادا کرنا

ہے اور یہ ظاہر ہے کہ محبت اپنے محبوب کی قربت چاہتی ہے اس لئے اللہ نے نماز کی نیت بھی ''قربت'' ہی کو قرار دیا۔ اب اگر انسان نیت تو قربت کی کر رہا ہے لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ جس شئے کو وہ نماز کی صورت میں باہر آنے کی اجازت دے رہا ہے وہ جذبۂ پرستش ہے یا ریاء کاری یا عادت ہے تو گویا وہ مصلّے پر کھڑا ہو کر اللہ سے بھی جھوٹ بول رہا ہے اور خود کو بھی دھوکا دے رہا ہے۔ ادیانِ عالم اور خاص طور پر دینِ اسلام کے ساتھ یہی ظلم ہوا ہے کہ اس کے وڈیروں نے لوگوں کو نمازِ ظاہر کا عادی بنا دیا اور نیت سے انہیں بالکل بے خبر رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ایک مصنوعی اور تحریکِ باطن سے عاری عمل بن کر رہ گیا۔ اب اگر کسی کے سامنے لفظِ ''عمل'' بولا جائے تو وہ اس سے نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ ہی مراد لیتا ہے اور عملِ حقیقی کے بارے میں وہ کچھ سننا پسند ہی نہیں کرتا جو ان تمام اعمالِ ظاہری کی اصل بنیاد ہے اور جس کے بغیر یہ تمام اعمال چند احمقانہ حرکات و سکنات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ شیطان کا کام بھی یہی ہے کہ وہ انسان کو ان ظاہری اعمال میں اتنا محو اور اتنا مگن کر دے کہ اسے حقیقت کا خیال تک نہ آ سکے جیسا کہ سورۂ عنکبوت ۳۸ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اور شیطان نے ان کیلئے ان کے اعمال کو آراستہ کر دیا تھا (یعنی ان کے اعمال کو سجا کر ان کے سامنے پیش کر دیا تھا) اور انہیں راستے سے روک دیا تھا حالانکہ وہ لوگ بہت ہوشیار تھے''۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ عمل کا صحیح مفہوم لوگوں تک پہنچایا جائے۔ اسی لئے ہم نے بات کو بالکل بنیاد سے اٹھایا ہے تاکہ عمل کرنے سے پہلے انسان کو یہ تو معلوم ہو کہ عمل ہوتا کیا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی

کہ مولوی سے لفظِ "عمل" سنا اور نمازوں میں جُت گئے؟۔ایک بار پھر سمجھیئے کہ اصل چیز وہ تحریک ہوتی ہے جس کی بنا پر عمل کیا جاتا ہے۔اگر کوئی شخص ہنس رہا ہے اور خوشی کے آثار اس کے چہرے سے نمودار ہو رہے ہیں تو یہ ہنسی اپنی ذات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اصل خوشی وہ ہوتی ہے جو اس کے دل میں ہو۔اگر کسی کا دل خوش نہ ہو اور وہ صرف لوگوں کو دکھانے کیلئے ہنسے تو ایسی ہنسی صاف پکڑی جاتی ہے۔اگر کوئی شخص رو رہا ہے تو اس کا رونا اپنی ذات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اصل چیز وہ غم ہے جو اس کے دل میں ہے۔اور اگر دل میں غم نہ ہو اور وہ لوگوں کو دکھانے کیلئے روئے تو ایسے آنسو مگرمچھ کے آنسو کہلاتے ہیں اور ہر کوئی انہیں پہچان لیتا ہے۔اسی طرح اگر "عمل" اپنی ذات میں کوئی چیز ہوتا تو ہر حال میں اچھا ہوتا۔لوگوں کو چاہیئے کہ اس بات پر غور فرمائیں کہ وہ کون سے حالات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ عمل اور عمل کرنے والوں کی سخت ترین مذمت کرتا ہے۔اور وہ کون سے حالات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ عمل کرنے والوں کی تعریف کرتا ہے۔سب سے اہم اور سب سے مقدّم دین کی سمجھ، دین کی معرفت اور اہلبیتؑ سے محبت ہے اور انہی چیزوں پر پورے دین کا دارومدار ہے اور عمل بھی صرف اسی صورت میں مفید ہوسکتا ہے جبکہ یہ چیزیں انسان کو حاصل ہو جائیں اور دل سے نکل کر اعضاء و جوارح سے ظاہر ہونے لگیں، کبھی نماز کی صورت میں، کبھی روزے کی صورت میں کبھی حج و زکوٰۃ کی صورت میں، کبھی آنسوؤں کی صورت میں اور کبھی ماتم کی صورت میں۔اور اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو ہر عمل اکارت ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں

متعدد مقامات پر وارد ہوا ہے۔

۱۔ غاشیہ۲ تا ۴۔ ''کئی چہرے اس دن عاجزی کرنے والے ہوں گے، عمل کرنے والے، محنت کرنے والے، بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے ''۔یعنی بہت سے لوگ ہیں جو بے تحاشہ عمل کرتے ہیں، بے پناہ تکلیفیں اٹھاتے ہیں، رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں، دن بھر روزے رکھتے ہیں، غریبوں میں دولت بانٹتے ہیں اور حج پر حج کئے جاتے ہیں لیکن یہ سارے عمل اُن کیلئے آتشِ جہنم کے باعث بن جاتے ہیں۔ آخر کیوں؟۔

۲۔ کہف ۱۰۳ تا ۱۰۶۔ ''(اے رسولؐ) کہدو کہ کیا ہم تمھیں ان لوگوں کی خبر دیں جو اعمال کے لحاظ سے نہایت گھاٹے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا کی زندگانی کی سب کوشش ضائع ہوگئی اور وہ یہی گمان کرتے ہیں کہ یقیناً اچھے کام کررہے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پرورد گار کی آیتوں اوراس کی ملاقات سے انکار کیا۔ پس ان کے اعمال بیکار ہوگئے۔ پھر ہم ان کیلئے قیامت کے دن کوئی وزن قائم نہ کریں گے''۔اس آیت کے فوراًبعد ارشاد ہوتا ہے۔''یقیناً جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے ان کیلئے فردوس کے باغ مہمانی کی قیامگاہ ہوں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔ یہ جو ایک ہی سانس میں دومختلف باتیں بیان کی گئی ہیں، کیا ہمارا فرض نہیں بنتا کہ ان پرغور کریں؟۔تفسیر نور الثقلین ج۵ صفحہ ۳۷۷ پر معصومؑ فرماتے ہیں کہ جولوگ بدترین خسارے میں ہیں لیکن اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اچھے

اعمال سرانجام دے رہے ہیں،ان سے مراد جنابِ امیرؑالمومنین کے مخالف اور ان کے سیاسی حریف ہیں"۔اور صفحہ ۳۸۰ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "جو اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہوتو وہ ولایتِ آلِ محمدؐ میں غیروں کو شریک نہ کرے۔ان کی ولایت عمل صالح ہے"۔ اور صفحہ ۳۸۳ پر امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "عملِ صالح ائمہؑ کی معرفت ہے"۔ پس ہر شخص کو عمل کرنے سے پہلے یہ سوچنا ضروری ہے کہ کہیں وہ ائمہ معصومینؑ کی ولایت میں کسی اور کو تو شریک نہیں کر رہا؟۔ اور ان کے علاوہ کسی اور کو تو ولی نہیں مان رہا؟۔ اور ان کے علاوہ کسی اور کو تو امام نہیں مان رہا؟۔ اور اگر ایسا ہے تو اس کو چاہیئے کہ اپنی اصلاح کرے ورنہ یہ یقین رکھے کہ ان تمام آیات کا مصداق وہ خود ہے۔

۳۔فرقان ۲۳۔ "اور جو عمل انہوں نے کیا ہوگا ہم اس کی طرف توجہ کریں گے، پس اسے غبار بنا کر اڑا دیں گے"۔

کیا اب بھی کسی مزید وضاحت کی ضرورت ہے؟۔ پس فرق معلوم کیجئے ایک عمل اور دوسرے عمل میں، قبل اس کے کہ آپ کسی عمل پر کمربستہ ہوں!۔ یہاں بنیادی بات، جسے سمجھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ عام طور پر ایسے شخص کو جو بظاہر نیک اعمال بجالاتا ہے، ہمارے یہاں نیک آدمی کہا جاتا ہے اور ایسے شخص کو جو بظاہر برے اعمال کا مرتکب ہوتا ہو، شریر اور بدعمل کہا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔انسان کے نیک و بد ہونے کا

تعلق ظاہری اعمال سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا معیار باطنی عمل ہے جس کی بناء پر انسان نیک یا بد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنابِ امیرؑالمومنین نے فرمایا۔ "کسی شریر انسان کے نیک کام کے مغالطے میں آ کر دھوکا کھانے سے بچ۔ اور کسی نیکوکار کے غلط کام کی وجہ سے اس سے وحشت ناک ہونے سے اپنے آپ کو بچا"۔ رہی وہ نیکی اور وہ بدی جس کی وجہ سے انسان اللہ کی نگاہ میں نیک یا بد ہوتا ہے، تو اس کا ذکر انشاء اللہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔ اس وقت تو ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ اپنے قارئین پر یہ واضح کر دیں کہ ظاہری اعمال بجالا کر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہمارے اعمال ہمیں بخشوا دیں گے۔ کیونکہ اعمالِ ظاہری، اگر چہ نیک بھی ہوں تب بھی جنت میں لے جانے والے نہیں ہیں۔ جنت میں لے جانے والا وہی باطنی عمل ہے جو انسان کو اللہ کی رحمت کا مستحق بنا دیتا ہے اور اس اصول سے کوئی مستثنیٰ نہیں، خواہ ایک عام آدمی ہو یا اللہ کے مقرب بندے اور اس بات کو اللہ کے رسولؐ نے واضح ترین الفاظ میں بیان فرما دیا ہے۔ چنانچہ تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۶۵ پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ "اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ اختیار میں میری جان ہے، کوئی بھی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوگا"۔ لوگوں نے کہا۔ "یا رسول اللہ آپ بھی؟" آپؐ نے فرمایا۔ "ہاں! میں بھی اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوں گا۔ سوائے اس کے کہ اللہ مجھ پر اپنی رحمت و فضل کا سایہ کرے"۔

یہ بات پھر کبھی سہی کہ اللہ کی رحمت کون ہے اور اللہ کا فضل کون ہے لیکن بات کی جتنی وضاحت حضرت ختمی مرتبتؐ نے کردی ہے اس سے زیادہ وضاحت نہ تو کی جاسکتی ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

ظاہری اعمال کے بارے میں فکرمند ہونے کی دو باتیں ہیں۔ ایک تو قلّتِ عمل اور دوسرے وہ گناہ جو ہم سے دانستہ یا نادانستہ طور پر صادر ہوتے رہتے ہیں۔ قلّتِ عمل کے بارے میں ایک عقلی بات ہم آپ سے کرتے ہیں جس کی سند بھی انشاءاللہ قولِ معصومؑ سے پیش کی جائے گی۔ اگر کوئی شخص بریانی کی ایک ہزار دیگیں آپ کو عطا کردے لیکن یہ شرط لگادے کہ یہ بریانی صرف تم ہی کھا سکتے ہو، کسی کو دے نہیں سکتے تو وہ ایک ہزار دیگیں آپ کی ملکیت ہرگز نہیں کہلائی جاسکتیں اور نہ ہی وہ آپ کے کسی کام آئیں گی بلکہ خراب ہوکر ضائع ہوجائیں گی۔ لہٰذا عطا صرف اسی صورت میں مفید ہوسکتی ہے جبکہ وہ آپ کی ملکیت بن جائے تاکہ آپ خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلاسکیں۔ انسان جو اعمال کرتا ہے تو اسے یہ حق ہوتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے اعمال کسی اور کو بخش دے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگ قرآن اور نمازیں پڑھ پڑھ کر اپنے مُردوں کو نہ بخشا کرتے، اجرت پر نمازیں پڑھوا کر اور روزے رکھوا کر مرحومین کی قضا شدہ نمازیں اور روزے ادا نہ کیا کرتے محتاج قرضداروں کے قرض ادا نہ ہوا کرتے اور زندہ اور مردہ لوگوں کے لئے حجِ بدل نہ ہوا کرتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے والی چیز ہے۔ آئندہ صفحات میں بہت سے

ایسے مضامین آئیں گے جن سے یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جائے گی۔ لیکن ہم آپ سے ایک سوال پوچھتے ہیں۔ جنگِ خندق کے موقعے پر رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا کہ "خندق کے دن علیؑ کی ایک ضربت ثقلین کی عبادت سے افضل ہے"۔ یعنی زمین والوں اور آسمانوں والوں کی تمام عبادات کو اگر جمع کر لیا جائے تو وہ علیؑ کی ایک ضربت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ جس کی ایک ضربت کا یہ حال ہو اس کی تمام عبادات کا کیا حال ہوگا؟۔ اب پہلے تو یہ بتائیے کہ علیؑ کو اِس ثواب کی ضرورت کیا ہے؟ کیونکہ وہ تو ثواب پانے والے نہیں بلکہ ثواب عطا کرنے والے ہیں۔ اور اگر ضرورت نہیں ہے تو یہ ثواب علیؑ کے کس کام کا؟۔ اس بات پر تھوڑا سا تدبّر فرمائیے کہ جو تمام مخلوق کو زندگی دیتے ہیں، رزق دیتے ہیں، صحت دیتے ہیں، اولا د دیتے ہیں، دنیا دیتے ہیں، آخرت دیتے ہیں تو کیا وہ اپنے شیعوں کو اپنا ثواب عطا نہیں کریں گے؟۔ مقصر تو شاید اس بات کا مذاق اڑائے لیکن جو عارفین تھے وہ میرے مولاؑ سے ایسی چیزیں اکثر مانگا کرتے تھے اور وہؑ انہیں عطا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک روایت ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں تا کہ آپ کو ہماری بات کا یقین آ جائے۔ یہ روایت ریاض القدس ج ۲ صفحہ ۱۶۴ سے نقل کی جا رہی ہے۔

"جنابِ سلمانؓ فارسی، حضرتِ مقدادؓ، حضرتِ ابو ذرؓ اور حضرتِ عمارؓ سے منقول ہے کہ ہم نے مولا علیؑ سے سوال کیا کہ مولاؑ ہمیں اپنے ثواب سے اس قدر عطا کر دیجئے کہ ہم بخشے جائیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ یا علیؑ! اپنی ایک سانس کی آمد و رفت کے

مقدار جتنا ثواب عطا فرما دیجیئے ۔تیسری روایت میں ہے کہ یا علیؑ !ایک مرتبہ اللہُ اکبر کہنے کا ثواب عطا فرما دیجیئے ۔تو مولاؑ نے فرمایا۔''میں نے ایک مرتبہ اللہُ اکبر کہنے کا ثواب تم کو بخشا''۔اُس وقت رسولؐ اللہ پر وحی نازل ہوئی کہ اے رسولؐ کہہ دو کہ حرمتِ امیرؑ المومنین کی بدولت مومنین کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے''۔

جہاں تک گناہوں کا تعلق ہے تو ان کا مداوا بھی ہمارے پاس کوئی نہیں سوائے اس کے کہ اپنے مالکوں پر اعتماد کریں۔اور اُس سخی سرکار نے بھی بہت سے دروازے ہمارے لئے کھول دیئے ہیں جن میں توبہ، استغفار اور شفاعت شامل ہیں۔شفاعت تو ہے ہی انہی کے ہاتھوں میں لیکن توبہ اور استغفار میں بھی وہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔رسولؐ نے فرمایا ہے کہ ''میری شفاعت میری امت کے اہلِ کبائر کیلئے ہے، نیکوکاروں کیلئے تو کوئی عذاب سرے سے ہے ہی نہیں''۔(عیونِ اخبار الرضا ج ا صفحہ ۲۳۸)۔امام رضاؑ فرماتے ہیں۔''ہمارے شیعوں کے اعمال ہر صبح و شام ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں۔اگر ان کے اعمال میں ہمیں تقصیر و کوتاہی نظر آئے تو ہم اللہ سے اُن کیلئے مغفرت و بخشش طلب کرتے ہی اور اگر ان کے اعمال بلند ہوں تو ہم ان کیلئے زیادہ توفیقات اور شکرِ الٰہی کا سوال کرتے ہیں''۔(القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۱۲۹)

توبہ

ہم نے کشف المسائل میں عرض کیا تھا کہ شیطان بعینہٖ وہی کام کرتا ہے جو ہادیٔ برحق

کرتا ہے اور وہ ہے ڈرانا اور خوشخبری دینا۔لیکن ان کا طریقۂ کار ایک دوسرے کے برعکس ہے یعنی ہادی جس چیز سے ڈراتا ہے، شیطان اس چیز کے بارے میں امیدیں دلاتا ہے۔ اور ہادی جس چیز کی بشارت دیتا ہے، شیطان اس چیز سے لوگوں کو ڈراتا ہے۔ ہادیانِ برحق نے ہمیں ڈرایا ہے اس بات سے کہ اہلبیتؑ کے حق میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ یہاں شیطان امید دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ اجمالی عقیدہ کافی ہے، زیادہ گہرائی میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اعمال میں تقصیر کے بارے میں ہادیانِ برحق نے ہمیں امید دلائی ہے لیکن شیطان اس مقام پر لوگوں کو ڈراتا ہے اور اس کے مرید بھی روزِ اوّل سے لیکر آج تک یہی کام کررہے ہیں اور انہی کے ابطال کیلئے یہ سطور تحریر کی جارہی ہیں۔

گناہ انسان کے اجزاءِ ترکیبی سے ہی جنم لیتا ہے اور اس کی خلقی کمزوری اس معاملے میں ممد ومددگار ثابت ہوتی ہے۔ نفس کی تین طاقتیں انسان کو گناہوں پر اُکساتی ہیں اور اسے گناہ سے روکنے والی صرف ایک طاقت ہے اور وہ ہے قوتِ عقلیہ۔ اب یہاں ایک کا مقابلہ تین سے ہے اسلئے اکثر حالات میں کثرت اقلیت پر غالب آجاتی ہے۔ ہمارا خالق ہماری کمزوریوں سے واقف ہے اور وہ اس معاملے میں سخت گیری سے کام نہیں لیتا۔ شرط صرف اتنی ہے کہ گناہ کرکے انسان خوش نہ ہو اور مومن کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ گناہ کرکے ہمیشہ رنجیدہ ہوتا ہے اور پشیمان ہوتا ہے اور اللہ نے بھی اس کی پشیمانی کو ہی اس کی توبہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اصل چیز پشیمانی ہی ہے۔ زبانی جمع

خرچ سے توبہ نہیں ہوا کرتی۔مولاؑ امیرالمومنین فرماتے ہیں۔"مومن نعمت اور خطا کے درمیان ہی رہتا ہے اور ان دونوں کی اصلاح نہیں ہوسکتی مگر شکر اور استغفار سے"۔ (حکمتِ بوتراب ج ۱صفحہ ۳۰۱)

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ مومن جب گناہ کرتا ہے تو وہ اس کا امتحان ہوتا ہے۔ امتحان کا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات جب مومن گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ اسے اسبابِ گناہ مہیا کردیتا ہے کیونکہ بغیر اسباب کے کوئی کام سرانجام دینا انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور اسباب اللہ نے انسان کے اختیار میں نہیں دیئے بلکہ اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔اللہ جب مومن کو اسبابِ گناہ میسر کردیتا ہے تو اس کا مقصد یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ گناہ کے بعد توبہ کرتا ہے یا نہیں۔اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو پھر وہ اللہ کی بارگاہ میں سرخرو ہے کیونکہ وہ اپنے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔حضرت امیرالمومنین فرماتے ہیں۔"جب تک بابِ توبہ کھلا ہے، ہرگز گناہ کرنے کے بعد مغفرت سے مایوس نہ ہونا۔تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جس کا اللہ نے گناہ کے ذریعے امتحان لیا۔ اور اس گناہ کے بعد اس نے توبہ کی اور (اگر دوبارہ اس سے گناہ سرزد ہوگیا تو) پھر گناہ کرکے بہت زیادہ توبہ کی"۔ (تجلیاتِ حکمت صفحہ ۹۲)۔اور امیرالمومنین ہی کا ارشاد ہے کہ "ایسے گناہ کی پرواہ نہیں کہ جس کے بعد انسان کو اتنی مہلت مل جائے کہ وہ دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے عافیت طلب کرلے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جو برابر گناہ کرتے رہے مگر آخرِ عمر میں انہوں نے توبہ کرلی"۔ (تجلیاتِ حکمت صفحہ ۹۱)۔

یہاں ایک اور مسئلہ ہے اور وہ ہے گناہ کرنا اور پھر اس پر اصرار کرنا۔ اس کا بھی غلط مطلب نکالا گیا ہے یعنی بار بار گناہ کرنا۔ ہمارا تو دین، مذہب اور عقیدہ ہی یہ ہے کہ ہم کسی بھی بات کو اپنے ذہن سے طے نہیں کرتے بلکہ ہر معاملے میں معصومؑ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہی بات مولوی صاحبان کو بری لگتی ہے کیونکہ اس طرح ان کی چودھراہٹ پر زد پڑتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گناہ پر اصرار کرنا انسان کو برباد کر دیتا ہے۔ جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ ''اصرار کے ساتھ کوئی گناہ صغیرہ نہیں اور استغفار کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ نہیں''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۲۰۱)۔ یعنی اگر کسی معمولی گناہ پر بھی انسان اصرار کرے گا تو وہی چھوٹا گناہ اللہ کی نگاہ میں گناہِ کبیرہ بن جائے گا۔ لیکن اصرار کا مطلب کیا ہے؟۔ اس کا جواب اگرچہ گزشتہ فرمانِ معصومؑ میں دے دیا گیا ہے لیکن بالکل واضح جواب کیلئے ہم رجوع کرتے ہیں امام محمد باقرؑ کی طرف جو اسی کتاب کے اسی صفحے پر فرماتے ہیں۔ ''اصرار سے مراد یہ ہے کہ انسان گناہ کر کے اللہ سے مغفرت طلب نہ کرے اور اپنے دل میں توبہ کا خیال نہ لائے''۔

اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اعادۂ گناہ کی کوئی حدّ و انتہا بھی ہے یا نہیں؟۔ اور توبہ کا دروازہ کب بند ہوتا ہے؟۔ اس کا جواب ہم اپنے مولا امیرالمومنینؑ سے دریافت کرتے ہیں جو تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۲۱۷ پر اس طرح درج ہے:۔

امیرالمومنینؑ سے کسی نے پوچھا کہ اگر کوئی شخص توبہ کر کے پھر گناہ کرے اور پھر توبہ

کرے تو اس کا کیا بنے گا؟۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''اللہ اسے معاف کردے گا''۔ سائل نے کہا کہ کتنی بار انسان کیلئے توبہ کی گنجائش موجود ہے؟۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''جب تک شیطان آزاد ہے اس وقت تک توبہ کی گنجائش موجود ہے''۔

یہ تمام باتیں ہم نے اس لئے تحریر کی ہیں کہ توبہ کے بارے میں ہمارے قارئین ایک شفاف نظریہ اپنا سکیں اور شیاطین کے جھوٹے ڈراوے میں نہ آئیں۔ لیکن ہر مومن کو اس بات سے واقف ہونا چاہیئے کہ گناہ اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اللہ معاف کردے تو یہ اس کی رحیمیت کی دلیل ہے، نہ یہ کہ اسے ایک کھلی چھٹی تصور کیا جائے۔

شفاعت

یہ ایک اہم موضوع ہے اور ہمیں یقین ہے کہ آپ پہلی بار اس کی حقیقت کا ادراک فرمائیں گے کیونکہ شفاعت اگرچہ مذہب شیعہ کے بنیادی عقائد میں سے ایک ہے لیکن اس کا صحیح تصور آج تک دھندلا ہے۔ پہلی الجھن تو خود اس لفظ کے مفہوم میں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ شفاعت کے معنی سفارش کے ہیں حالانکہ اس کے حقیقی معنی ہیں ''اپنا حصہ لے لینا''۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ فلسفۂ اطاعت و گناہ، ثواب و عقاب، نجات و ہلاکت اور جنت و جہنم کو صحیح طور پر سمجھا جائے۔ ہمارے اکثر علماء نے عامیانہ روش پر چلتے ہوئے وہی نظریہ اختیار کیا جو تمام ادیانِ عالم میں پہلے سے پھیلا

ہوا ہے اور جس پر ہمارے مسلمان بھائی بھی سختی سے کاربند ہیں۔ ان لوگوں نے جنت و جہنم کو اعمالِ ظاہری سے منسلک کر دیا ہے۔ ہم نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "انسان کو زیادہ پیچیدگی میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا فرض صرف اتنا ہے کہ کلمہ پڑھے اور پھر نماز روزے میں لگ جائے"۔ اس طرح دوسرے ادیان کی طرح اسلام کو بھی پوجا پاٹ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ ہم پہلے بھی کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ اعمالِ ظاہری کا جنت و جہنم سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا پہلا مقصد تو انسان کی تربیت کرنا اور اسے ایک خاص ڈسپلن کا پابند بنانا ہے۔ جیسا کہ امیرؑالمومنین نے فرمایا ہے کہ "شریعت نفس کی ریاضت ہے"۔ اس طرح جب افراد کی اصلاح ہوگی تو معاشرہ بھی خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ دوسرا مقصد پورے معاشرے کو ایک معاشرتی فریم ورک میں کام کرنے کا عادی بنانا ہے تاکہ لوگ امن و امان سے زندگی گزار سکیں اور دنیا میں فتنہ و فساد برپا نہ ہو۔ اسی لئے قوانینِ شریعت بھی دو اقسام پر مشتمل ہیں۔ انفرادی قوانین اور اجتماعی قوانین۔ اور یہ قوانین سب کیلئے ہیں چاہے وہ مومن ہو، منافق ہو، ناصبی ہو یا خارجی۔ اللہ نے قرآن میں نماز روزہ حج اور زکوٰۃ کے جو احکام دیئے ہیں وہ عام ہیں اسی طرح اجتماعی احکام بھی کسی خاص طبقے تک محدود نہیں۔ احکام کا یہ عموم خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا کوئی تعلق آخرت سے نہیں بلکہ ان کا مقصد دنیاوی اصلاح ہے۔ اگر ان کا تعلق آخرت سے ہوتا تو ہر نماز پڑھنے والے، ہر روزہ رکھنے والے اور زکوٰۃ دینے والے پر جنت واجب ہو جاتی۔ لیکن حقیقت اس

کے برعکس ہے۔

حقیقتِ نجات صرف اتنی ہے کہ پوری کائنات میں دو کیمپ لگے ہوئے ہیں۔ ایک علیؑ کی محبت کا کیمپ اور دوسرا علیؑ کی دشمنی کا کیمپ۔ جو علیؑ کی محبت کے کیمپ میں ہے وہ مومن بھی ہے، حلالی بھی ہے اور جنّتی بھی۔ اور جو علیؑ کی دشمنی کے کیمپ میں ہے وہ کافر و منافق بھی ہے، حرامی بھی ہے اور جہنّمی بھی۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہ ہماری ذاتی رائے نہیں بلکہ یہ پورا نظریہ قرآن و احادیث سے ماخوذ ہے جسے ہم اپنی کتابوں میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں اور اس موقعے پر ان تمام باتوں کا اعادہ نہ تو ہمارے لئے ممکن ہے اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ہے۔

جب ہمیں وہ پیمانہ معلوم ہو گیا جس پر اللہ نے انسانوں کو دو گرہوں میں تقسیم کیا ہے تو اب ہمیں شفاعت کے اس نظریے پر بھی نظرِ ثانی کرنا پڑے گی جو زبان زدِ خاص و عام ہے یا پھر آپ اسے ہماری کم علمی کہیئے کہ ہم نے آج تک کسی بھی عالم کی زبان یا قلم سے شفاعت کا صحیح مفہوم نہیں سنا۔ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ شفاعت ان لوگوں کی ہوگی جن سے فروعی اعمال میں کوتاہی ہوئی ہوگی۔ جس شخص کے عقیدے میں کوئی کمی رہ گئی ہو اس کی شفاعت نہیں ہو سکتی۔ یہ بات مذہبِ شیعہ کی روح کے خلاف ہے۔ آپ ہمیں صرف اتنا بتایئے کہ کیا اللہ کے رسولؐ نے، جو شافعِ محشر ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ **"مَن مات علٰی حبِّ آلِ محمدٍ مات تائبا"**۔ یعنی جو شخص آلِ محمدؐ

کی محبت پر مراوہ توبہ کیا ہوا مرا۔ اور جب وہ توبہ کر کے مرا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس کے ذمے کوئی گناہ نہیں رہا کیونکہ معصومؑ نے فرمایا ہے کہ توبہ کرنے کے بعد مومن ایسا ہو جاتا ہے کہ جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ تو جب اس کے ذمے کوئی گناہ رہا ہی نہیں تو پھر شفاعت کس چیز کی ہوگی؟۔ یہ بات ہمارے اندر یہ تحریک بھی پیدا کرتی ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ وہ چیز کون سی ہے جو انسان کو شفاعت کا مستحق بناتی ہے؟۔

سب سے پہلے اس بات کو سمجھنا چاہیئے کہ آخر شفاعت کی ضرورت کیا ہے؟، آخر شفاعت کا مقصد کیا ہے؟ اور اگر شفاعت نہ ہوئی تو کیا ہوگا؟۔ عقل ان باتوں کا یہ جواب دیتی ہے کہ شفاعت کا مقصد جہنم سے نجات دلانا ہے اور اگر کوئی شفاعت سے محروم رہا تو اسے جہنم میں جانے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی اور یہی بات روایات و احادیث سے ثابت ہوتی ہے۔ جب یہ طے ہو گیا تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ شفاعت اس چیز میں ہوگی جو جہنم میں لے جانے والی ہے۔ اگر اعمالِ ظاہری کیوجہ سے انسان مستحقِ جنت ہو جایا کرتا تو ہم بھی مان لیتے کہ شفاعت انہی چیزوں میں ہوگی۔ لیکن استحقاقِ جنت تو عقیدے اور ایمان کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے تو پھر شفاعت بھی عقیدے اور ایمان میں کوتاہی کیوجہ سے ہوگی کیونکہ یہی کوتاہی انسان کو جہنم میں لے جانے والی ہے۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۵ صفحہ ۷۱۳ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

''ایمان کے اضافے کیوجہ سے اہلِ ایمان کے درجات میں فرق ہوتا ہے اور ایمان میں کمی کی وجہ سے لوگ دوزخ میں جائیں گے''۔

بات یہ ہے کہ ایمان ایک بہت وسیع لفظ ہے اور اس کے بے شمار درجات ہیں لیکن ایمان کا وزن معرفت کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اور اس کے درجات بھی معرفت ہی طے کرتی ہے۔اسی لئے رسولؐ اللہ نے بھی معرفتِ امامؑ کو شرطِ ایمان قرار دیا ہے۔کوتاہی معرفت میں ہوتی ہے اور اسی کوتاہی کو پورا کرنے کیلئے شفاعت کی جائے گی اور جو چیز انسان کے اندر شفاعت کا استحقاق پیدا کرتی ہے وہ محبتِ اہلبیتؑ ہے کیونکہ محبت وہ عظیم قوت ہے جو بڑی سے بڑی کمی کو پورا کر دیتی ہے جیسا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''علیؑ کی محبت وہ نیکی ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا اور علیؑ کی دشمنی وہ برائی ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی''۔نیز آپؐ ہی کا ارشاد ہے کہ ''علی کی محبت گناہوں کو ایسے کھا جاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو''۔ محبت کی یہی عظیم الشان قوت ہے جو بعض اوقات ایمان کی شرط کو بھی ساقط کر دیتی ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو غیر مسلموں کی شفاعت ممکن نہ ہوتی جبکہ ارشاداتِ معصومینؑ سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے غیر مسلموں کی بھی شفاعت کی جائے گی۔یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کی جارہی ہے، باقی ہم آپ کی تحقیق و تجسس پر چھوڑتے ہیں۔

القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۱۸۲۔

''ایک شخص یوسف بن یعقوب جو مذہب کے اعتبار سے عیسائی تھا، امام علی نقیؑ سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن اپنی معاشرتی مجبوریوں کی وجہ سے اسلام نہیں لا سکا تھا۔ امامؑ نے اس سے فرمایا۔ ''اے یوسف! کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہماری دوستی اور محبت تجھ جیسے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ لیکن خدا کی قسم یہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ ہماری دوستی اور محبت تجھ جیسے لوگوں کو بھی ضرور ضرور فائدہ دے گی''۔

مقامِ محمود

یہ لفظ بھی ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم اس کے بارے میں بھی ایک مختصر گفتگو کرلیں؟۔ ٹی وی پر اذان کے بعد ایک دعا نشر کی جاتی ہے جسمیں کہا گیا ہے کہ ''اے اللہ! اپنے رسولؐ کو اُس مقامِ محمود پر پہنچا دے جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے''۔ اس پر بہت سے خوش عقیدہ لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں بلکہ اس جملے کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بہت سے خطباء بھی منبروں سے اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''کیا رسولؐ اللہ ابھی تک مقامِ محمود پر پہنچے ہی نہیں؟۔ اور کیا وہ ہماری دعاؤں سے وہاں پہنچیں گے؟''۔ ان تمام غلط فہمیوں کی بنیاد محض لاعلمی ہے اور اس لاعلمی کا ازالہ ضروری ہے۔ جہاں تک دعا کا تعلق ہے تو محمدؐ و آلِ محمدؐ کیلئے دعا کرنا ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ اس کا یہ مطلب نکالنا کہ (معاذ اللہ) یہ ہستیاںؑ ہماری دعاؤں کی محتاج ہیں، بالکل غلط ہے۔ بلکہ یہ صرف اپنی محبت کا اظہار ہے کیونکہ انسان جس

سے محبت کرتا ہے اس کیلئے دن رات دعائیں مانگتا ہے۔ہم اپنے امامِ زمانہ کیلئے کیا کیا دعائیں نہیں مانگتے ؟۔تو کیا وہؑ (معاذ اللہ) ہماری دعاؤں کے محتاج ہیں؟۔ ہم صبح و شام محمدؐ وآلِ محمدؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ درود بھی ایک دعا ہے۔تو کیا وہ ہماری دعا کے محتاج ہیں؟۔لہٰذا اس غلط فہمی کو تو دور ہو جانا چاہیئے کیونکہ کئی معصومینؑ نے یہ دعا مانگی ہے اور ہمیں بھی یہ دعا تعلیم کی ہے جس کی چند مثالیں اس مقام پر پیش کی جارہی ہیں۔

۱۔ بحارالانوار ج ۱۱ صفحہ ۵۳۰ پر حضرتِ صاحب الزمانؑ کی ایک توقیعِ مبارکہ موجود ہے جس میں آپؑ نے رسولؐ اللہ پر درود بھیجنے کا طریقہ تعلیم دیا ہے۔اس میں آپؑ فرماتے ہیں۔''اے (اللہ) ان کو (رسولؐ اللہ کو) عطا فرما فضل اور فضیلت اور درجہ اور بلند وسیلہ اور ان کو مقامِ محمود پر مبعوث کر دے جس پر اوّلین و آخرین رشک کریں''۔

۲۔ مفاتیح الجنان (ترجمہ حافظ سید ریاض حسین) صفحہ ۱۲۲ پر بھی یہی دعا درج ہے۔ ''خدایا ان (رسولؐ اللہ) کو فضل و فضیلت اور وسیلہ عطا فرما اور درجۂ بلند عطا فرما اور انہیں اُس مقامِ محمود پر فائز کر کہ جس کیلئے اوّلین و آخرین انؐ پر رشک کریں''۔

اس دعا کا وجود تو بہر حال ثابت ہے اور اس کا ماخذ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۹ ہے جسمیں ارشاد ہوتا ہے۔ ''کچھ عجب نہیں کہ تمھارا رب تمھیں مقامِ محمود پر فائز کردے''۔اس آیت کی جتنی بھی تفاسیر ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقامِ محمود سے مراد مقامِ شفاعتِ کبریٰ ہے اور اس کا تعلق یومِ قیامت سے ہے لہٰذا وہی دن ہوگا جب آنحضرتؐ کو مقامِ محمود پر فائز کیا جائے گا اور آپ اس قدر شفاعت فرمائیں گے

کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یعنی آدمؑ سے لے کر قیامت تک جتنے بھی محبانِ اہلبیتؑ ہوں گے ان سب کو باقی لوگوں سے جدا کر کے فرمائیں گے کہ پروردگار! یہ تیری مخلوق میں میرا حصّہ ہے۔ میری حُرمت وعزت کی وجہ سے ان کو بخش دے۔ اور اللہ تعالیٰ انؐ کی شفاعت کو قبول کرتے ہوئے ان سب کو بخش دے گا چاہے انہوں نے کسی بھی حال میں زندگی گزاری ہو۔ مقامِ محمود کے بارے میں اب ہم تفاسیرِ معصومینؑ پیش کرتے ہیں تا کہ ہماری بات کی تصدیق ہو جائے۔ یہ تمام تفاسیر ہم نے تفسیرِ نورالثقلین ج ۵ سے اخذ کی ہیں۔

۱۔ صفحہ ۲۶۳۔ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔ ''پھر اہلِ محشر ایک اور مقام پر جمع ہوں گے۔ اس میں حضرتِ محمدِ مصطفٰیؐ کا منبر ہو گا اور وہی مقامِ محمود ہے۔ آپؐ اللہ تعالیٰ کی ایسی ثناء کریں گے کہ اس جیسی ثناء کسی نے نہ کی ہو گی۔ اس کے بعد آپؐ مومنین و مومنات کی شفاعت کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مقام کے متعلق کہا ہے کہ ''کچھ عجب نہیں کہ تمھارا رب تمھیں مقامِ محمود پر فائز کر دے''۔

۲۔ ۲۶۴۔ امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔ ''جب قیامت کا دن ہو گا تو ایک منادی رسولؐ اللہ کو آواز دے کر کہے گا۔ ''یا رسولؐ اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپؐ اور آپؐ کے خاندان کے حُب داروں، جو لوگوں سے محبت وعداوت اہلِ بیتؑ کی وجہ سے رکھتے تھے، کے لئے عظیم جزاء تیار کی ہے۔ اب آپ جسے چاہیں انہیں ان کی نیکی کا بدلہ دیں''۔ اس وقت رسولِ

مقبول فرمائیں گے۔ ''پروردگار! انہیں جنت عطا فرما''۔ ندائے قدرت آئے گی کہ ''آپؐ جنت میں جہاں چاہیں انہیں جگہ عنایت کریں''۔ چنانچہ یہ مقامِ محمود ہے، جس کا حبیبِ خدا سے وعدہ کیا گیا ہے''۔

۳۔ صفحہ ۲۶۸۔ صادقینؑ میں سے ایک بزرگوار سے منقول ہے کہ مقامِ محمود سے شفاعت مراد ہے۔

اس مطلب پر بہت سی احادیث موجود ہیں لیکن ہم نے صرف تین احادیث نقل کی ہیں تا کہ ہماری بات ثابت ہو سکے۔ بہر حال اس موقعے پر ہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ آنحضرتؐ جو شفاعت کریں گے وہ اگرچہ بہت وسیع ہو گی لیکن لامحدود نہیں ہو گی۔ اسی لئے ہم نے اس کے لئے ''شفاعتِ مطلقہ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ''شفاعتِ کبریٰ'' کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ اس شفاعت کو اللہ نے ''محبانِ اہلبیتؑ'' تک محدود رکھا ہے۔ دشمنانِ اہلبیتؑ کی شفاعت کا حق اللہ نے اپنے نبیؐ کو دیا ہی نہیں۔ مندرجہ بالا کتاب کے صفحہ ۲۶۴ سے خود رسولؐ اللہ کے دو ارشادات پیش کئے جا رہے ہیں جو ہماری بات پر دلیل ہیں۔

۱۔ رسولؐ اللہ نے مولا علیؑ سے فرمایا۔ ''میرے رب نے مجھے میری امت کے اہلِ توحید کیلئے شفاعت کا مالک بنایا ہے اور اس نے مجھے تیرے اور تیرے بعد تیری اولاد سے دشمنی رکھنے والوں کی شفاعت سے منع کیا ہے''۔ اس حدیث سے جہاں

ہماری بات ثابت ہوتی ہے وہیں یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ اللہ کی نگاہ میں دشمنانِ علیؑ اہلِ توحید نہیں ہیں بلکہ مشرک ہیں۔

۲۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔"جب میں مقامِ محمود پر فائز ہو جاؤں گا تو میں اپنی امت کے گناہانِ کبیرہ کرنے والوں کی شفاعت کروں گا۔(واضح رہے کہ گناہِ کبیرہ سے مراد حقِ اہلبیتؑ میں تقصیر کرنا ہے۔تفصیل کیلئے دیکھیے ہماری کتاب "کشف الاحکام")۔ اور میرا رب میری شفاعت کو قبول فرمائے گا۔ خدا کی قسم میں ایسے کسی شخص کی شفاعت نہیں کروں گا جس نے میری ذرّیت کو اذیّت دی ہوگی۔مقامِ محمود اس جگہ کا نام ہے جہاں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا"۔

بات بالکل واضح ہوگئی اور ہمیں یقین ہے کہ مقامِ محمود کے بارے میں اب کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا ہوگا۔

قبولیتِ عمل

اس ذیل میں ہم صرف دو باتوں کا ذکر کریں گے اور یہ ذکر اس لئے ضروری ہے تا کہ لوگ آنکھیں بند کرکے عمل نہ کریں بلکہ اس بات کا یقین حاصل کرلیں کہ ان کا عمل ایسا ہو جو بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبولیت بھی حاصل کرسکے اور اس کیلئے ان چیزوں کو جان لینا انتہائی ضروری ہے جو عمل کو برباد کردیتی ہیں۔یہ بات بہر حال پیش نظر رہنی چاہیئے کہ آیۂ مودّت کی رو سے محبتِ اہلبیتؑ ہر عمل کی شرطِ اوّل ہے اور جن دو چیزوں کا

ہم ذکر کریں گے ان کا تعلق بھی اسی محبت سے ہے یعنی یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے یا تو محبت ہی کالعدم قرار پاتی ہے یا پھر اس محبت کے فراموش ہو جانے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

ا۔حکمتِ بوتراب ج ا صفحہ ۲۲۸۔ جنابِ امیرؑالمومنین نے فرمایا۔

''عمل سارا غبار بن جاتا ہے مگر وہ جس میں اخلاص پایا جائے''۔

یہاں شرطِ قبولیتِ عمل اخلاص کو قرار دیا گیا ہے۔اخلاص کی ضد ریاء کاری ہے اور ریاء کاری کو قرآنِ مجید میں شرک کہا گیا ہے کیونکہ ریاء کاری کی صورت میں انسان اللہ کے ساتھ اپنے نفس کو شریک کرلیتا ہے لہٰذا قابلِ قبول عمل وہی ہوتا ہے جو خلوص کے ساتھ کیا جائے اور خلوص کیلئے تزکیۂ نفس ضروری ہوتا ہے۔ یعنی انسان اپنے نفس کو خواہشات کی آلائش سے پاک کرے۔ محبتِ اہلبیت کو ہر شے پر مقدم جانے اور شعوری طور پر خود کو اس منزل پر پہنچائے کہ اگر کوئی ایسا مرحلہ آجائے کہ محبتِ اہلبیتؑ اور ذاتی مفادات میں تصادم ہو رہا ہو تو انسان اس بات کیلئے ذہنی طور پر تیار ہو کہ اپنے مفادات کو قربان کر کے اہلبیتؑ کی محبت کا دامن تھامے رکھے چاہے اس میں اس کا ذاتی نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ یہ ایک مشکل کام ہے لیکن اگر انسان مسلسل جدوجہد کرتا رہے تو ایک دن ایسا ضرور آتا ہے جب وہ خود کو اس قربانی کیلئے تیار پاتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ اُس کے تھوڑے عمل کو بھی قبول فرماتا ہے اور بقولِ امیرؑ المومنین ''کیونکر تھوڑا ہو سکتا ہے وہ عمل جس کو اللہ قبول کرلے''۔

۲۔حکمتِ بوتراب ج ۲صفحہ ۱۸۴۔حضرتِ امیرالمومنین نے فرمایا۔

''غفلت اعمال اور مہلت کو فاسد کردیتی ہے اور امیدوں کو کاٹ دیتی ہے''۔

اس فرمان میں اعمال کے فاسد ہونے کی وجہ غفلت کو بتایا گیا ہے۔ یہ یاد رکھیئے کہ غفلت جمود کیوجہ سے پیدا ہوتی ہے اور جمود وہ کیفیت ہوتی ہے جب انسان کا سفرِ علم و معرفت رک جاتا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ جتنا وہ جانتا ہے یا جتنی معرفت وہ رکھتا ہے وہ اس کیلئے کافی ہے۔ یہ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی انسان کو لے ڈوبتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ اپنے مقصدِ حیات سے غافل ہوتا جاتا ہے اور اس کا انجام کفر پر ہوتا ہے۔ گناہوں سے اجتناب کی جو اس قدر تاکید کی گئی ہے اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اکثر گناہ ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو اہلبیتؑ کی طرف سے غافل کردیتے ہیں۔ گناہ تو معاف ہوسکتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں جو غفلت وجود میں آتی ہے وہ قابلِ معافی ہرگز نہیں ہے۔

حقیقتِ عمل

ہم نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ اعضاء وجوارح سے ظاہر ہونے والا عمل حقیقتاً اُس عمل کا آئینہ دار ہوتا ہے جو ایک تحریک کی صورت میں انسان کے اندر موجود ہوتا ہے اور وہی اصل عمل ہوتا ہے اور عملِ ظاہری کی حقیقت بھی۔ لہٰذا جب تک اس حقیقت کا علم نہ ہو اس وقت تک ظاہری عمل محض وقت گزاری تک محدود رہتا ہے اور اس سے

سوائے بے آرامی اور تھکن کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ایسا عمل انسان کو تباہی اور ہلاکت کے دہانے تک پہنچا دیتا ہے لہٰذا ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم یہ جانیں کہ عملِ ظاہری کرانے سے اللہ کا مقصد کیا ہے اور ایسے عمل کے ذریعے وہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ اور ہم یہ بات پورے اعتماد و وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہر عمل اور ہر نیکی کا مقصدِ اصلی انسان کے دل میں ولایت و معرفت و محبتِ اہلبیت کو پروان چڑھانا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو اہلبیت کے کیمپ میں لانا ہے۔ اگر وہ اس کیمپ میں آ گئے تو گویا وہ نیکیوں میں داخل ہو گئے۔ آپ یہ سوچیئے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کوئی بھی عمل نہ کرے پھر بھی وہ باعمل کہلائے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایک بھی نیکی نہ کرے پھر بھی نیکوکار کہلائے؟۔ ہاں! یہ ممکن ہے کیونکہ تمام نیکیوں کی حقیقت محبتِ اہلبیت ہے اور تمام برائیوں کی حقیقت دشمنیٔ اہلبیت ہے اور اس کی دلیل ہمیں سورۂ نمل کی آیات ۸۹،۹۰ سے ملتی ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے۔ ”جو ایک نیکی لایا پس اس کیلئے بہتر عوض ہے اور وہ اُس دن کے خوف سے امن والے ہوں گے۔ اور جو ایک برائی لایا پس وہ اوندھے منہ جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ کیا جو کچھ (عمل) تم کیا کرتے تھے اس کے سوا تمھیں کوئی اور بدلہ دیا جائے گا؟“۔

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ ہم سے بہت سی نیکیوں کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ صرف ایک نیکی چاہتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ ہم صرف ایک برائی سے اجتناب کرتے رہیں جو معاف ہونے والی نہیں۔ باقی برائیوں کو معاف کرنے کا اس نے وعدہ کیا ہوا ہے

اس لئے ہمارا فریضہ بن جاتا ہے کہ ہم اس ایک نیکی کو تلاش کریں جو تمام نیکیوں کا مجموعہ ہے اور اُس ایک برائی کو ڈھونڈیں جو تمام برائیوں کی اصل ہے۔

ینابیع المودۃ صفحہ ۱۶۱ پر امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔ "تمھیں ایک نیکی کے متعلق آگاہ کروں گا کہ اگر انسان اُس کو بجالائے گا تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ اور ایک برائی کے متعلق آگاہ کردوں کہ اگر انسان وہ برائی کرے گا تو اللہ اسے منھ کے بل آگ میں ڈالے گا اور اس برائی کے ہوتے ہوئے اس کا کوئی عمل قبول نہ کرے گا۔ نیکی سے مراد ہماری محبت ہے اور برائی سے مراد ہم سے بغض رکھنا ہے"۔

آپ کو نیکی اور گناہ کی اصل کا پتہ چل گیا اور اب ہم اسی اصل کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ ہم نے ایک سوال کیا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان بغیر عمل کئے باعمل ہوجائے؟۔ آپ یقین کریں اگر انسان کے دل میں تخمِ محبتِ اہلبیتؑ جڑ پکڑ لے تو یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور اسے کوئی آسان کام مت سمجھیئے کیونکہ محبت میں انسان کو بڑے پتھر کھانے پڑتے ہیں اور محبت میں جو اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں انہیں وہی جان سکتا ہے جس نے محبت کی ہو۔ تماش بینوں کو اس کا احساس نہیں ہوا کرتا۔

معانی الاخبار صفحہ ۴۴۱۔ حدیث ۴۰۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

"بے شک تم میں سے ایسا شخص بھی ہے کہ جس کا نامۂ اعمال بغیر کوئی عمل کئے ہوئے پُر ہوگا"۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟۔ آپؑ نے فرمایا۔ "وہ شخص

ایک گروہ کے پاس سے گزرے گا جو ہمارے بارے میں نامناسب باتیں کرتے ہیں۔تو جب وہ لوگ اسے دیکھیں گے تو اُن میں سے کچھ دوسروں سے کہیں گے کہ بیشک یہ شخص اُن (اہلبیتؑ) کے شیعوں میں سے ہے۔اور جب ان کے پاس سے ہمارے شیعوں میں سے وہ شخص گزرے گا تو وہ اسے ماریں گے اوراس کو برا بھلا کہیں گے تو اللہ اس وجہ سے اتنی نیکیاں لکھے گا کہ اس کا نامۂ اعمال بغیر عمل کئے پُر ہوجائے گا''۔اسی لئے رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''بے شک علیؑ کی محبت اعمال کی سردار ہے''۔(القطرۃ من بحارج اصفحہ۲۹۰)۔لہٰذا جو عقلمند ہوتے ہیں وہ سردار کا دامن تھامتے ہیں اور جو بے وقوف ہوتے ہیں وہ سردار کو چھوڑ کر رعایا کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔اور نتیجے میں ان کو ملتا کیا ہے؟۔اس بات کو امیرالمومنینؑ نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔''خدا کی قسم اگر انسان سجدے کرتا جائے یہاں تک کہ اس کی گردن منقطع ہوجائے تب بھی اللہ اس کے کسی عمل کو قبول نہ کرے گا مگر ہم اہلبیتؑ کی ولایت کے ساتھ''۔

جو لوگ اہلِ ولایہ ہیں وہ بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے لیکن یہاں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے سامنے قرآن کی کوئی آیت یا معصومؑ کا کوئی فرمان پیش کیا جائے تو وہ ہزار قسم کی حیل وحجت کرتے ہیں اوراس وقت تک بات کو نہیں مانتے جب تک ان کے سامنے کسی غیر معصوم کا قول نہ بیان کردیا جائے۔ہمارا مقصد ایسے لوگوں سے منوانا تو نہیں ہے لیکن محض ان پر حجت قائم کرنے کیلئے ان کا مطالبہ بھی پورا کئے

دیتے ہیں۔ یہ واقعہ ہم القطرۃ من بحارج اصفحہ ۳۵۲ سے نقل کرر ہے ہیں اور یہ واضح رہنا چاہیئے کہ القطرہ کے مؤلف جناب احمد مستنبط بہت بڑے مجتہد تھے اور لفظِ ''آیت اللہ'' ان کے نام کا سابقہ بنا ہوا ہے۔

''محدّثِ نوری کتاب دارالسلام میں سید نعمت اللہ جزائری سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے ایک عالم کو خواب میں دیکھا جو ایک خوبصورت شکل وقیافہ کے ساتھ امامؑ (مولا امیرؑالمومنین) کی قبر کی زیارت کر کے نکل رہا تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ کس عمل نے آپ کو اِس مقام ومرتبے تک پہنچایا ہے؟۔ میری بھی رہنمائی فرمائیں تاکہ میں بھی اس عمل کو انجام دوں۔ اُس عالم نے فرمایا۔ ''ہمارے وہ اعمال جن کا آپ مشاہدہ کیا کرتے تھے، ان کی یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ جس چیز نے ہمیں فائدہ پہنچایا اور اِس مقام تک پہنچایا جس کا آپ نے مشاہدہ کیا ہے وہ اِس قبر والے آقا امیرؑالمومنین کی محبت اور معرفت ہے''۔

حقیقتِ عمل ہم نے آپ تک پہنچادی۔ ہم نے انتہائی اختصار سے کام لیا ہے اور صرف اتنا بیان کیا ہے جو تفہیمِ مطلب کیلئے کافی ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ عملِ خیر صرف محبت و معرفتِ اہلبیتؑ کا نام ہے اور یہی مطلوب ومقصودِ خداوندی ہے اور اسی پر انسان کی نجات کا دارومدار ہے اور یہی بات امیرؑالمومنین نے بیان فرمائی ہے کہ ''ہم اللہ کی وہ نعمت ہیں جو اس نے اپنے بندوں پر کی ہے اور قیامت کے دن کامیابی حاصل کرنے

والا ہماری وجہ سے ہی کامیابی حاصل کرے گا"۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج۳ صفحہ ۵۸۹)۔ پس ہماری یہی پکار ہے اور یہی دعوت ہے کہ اے بندگانِ خدا! خیمۂ اہلبیتؑ میں آجاؤ کیونکہ جو بھی اس خیمے میں داخل ہوگیا اسے امان مل گئی۔ یہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون عالم ہے اور کون جاہل، کون خوش عمل ہے اور کون بدعمل، کون گورا ہے اور کون کالا۔ یہ وہ دریائے رحمت وطہارت ہے کہ جو شے اس میں چلی گئی وہ پاک ہوگئی اور گناہوں سے دُھل گئی۔ جتنے بھی نیک اعمال ہیں وہ چشموں کیطرح ہیں جو اسی دریا میں آکر گرتے ہیں۔

عبادت

بات عمل ہی کی ہورہی ہے لیکن اب ہم عمل کے اُس پہلو کیطرف آتے ہیں جو نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ دنیا کی تمام اقوام میں "پوجا پاٹ" کے طور پر جانا جاتا ہے اور اس اعتبار سے مسلمانوں اور دیگر اقوام میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا کیونکہ طریقے جدا جدا سہی لیکن مقصد سب کا ایک ہے اور وہ ہے اپنے نفس کو تسکین پہنچانا اور زندگی کے غموں، دکھوں اور مصیبتوں سے فرار حاصل کرنا۔ یا پھر ایک امیدِ موہوم کے پیچھے بھاگنا کہ شاید اِن حرکات وسکنات کی وجہ سے آخرت میں کچھ بچت ہو جائے۔ اصل بات لوگوں کی سمجھ میں آئی ہی نہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اس بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے کیونکہ ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ دنیا کے مزے بھی لوٹیں اور آخرت کے بھی

امیدوار رہیں۔محبت کی کٹھنائیاں کون جھیلے!

مفہومِ عبادت

عبادت ہاتھ پاؤں چلانے، کھڑے ہونے، جھکنے، بیٹھنے، بھوکا پیاسا رہنے اور دو پہاڑوں کے درمیان دوڑنے بھاگنے کا نام نہیں ہے بلکہ اطاعتِ مطلقہ کا نام ہے۔عمل کی نوعیت چاہے کچھ بھی ہو لیکن اُس کی قدر اور قیمت اِس بات سے طے کی جاتی ہے کہ وہ عمل کس کی اطاعت میں کیا جا رہا ہے؟۔جیسا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''جب شیطان کی اطاعت کی جاتی ہے تو وہ دراصل اس کی عبادت شمار ہوتی ہے''۔ (تفسیرِ نورالثقلین ج۳صفحہ۴۷)۔اطاعت ہی عبادت کی روح اور اس کا اصل مفہوم ہے۔غضب یہ ہوا کہ اصل روح کو نکال کر چند حرکات وسکنات کو ہی عبادت قرار دے دیا گیا اور اب حال یہ ہے کہ لوگوں کو احکامِ خدا ورسولؐ وائمہؑ طاہرین کا خیال تک نہیں آتا اور وہ ہر عمل کیلئے غیرِ معصوم کے حکم کیطرف دیکھتے ہیں۔ اطاعت وہ کسی اور کی کرتے ہیں اور گمان یہ کرتے ہیں کہ اللہ کی عبادت ہو رہی ہے اور یہ عبادت کے مفہوم کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔اس بات کی وضاحت کیلئے ہم تین احادیث پیش کر رہے ہیں۔ پہلی حدیث تفسیرِ نورالثقلین ج۴صفحہ۱۷۲ سے اور دوسری اور تیسری احادیث معانی الاخبار صفحہ۱۴۴ سے اخذ کی گئی ہیں۔

۱۔امام جعفرصادقؑ نے فرمایا۔''جو بھی عبادت غیراللہ کی رضا کے لئے سرانجام دی

جائے گی وہ رائیگاں چلی جائے گی"۔

۲۔ امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ سب سے اندھا شخص کون ہے؟۔ آپؑ نے فرمایا۔ "وہ شخص جو کسی غیرِ خدا کے لئے کسی عمل کو انجام دے اور پھر اللہ سے اپنے عمل کی جزاء کا طالب ہو"۔

۳۔ امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ بدبخت ترین مخلوق کون سی ہے؟۔ آپؑ نے فرمایا۔ وہ شخص جو کسی غیر کی دنیا کی خاطر اپنے دین کو بیچ ڈالے"۔ اس حدیث کی صداقت کو پہچاننے کیلئے آپ اپنے اردگرد نظر دوڑائیں گے تو آپ خود دیکھ لیں گے کہ حکومت واقتدار کے مزے کوئی اور لوٹ رہا ہے اور بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ کی مصداق بغلیں پاکستان میں بجائی جاتی ہیں اور ان کی حمایت میں معصومینؑ کو جھٹلایا جاتا ہے۔ یہ ان کی دنیا کی خاطر اپنا دین بیچنا نہیں تو اور کیا ہے؟۔

پس عبادت وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں کی جائے نہ کہ اپنے نفس کو خوش کرنے کیلئے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں عبادت کا وہی مفہوم رائج کر دیا گیا ہے جو شیطان نے ایجاد کیا تھا جیسا کہ تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۳۳۶ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "جب اللہ نے سجدۂ آدمؑ کا حکم دیا تو ابلیس نے کہا کہ خدایا! مجھے آدمؑ کے سجدے سے معذور رکھ اور میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کے بدلے تیری اتنی عبادت کروں گا کہ کسی نے اتنی زیادہ عبادت نہیں کی ہوگی"۔ غالبًا یہی مطالبہ ہمارے عبادت گزار

دوستوں کا بھی ہے کہ پروردگار! ہمیں درِ اہلبیتؑ پر جھکنے سے معذور رکھ، اس کے علاوہ جو کچھ تو چاہے وہ ہم کرنے کو تیار ہیں۔لیکن اللہ نے نہ تو شیطان کو اس معاملے میں کوئی رعایت دی تھی اور نہ ان لوگوں کو اس قسم کی کوئی چھوٹ مل سکتی ہے کیونکہ اللہ نے عبادت کا اصل مکلّف دل کو بنایا ہے۔اصل عبادت دل کرتا ہے جسے ذکرِ خفی کہتے ہیں۔ہاتھ پاؤں جو حرکات کرتے ہیں اسے ذکرِ جلی کہا جاتا ہے اور یہ فقط ایک صورتِ اظہار ہے ورنہ اصل کام دل ہی کرتا ہے اور اس کے بارے میں امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے کہ ''ہر وہ نفس جو ذکرِ خفی میں مشغول ہے وہ زندہ ہے اور ہر وہ نفس جو ذکرِ خفی سے غافل ہے وہ مردہ ہے''۔اور آپؑ ہی کا ارشاد ہے کہ ''آنکھوں کی بیداری دلوں کی غفلت کے ساتھ کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی''۔

شرفِ انسانیت یہ ہے کہ وہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اس کے ہر پہلو پر غور ضرور کرتا ہے، اندھا دُھند کوئی کام نہیں کرتا۔عبادت سے پہلے بھی سوچنا سمجھنا ایک لازمی امر ہے اور سمجھ بوجھ کے بغیر کوئی عبادت، عبادت نہیں کہلائی جاسکتی۔یہ میرا قول نہیں بلکہ امام زین العابدینؑ کا فرمان ہے اور امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے کہ ''اس عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں غور و فکر نہ ہو''۔اور امام حسن عسکریؑ کا ارشاد ہے کہ ''عبادت زیادہ روزے رکھنے اور نمازیں پڑھنے کا نام نہیں ہے بلکہ عبادت نام ہے امورِ الٰہی میں زیادہ غور و فکر کرنے کا''۔(القطرۃ من بحار ج۲ صفحہ ۴۳۰)۔امور

جمع ہے امر کی اور امر کے بارے میں آپ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ اس سے مراد میرے مولا امیرؑالمومنین ہیں۔ پس حقیقی عبادت خصائص و ولایتِ امیرؑالمومنین میں غور وتدبّر کرنا اور اپنی معرفت میں اضافہ کرنا ہے۔ اور جتنی بھی عبادتِ ظاہری ہیں ان تمام کا مقصد یہی ہے کہ انسان ولایتِ علیؑ کی طرف متوجہ ہو۔ جب متوجہ ہوگا تو خالص ہو جائے گا۔ جب خالص ہو جائے گا تو ساری دنیا سے کٹ جائے گا اور تنہا ہو جائے گا۔ جب تنہا ہو جائے گا تو پھر اپنے محبوب سے باتیں کرے گا۔ اسی کا نام ذکرِ خفی ہے۔ ذکرِ جلی چونکہ ذکرِ خفی کا مقامِ اظہار ہے اسلئے لازم ہے کہ وہاں بھی انسان کا محبوب اس کے روبرو ہو۔ کعبے کی طرف رخ کرانے سے اللہ کا مقصد یہی ہے کہ انسان اپنے محبوب کی طرف متوجہ ہو جائے کیونکہ توجہ کا مطلب ہے چہرے کے مقابل چہرہ لانا۔ زیارتِ جامعہ کبیرہ کا ایک جملہ ہے جس کو اگر آپ نے سمجھ لیا تو پورا فلسفۂ عبادت سمجھ میں آ جائے گا۔ اس جملے میں آپ کہتے ہیں۔ ''نماز کے اوقات میں آپؑ ہمارے سامنے ہوتے ہیں''۔ (القطرۃ من بحار ج ا صفحہ ٦٦)۔ گویا اپنے محبوبِ حقیقی کا تصور کرنا ہی اصلِ عبادت ہے اور یہی عبادت ہے جس کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے اور معصومینؑ نے جس کی تاکید کی ہے۔

ا۔ القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۶۹، ۷۰۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''ہر عبادت سے افضل ایک عبادت ہوتی ہے اور ہم

اہلبیتؑ کی محبت تمام عبادات سے افضل ترین ہے اور امیرؑ المومنین کی محبت تمام اعمال کی سردار ہے۔ ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے اور اسلام کی بنیاد ہماری محبت ہے"۔

۲۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔" آلِ محمدؐ کے ساتھ ایک دن کی محبت ایک سال کی عبادت سے افضل ہے"۔(القطرۃ من بحارج ا صفحہ ۸۹)

۳۔"ابوعمرو النہسلی زاہد شب زندہ دار اور تہجد گزار تھے۔ وہ اکثر اپنے احباب سے فرمایا کرتے تھے کہ نصرتِ امام حسینؑ کرنا بہترین عبادت ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسری عبادت نہیں ہے"۔(ریاض القدس ج ۲ صفحہ ۶۵۹)۔

۴۔"حضرتِ شبیب شاکری فرماتے تھے کہ نصرتِ حسینؑ سے بڑھکر کوئی عملِ خیر نہیں"۔(ریاض القدس ج ۲ صفحہ ۶۵۹)۔

یہ واضح رہے کہ نصرت صرف تلوار سے ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ زبان اور قلم سے بھی ہوتی ہے، غم حسینؑ میں گریہ کرنے سے بھی ہوتی ہے اور سینے پر ہاتھ مار کر بھی ہوتی ہے۔ نصرت حسینؑ سے جو بھی غافل ہوا یا اس سے کراہت کا اظہار کیا یا اس میں کوئی رکاوٹ ڈالی یا اس کو سبک سمجھا تو اُس نے اپنی ہر عبادت پر پانی پھیر دیا۔

مصیبت یہ ہے کہ لوگوں میں اپنے مذہب کو سمجھنے کی سرے سے کوئی خواہش ہی نہیں ہے ورنہ جو بات ہم نے عرض کی ہے وہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات تو بچے بچے کو معلوم ہونی چاہیئے کہ ہر عبادت کی حقیقت اور اس کا مقصدِ اصلی محبتِ اہلبیتؑ ہے۔

اذان کیا ہے؟: اس میں نماز کو تین ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ صلوٰۃ، فلاح اور خیر العمل اور امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے کہ صلوٰۃ بھی میں ہوں، فلاح بھی میں اور خیر العمل بھی میں ہوں۔ اس طرح جب لوگوں کو نماز کی طرف بلایا جاتا ہے تو حقیقتاً مولا امیر المومنینؑ کی طرف بلایا جاتا ہے۔

اقامت کیا ہے؟: اس بارے میں جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "**قدقامة الصلوٰة** کے معنی اور مراد حضرتِ قائمؑ کا قیام ہے"۔ (القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۸۹)۔

نماز کیا ہے؟: امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "صلوٰۃ سے رسولؐ اللہ، امیر المومنینؑ، جنابِ سیدہؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ مراد ہیں اور صلوٰۃِ وسطا امیر المومنینؑ ہیں۔ **وَ قوموا لِلّٰہِ قانتین** کا باطن یہ ہے کہ آئمہؑ کے اطاعت گزار بن کر کھڑے رہو"۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ا صفحہ ۲۷۰)۔

روزہ کیا ہے؟: امامِ رضاؑ نے فرمایا۔ "روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان بھوک پیاس برداشت کر کے معرفت کے درجات طے کرے"۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ا صفحہ ۳۲۶)

اعتکاف کیا ہے؟: امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "اعتکاف ایسی جامع مسجد میں کرنا چاہیئے جہاں امامِ عادل نے جماعت کرائی ہو۔ مثلاً مسجدِ کوفہ، مسجدِ بصرہ، مسجدِ مدینہ اور مسجدِ مکہ"۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ا صفحہ ۳۴۵)۔

حج کیا ہے؟: امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "حج کی تکمیل امامؑ کی ملاقات سے ہوتی ہے۔

لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ شہر کے بنے ہوئے گھر کا طواف کریں پھر ہمارے پاس آئیں اور اپنی ولایت کی ہمیں اطلاع دیں اور اپنی نصرت ہمارے سامنے پیش کریں''۔(عیونِ اخبارالرضاؑ۔حصہ دوم صفحہ ۵۶۱)۔

زکوٰۃ کیا ہے؟:امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔''زکوٰۃ سے مراد ائمہؑ کی منزلت و مقام کا اقرار ہے اور یہی اللہ کا دینِ قیّم ہے''۔(نہج الاسرار ج ۱صفحہ ۸۷)۔

غرض تمام عبادات کی حقیقت یہی معصوم ہستیاں ہیں جیسا کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔''اے داؤد! کتابِ خدا میں نماز سے مراد ہم ہیں، زکوٰۃ ہم ہیں، روزہ ہم ہیں، حج ہم ہیں، شہرِ حرام ہم ہیں، کعبۃ اللہ ہم ہیں، قبلۃ اللہ ہم ہیں کہ جس کے بارے میں اللہ فرماتا ہے''تم جہاں بھی منہ کرو ادھر اللہ کا چہرہ ہے''۔آیات ہم ہیں اور بیّنات یعنی نشانیاں اور دلائل ہم ہیں''۔(القطرۃ من بحار ج ۲صفحہ ۸۹)۔اگر اِن مقدس ہستیوں کے علاوہ کسی اور شے کا تصور کرکے عبادت کی جائے گی تو وہ وہی عبادت ہوگی جسے روزِ قیامت غبار بنا کر اُڑا دیا جائے گا۔کیونکہ جیسا کہ عرض کیا جاچکا کہ عبادت کا مطلب اطاعت ہوتا ہے اور اطاعت کا مفہوم ہی اہلبیتؑ کی معرفت اور اُن سے محبت ہے۔اگر یہ نہیں ہے تو پھر کوئی شے بھی عبادت کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہے۔اِس فرق کو رسولؐ اللہ نے کھل کر بیان کر دیا ہے۔معانی الاخبار صفحہ ۲۴۶پر آپؐ فرماتے ہیں۔''جس نے اللہ کی اطاعت کی اُس نے یقیناً اللہ کو یاد رکھا، اگر چہ

اس کی نمازیں اور اس کے روزے اور اس کی تلاوت کم ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کو فراموش کر دیا، اگرچہ اس کی نمازیں، اس کے روزے اور اس کی تلاوت کثیر ہو"۔

محبتِ اہلبیتؑ جو اصلِ عبادت ہے، ایسی چیز ہے جو نہ صرف یہ کہ محبّ کے درجات میں مسلسل اضافہ کرتی رہتی ہے بلکہ گناہوں سے بھی اس کی حفاظت کرتی ہے۔ ایک شخص نے امام رضاؑ سے اپنے ایک شراب خور ہمسائے کی شکایت کی جو اگرچہ شراب پیتا تھا لیکن امام رضاؑ کو دوست رکھتا تھا۔ امامؑ نے فرمایا۔ "اے ابا اسحٰق! کیا تم نہیں جانتے کہ اگر علیؑ کے دوست کا ایک قدم ڈگمگا جائے تو دوسرا ثابت و استوار رہتا ہے"۔ (القطرۃ من بحار ج ۴ صفحہ ۳۲۲)۔

عبادت گزار کون ہے؟

اب ہم اپنے بیان کو سمیٹتے ہوئے دو احادیث آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تاکہ ہماری تمام گفتگو کا نتیجہ نکل سکے اور ذکرِ خفی اور ذکرِ جلی میں فرق کیا جا سکے۔

۱۔ تفسیر فرات صفحہ ۳۶۲۔

سورۂ مدثر کی آیت "جو جنتوں میں مجرموں سے دریافت کرتے ہوں گے کہ تمھیں بھڑکتی ہوئی آگ میں کس چیز نے پہنچایا" کے بارے میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ "نمازیوں سے مراد علیؑ کے شیعہ ہیں"۔ اس حدیث پر غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ

مولوی حضرات نے اس مفہوم کو بالکل الٹ کر رکھدیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "شیعہ وہ ہے جو نمازی ہو"۔ جبکہ معصومؑ فرمارہے ہیں کہ "نمازی وہ ہے جو شیعہ ہو"۔ یعنی مولوی ذکرِ جلی کا دیوانہ ہے اور اللہ ذکرِ خفی کا طلبگار ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے جو ہم اب بیان کرنے جارہے ہیں۔

۲۔ القطرۃ من بحارج ا صفحہ ۲۴۰۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

"جو مومن ولایت اور معرفتِ امیرؑ المومنین رکھتا ہے، حقیقت میں وہ عبادت گزار ہے، اگرچہ عبادت نہ بھی کرے۔ وہ نیکوکار ہے، اگرچہ وہ برائی کرے"۔

افتخارِ محبت..........مودّت

ہم آ پہنچے اس مقام تک جو عقل، علم، ایمان، معرفت، ولایت اور اعمالِ ظاہری و باطنی کی منزلِ مراد ہے۔ ہم آ پہنچے اس مقام پر جہاں الست کے دن بویا ہوا تخمِ محبت ایک شجرِ ثمر بار کی صورت اختیار کرنے کو ہے۔ ہم آ پہنچے اس مقام پر جہاں مشیتِ خدا بھی بے قرار ہو کر پردۂ خفی کو چاک کر ڈالتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان قربتوں کے جھرمٹ میں رہ کر بھی دیدار کا پیاسا رہتا ہے اور فراق کی اذیتوں میں بھی وصال کا ذائقہ چکھتا ہے۔ یہ حجاب ہٹ جانے کا مرحلہ ہے۔ یہ تنہائیوں کی جلوہ گاہ ہے جہاں آہٹیں دم توڑ دیتی ہیں۔ یہاں محبت کرنے والوں کے ہجوم اور ان کی ہاؤ ہُو کے باوجود ایک اتھاہ خاموشی کا راج ہوتا ہے اور یہ ہجوم تنہائی کو مانع نہیں ہوتا۔ یہ وہ وادی ہے جس میں صرف پاک طینت لوگوں کا گزر ہو سکتا ہے، نجاستیں یا نجاستوں سے وابستہ لوگ اگر یہاں کا تصور بھی کر لیں تو جل کر خاکستر ہو جائیں۔ یہ محبت ہے جو ہمارے پورے وجود کی مالک و مختار ہے۔ وہ محبت جو محبّ کو عاجز و مجبور بنانے کے باوجود اس میں ایک جذبۂ افتخار کو بھی جنم دیتی ہے اور یہ وہ عالم ہے جب محبّ اپنے محبوب کے قدموں میں سمٹ کر بھی دنیا کے سامنے سر اٹھا کر چلتا ہے۔ بقاؔ نے اسی موقع کے لئے کہا تھا

آئینہ دیکھ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں!
اُس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں!

محبت اور مودّت میں کیا فرق ہے؟

یہ محبت جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں وہ محبت ہے جس کا اللہ نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جس کا نام اُس نے مودّت رکھا ہے۔ یہاں ایک بات کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ محبت اور مودّت ایک ہی جذبے کے دو نام ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے لیکن مودّت ہوتی نہیں ہے بلکہ کی جاتی ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ ہم سے مودّت کا مطالبہ نہ کرتا کیونکہ کسی کے کہنے سننے سے محبت نہیں ہوا کرتی اور اس بات کو اللہ سے بہتر کون جان سکتا ہے کیونکہ خالقِ فطرت وہی ہے۔اُس کا مطالبہ یہ بتا رہا ہے کہ مودّت ایک اختیاری چیز ہے،اگر اختیاری نہ ہوتی تو نہ تو اللہ اس کا حکم دے سکتا تھا اور نہ اس بارے میں ہم سے سوال کر سکتا تھا۔جبکہ رسول اللہ فرماتے ہیں۔
''قیامت کے روز بندوں سے سب سے پہلے ہم اہلبیت کی محبت کے متعلق سوال کیا جائے گا''۔(عیونِ اخبار الرضاؑ ج ۲ صفحہ ۱۴۵)۔پس یہ وہی محبت ہے جسے اللہ نے مودّت کہا ہے۔

محبت ایک فطری عمل ہے۔اللہ نے بعض چیزوں کی فطرت میں یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ بعض چیزوں کی طرف مائل ہو جاتی ہیں اور اس میں ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

چکور جب رات بھر چاند کے گرد چکر لگاتی ہے، سمندر جب چاند کو دیکھ کر وجد میں آتا ہے، سورج مکھی کا پھول جب سورج کی طرف سے اپنا رخ نہیں پھیرتا اور لوہا جب مقناطیس سے جا کر چپک جاتا ہے تو یہ ان کا اختیاری فعل نہیں ہوتا بلکہ ان کی جبلّت ان کو مجبور کرتی ہے۔ عقل کی جبلّت میں بھی اللہ نے یہ بات رکھ دی ہے کہ وہ حُسن کو دیکھ کر بے خود ہو جاتی ہے اور اس سے متّصل ہونا چاہتی ہے۔ یہ محبت ہے جو کشش سے شروع ہوتی ہے۔ اسی لئے ہم نے عرض کیا تھا کہ اہلبیتؑ سے محبت کیلئے پاک طینت اور پاک عقل ضروری ہے، ایسی عقل جو نجاسات باطنی سے آلودہ نہ ہو کیونکہ حُسن بالذات ایک طاہر وطیّب چیز ہے اور پاک چیزوں کو ہی اپنی طرف کھینچتا ہے اس لئے جب عقل پاک ہو تو حُسن کی طرف مائل ہونا اور اس کیطرف کھنچنا عقل کا فطری عمل ہے جسے محبت کہتے ہیں لیکن محبت کی بقا اور اس کے ارتقاء کیلئے چند چیزیں ضروری ہیں اور وہ سب اختیاری ہیں۔ ان مراحل سے گزرنے کیلئے انسان کو خود کوشش کرنی پڑتی ہے اور ان سے گزر کر ہی وہ مودّت کی منزل تک پہنچتا ہے اور سوال یہی کیا جائے گا کہ کیا انسان نے اپنی فطری محبت کو مودّت کی شکل دینے کیلئے شعوری کوشش کی تھی یا نہیں؟۔ بس اس کوشش کی میزان پر ہی انسان کا وزن کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالٰی نے فرمادیا ہے کہ **لیس لِلانسان الّا ماسعٰی**۔ یعنی انسان کا سرمایہ وہ کوشش ہی ہے جو وہ کرتا ہے۔

اس مقام پر ہم مناسب جانتے ہیں کہ مختصراً ان چیزوں کا ذکر کر دیا جائے جو محبت کی بقا

اور ارتقاء کا سبب ہوتی ہیں اور ان میں تحفہ،شکوہ، ذکر، اخلاص،علم اور معرفت شامل ہیں۔

تحفہ : امیرؑالمومنین نے فرمایا۔"تحفہ محبت لے کر آتا ہے"۔ (تجلیاتِ حکمت صفحہ ۱۹۸)۔

اسی لئے محمدؐ وآلِ محمدؑ پر درود بھیجنے کی تاکید کی گئی ہے کیونکہ درود ایک تحفہ ہے جو ہم ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ نذر نیاز ایک تحفہ ہے۔غمِ حسینؑ میں جو آنسو ہماری آنکھوں سے جاری ہوتے ہیں اور ماتم کے دوران جو خون ہمارے بدن سے نکلتا ہے وہ تحفہ ہے۔علَم،تعزیہ،تابوت،ذوالجناح اورضریحِ معصومؑ کو جو بوسہ دیا جاتا ہے وہ تحفہ ہے۔ یہ تحفے محبت میں اضافہ کرتے ہیں اور یہ یاد رکھیئے کہ تحفہ کبھی یک طرفہ نہیں ہوا کرتا۔ہم جو تحفے انؑ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں وہ ہماری حیثیت کے مطابق ہوتے ہیں اور وہ جو تحفہ ہمیں عطا فرماتے ہیں وہ انؑ کی شان کے مطابق ہوتا ہے اور اس تحفے کو ثواب کہا جاتا ہے۔ثواب اس بدلے کو کہتے ہیں جس میں عطا کے ساتھ ساتھ عزت واکرام بھی شامل ہو۔سب سے پہلا تحفہ جو انہوںؑ نے اپنے محبوں کو دیا ہے وہ طہارتِ ولادت ہے اور یہ ایسا تحفہ ہے کہ ہم اگر کروڑوں تحفے بھی ان کی خدمت میں نذر کردیں تب بھی اس ایک تحفے کا احسان نہیں اتار سکتے۔

شکوہ : امیرؑالمومنین نے فرمایا۔"شکوہ محبت کے لئے زندگی ہے"۔ (حکمتِ بوتراب ج ۱صفحہ ۷۷)۔

یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے اور ہر شخص اس کیفیت سے ضرور گزرتا ہے۔ یہ یاد رکھیئے کہ شکوے کا تعلق امید اور توقّع سے ہوتا ہے۔ یعنی انسان اسی سے گلہ شکوہ کرتا ہے جس سے وہ توقع رکھتا ہے۔ جس سے اسے کوئی توقع نہیں ہوتی اس سے وہ کبھی گلہ نہیں کرتا جیسا کہ غالبؔ نے کہا ہے۔

جب توقّع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیا کسی کا گِلہ کرے کوئی

اب ہمارا اور اہلبیتؑ اطہار کا رشتہ ایسا ہے کہ ہماری تمام امیدیں اور تمام توقّعات صرف انہی سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ہم ہر چیز انہی سے مانگتے ہیں اور چونکہ ہمارا علم بہت محدود ہے اسلئے جب ہماری کوئی دعا بظاہر قبول نہیں ہوتی تو ہم بے قرار ہوتے ہیں اور آنسو بہا بہا کر ان سے ضد کرتے ہیں جیسے بچہ اپنے ماں باپ سے ضد کرتا ہے۔ شدتِ جذبات میں ہم ان کی حکمتوں کو دھیان میں نہیں لاتے لیکن انہیں ہماری یہ ادا بھی پسند ہے کیونکہ ہمارا ان سے ضد کرنا یقیناً ہماری محبت کی بھی دلیل ہوتا ہے اور انؑ کی کریمیت کا بھی۔ کیونکہ نازنخرے اسی سے کئے جاتے ہیں جو نازنخرے اٹھاتا ہو۔ کبھی کبھی وہ بھی ہم سے شکوہ کرتے ہیں جو ان کی ہم سے محبت کی دلیل ہوتا ہے۔ کتاب "علیؑ کا شیعہ" صفحہ ۴۷ بحوالہ تحف العقول پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "اگر ہمارے شیعہ استقامت سے کام لیتے تو فرشتے ان سے مصافحہ کرتے، بادل ان کے سر پر سایہ ڈالتے اور وہ آسمان و زمین سے رزق پاتے اور اللہ سے جو مانگتے وہ انہیں

عطا کر دیتا"۔

ذکر: امیر المومنین فرماتے ہیں۔ "محبوب کا ذکر محبوب کے ساتھ بیٹھنے کی طرح ہے"۔ (تجلیاتِ حکمت صفحہ ۱۹۸)۔

یہ ایک حقیقت ہے اور مشاہدہ اس کی گواہی دیتا ہے کہ انسان جس سے بھی محبت کرتا ہے اسی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ ذکر کی خاصیت یہ ہے کہ یہ غلفت کو دور کرتا ہے، محبوب کی یاد کو تازہ کرتا ہے، محبت کو زندہ رکھتا ہے اور محبت کی شدت میں اضافہ کرتا ہے اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ذکر اتنا بے چین کر دیتا ہے کہ اگر کوئی اور نہ ملے تو انسان اپنے آپ سے اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔

اخلاص: اخلاص کے بغیر نہ محبت کی جا سکتی ہے اور نہ اسے پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ اخلاص نام ہے خود کو تنہا کرنے کا اور محبوب کے سوا ہر چیز کو بھول جانے کا۔ جہاں اخلاص ہوتا ہے وہاں ذاتی اغراض معدوم ہو جاتی ہیں بلکہ اپنی ذات کی نفی ہو جاتی ہے اور انسان جو کام بھی کرتا ہے اُس کا مقصد اپنے محبوب کو راضی کرنا ہوتا ہے۔ پس جیسے جیسے انسان اپنے آپ کو خالص کرتا جاتا ہے۔ ویسے ویسے اپنے محبوب سے قریب تر ہوتا جاتا ہے اور یہی محبت کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ اخلاص یہ ہے کہ انسان کسی کو دوست رکھے تو اپنے محبوب کیلئے اور کسی کو دشمن رکھے تو وہ بھی صرف اپنے محبوب کی خاطر اور اس کی دوستی اور دشمنی پر اس کی ذاتی خواہشات اور اغراض اثر انداز نہ ہوں جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "جو شخص اللہ کی خاطر ہم سے اور ہمارے محبوں سے محبت کرتا

ہے جبکہ اس میں دنیاوی غرض نہ ہو، اور ہمارے دشمنوں سے دشمنی رکھتا ہو جبکہ ان دونوں کے درمیان ذاتی دشمنی کا کوئی عمل دخل نہ ہوتو اگر وہ شخص اِن اوصاف کے ساتھ وارِدِ محشر ہوگا تو اللہ اس کے سارے گناہ بخش دے گا اگر چہ اس کے گناہ بیابانِ کی ریت اور سمندر کے جھاگ کے ذرّات کے برابر ہی کیوں نہ ہوں''۔ (القطرۃ من بحارج ۳صفحہ ۶۷)۔

یہ بات دیکھنے میں آسان لگتی ہے لیکن اس کسوٹی پر پورا اترنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اگر جہدِ مسلسل کے بعد انسان اس منزل پر پہنچ جائے تو اس کی توجہ کبھی اپنے محبوب کی طرف سے نہیں ہٹتی اور اس کی محبت کا سفر مسلسل جاری رہتا ہے اور بالآخر وہ موذت کی حدوں کو چھو لیتا ہے اور اس طرح ایک نئے سفر کا آغاز کرتا ہے۔

علم: امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔ ''صاحبِ علم زندہ ہے اگر چہ وہ مر گیا ہو اور جاہل مُردہ ہے اگر چہ وہ زندہ ہو''۔ (حکمتِ بوتراب ج ۱صفحہ۱۹۲)۔ محبت جمود کا شکار ہو جاتی ہے اگر علم نہ ہو اور رفتہ رفتہ وہ چند رسوم تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اس نے علیؑ کا نعرہ لگا کر یا مجالس میں اشک فشانی کر کے محبت کا حق ادا کر دیا اور وہ یہ نہیں جانتا کہ محبت کی مثال اُس پانی جیسی نہیں ہے جو کسی گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس میں تعفّن پیدا ہونے لگتا ہے بلکہ محبت کی مثال دریا جیسی ہے جس کا کام مسلسل بہتے رہنا اور آگے بڑھتے رہنا ہے جس میں کبھی تعفّن پیدا نہیں ہوتا اور وہ ہمیشہ طاہر و مطہر رہتا ہے۔ اس حرکتِ مسلسل کو میرے مولاؑ نے زندگی سے تعبیر کیا ہے

اور جمود کو موت کہا ہے۔

معرفت :سفرِ محبت میں معرفت ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ یہ معرفت ہی ہے جو حجابات میں در آتی ہے اور ہر روز اپنے محبوب کو ایک نئی شان میں دیکھتی ہے اور جیسے جیسے حُسن کا نقاب سر کتار ہتا ہے ویسے ویسے ہیجانِ محبت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور وہ سمندر کی طرح چاند کو چھونے کیلئے بے قرار ہو جاتی ہے۔سمندر کا عمل بے اختیاری ہوتا ہے جبکہ انسان کا یہ عمل صریحاً اختیاری ہوتا ہے اور قربِ محبوب کی آرزو کا اپنے عروج پر پہنچ جانا ہی مودّت کہلاتا ہے۔ سمندر تو چاند کو نہیں چھُو پاتا لیکن انسان اس منزل پر پہنچ کر اپنے محبوب کا لمس ضرور محسوس کر لیتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اس کا محبوب کہتا ہے کہ ''میں اپنے محبّ کے ٹوٹے ہوئے دل میں رہتا ہوں''۔

ہم نے ان امور کا ایک اجمالی جائزہ لیا جو محبت کو مودّت تک پہنچانے میں مدد کرتے ہیں اور یہ سب چیزیں اختیاری ہیں جن کیلئے انسان کو شدید کوشش کرنا پڑتی ہے اور بہت سی دنیاوی خواہشات کو خاک میں ملانا پڑتا ہے۔

حُسن

عقل جس شے سے محبت کرتی ہے اسے علم الاخلاق کی زبان میں ''کمال'' اور جمالیات کی اصطلاح میں ''جمال'' کہتے ہیں لیکن ہم نے اپنا مدعا آپ تک پہنچانے اور وضاحت در وضاحت سے بچنے کیلئے لفظِ ''حُسن'' استعمال کیا ہے کیونکہ یہ لفظ عام

ہے اور اسے ہر شخص پہچانتا ہے اور لفظی بحث میں پڑنا ہمارا مقصد ہرگز نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ حسن ہوتا کیا ہے لیکن پہلے ایک اہم مسئلے کی طرف نظر کرتے ہیں کہ عملِ محبت کس طرح سرانجام پاتا ہے۔ بظاہر یہاں ہمیں دو فریق نظر آتے ہیں، ایک حسن اور دوسرے محبّ۔ حسن کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے اور محبّ اس بات پر مامور نظر آتا ہے کہ وہ حسن سے محبت کرے۔ لیکن جب ہم معاملے کی گہرائی میں جاتے ہیں تو پہلا سوال جو ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ عملِ محبت کی ابتداء کون کرتا ہے؟۔ ہم جنابِ امیر المومنین کا ارشاد آپ کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں کہ محبت کی ابتداء حسن کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور یہ بھی آپ کے علم میں ہے کہ محبت حسن سے کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں طرف حسن ہی کا عمل جاری و ساری ہوتا ہے اور حسن کا حسن سے معاملہ ہی محبت کہلاتا ہے۔ اب ان دونوں میں سے جو زیادہ طاقتور حسن ہوتا ہے وہ محبوب کہلاتا ہے اور دوسرے کو محبّ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ابتداء طاقتور حسن کی طرف سے ہوتی ہے جو دوسرے حسن کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور یہی کشش ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ محبّ کون ہے اور محبوب کون۔

یہ اچھی طرح واضح رہنا چاہیئے کہ ہم حسنِ عارضی کی بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ اُس حسن کی بات کر رہے ہیں جو اپنی ذات میں حسن ہے۔ حسنِ عارضی وہ ہوتا ہے جو کسی شے کو عارض ہو جائے۔ ایسی صورت میں وہ شے اپنی ذات میں حسن نہیں ہوتی بلکہ خارج

سے اس پر کوئی شے اثر انداز ہوتی ہے جس کیوجہ وہ حسن کہلاتا ہے۔ مثلاً تناسب اعضاء جب انسان کو عارض ہوتا ہے تو حسن پیدا کر دیتا ہے لیکن گزرتی عمر کے ساتھ جب یہ تناسب منتشر ہونے لگتا ہے تو حسن بھی مدھم پڑتا جاتا ہے اور آخر کار جھرّیوں بھرا ایک چہرہ باقی رہ جاتا ہے جس کیطرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ جبکہ حسن بالذات وہ ہوتا ہے جس کو زوال نہ ہو اور جس حسن میں ارتقاء اور زوال دونوں نہ ہوں اُسے حسنِ قدیم کہتے ہیں اور یہی حسن ہمارا موضوع ہے۔

ہمارا محبوب حسنِ قدیم ہے اور کائنات میں جہاں حسن نظر آتا ہے وہ اسی کا پرتَو ہے کیونکہ مصوّر جب چاہے اپنی بنائی ہوئی تصویر میں کوئی تبدیلی کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو اسے مٹا بھی سکتا ہے۔

حسن کی ضد ہے ''قُبح'' جس کے معنی ہیں نقص۔ لہٰذا جب حسن اطلاق کی منزل پر ہو تو عقلی اعتبار سے اسے بے عیب ہونا چاہیئے کیونکہ اجتماعِ ضدّین محال ہوا کرتا ہے لہٰذا جو بھی اِس حسن کامل واکمل سے محبت کا دعویٰ کرے اُس کی محبت کا وزن اسی معیار پر کیا جائے گا کہ وہ اپنے محبوب کو کس منزلِ کمال پر دیکھتا ہے یعنی وہ اس کی کتنی معرفت رکھتا ہے۔ عقل بذاتِ خود ایک حسن ہے جسے اُس حسنِ لازوال نے اپنے لئے مخصوص کیا ہے۔ اسی لئے جب یومِ الست عقل کی نگاہ اُس حسنِ بے پناہ سے دوچار ہوئی تو یہ جزو اپنے کُل کیطرف خود بخود کھنچنے لگا اور یہ کشش قیامت تک منقطع ہونے والی نہیں ہے یہاں تک کہ حجابات اٹھا دیئے جائیں گے تو یہ عقل سجدے میں گر پڑے گی کیونکہ یہ

منزلِ وصال ہے جو عقل کا مقصدِ حقیقی ہے۔اور اسی کا نام اللہ نے جنت رکھا ہے۔

دوستی

بات جب محبت کی آتی ہے تو زبانی دعووں کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی بلکہ یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ محبت کے مجموعی تقاضے کیا ہیں۔ جب تک ان تقاضوں کو ملحوظِ خاطر نہ رکھا جائے اُس وقت تک محبت کی حیثیت محض ایک لفظ سے زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ یہ تقاضے فطری ہیں۔ جب ہم کسی کو دوست رکھتے ہیں تو یہ دیکھنا پڑے گا اس دوستی کی نوعیت کیا ہے۔ آیا یہ ایک جذبۂ عقلی ہے جس کی بنیاد خودسپردگی اور ماسویٰ سے بے تعلقی ہوتی ہے؟۔ یا یہ جذبۂ نفسانی ہے جسمیں مختلف قسم کی اغراض شامل ہوتی ہیں؟۔ بعض اوقات جس چیز کو محبت کا نام دیا جاتا ہے وہ محض ایک معاشرتی دباؤ ہوتا ہے یا معاشرتی رسوم ہوتی ہیں یا دنیاوی مسائل ومشکلات سے فرار ہوتا ہے۔اللہ ہم سے جس محبت کا تقاضا کرتا ہے وہ عقل سے عقل کی، دل سے دل کی اور روح سے روح کی محبت ہے۔ایسی محبت لباس کیطرح نہیں ہوتی کہ جب چاہا پہن لیا اور جب چاہا اتار دیا بلکہ یہ انسان کے وجود کا حصہ ہوتی ہے بلکہ پورے وجود پر محیط ہوتی ہے اور اسی لئے اسے مودّت کہتے ہیں۔اور یہ وہ کیفیت ہے جہاں ہر لمحے یہ خوف رہتا ہے کہ ہماری کسی بات سے ہمارے محبوب کو اذیّت تو نہیں پہنچ رہی؟ پھر انسان کی اپنی خوشی اور اپنے غم کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی بلکہ اس کی نظریں ہمہ دم اس کے محبوب پر لگی رہتی

ہیں۔ جب وہ خوش ہوتا ہے تو یہ بھی خوش ہوتا ہے، جب وہ غمگین ہوتا ہے تو یہ بھی غمگین ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ ہجر کی آگ میں جلتا ہے اور کبھی وصل کی لذت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کبھی وہ اپنے محبوب کے سامنے بیٹھ کر اس سے اپنے دل کی باتیں کرتا ہے، شکوے گلے کرتا ہے، اس سے وعدے لیتا ہے اور کبھی اپنی تنہائیوں سے گھبرا کر اسے **''عجّل اللہُ فرجک''** کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ محبت کی کیفیات ہیں جن کی شدت کا اندازہ انسان کو اپنی دنیاوی اور عارضی محبتوں سے کر لینا چاہیئے اور سوچنا چاہیئے کہ جسے ہم اپنا محبوبِ حقیقی کہتے ہیں اس کی محبت میں کم از کم اتنی کیفیت تو ہم پر طاری ہونا لازمی ہے اور اگر اتنی بھی کیفیت سے ہم دوچار نہیں ہوتے تو پھر ہمیں محبت کا دعویٰ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

اگر ہم محبتِ اہلبیتؑ کا اجمالی تصور آپ کے ذہنوں تک پہنچا سکے ہیں تو پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس دوستی کے بارے میں خود اہلبیتؑ کیا فرماتے ہیں اور اگر خالص ہو جائے تو یہ دوستی کیا رنگ لاتی ہے۔

القطرۃ من بحارج ۲ صفحہ ۱۸۷۔ امام علی نقیؑ فرماتے ہیں۔

''ہماری ولایت ہمارے شیعوں کیلئے محافظ ہے۔ اگر گہرے سمندروں کے نیچے چلے جائیں یا کسی بے آب و گیاہ صحرا میں چلے جائیں یا خطرناک بیابانوں میں، خطرناک جانوروں، بھیڑیوں، دشمن آدمیوں اور جنوں کے درمیان گھر جائیں تو لازمی طور پر ان سے محفوظ رہیں گے۔ پس اللہ پر اعتماد رکھو اور آئمہ طاہرینؑ کے ساتھ دوستی اور ولایت

کو خالص کرو۔ پھر جدھر جانا چاہو چلے جاؤ اور جو کرنا ہے کرلو"۔

محبت اور دوستی کا پہلا تقاضا نصرتِ محبوب ہے۔ یعنی اسے کبھی بے یار و مددگار نہ چھوڑنا، جو مصیبت اس پر آنے والی ہو اسے اپنے اوپر لے لینا اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو اس کی مصیبت میں شریک ہو جانا اور اس بارے میں اگر کوئی نمونۂ عمل ہو سکتا ہے تو وہ شہیدانِ کربلا ہیں۔ ہم جیسے مجبور لوگ تو گریہ و بکا کر کے دل ہلکا کر لیتے ہیں یا پھر اپنا خون بہا کر اپنے محبوب کی مصیبت میں شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور آرزو رکھتے ہیں کہ کاش ہمارا محبوب ہمارا یہ حقیر نذرانہ قبول کرلے لیکن اللہ کے رسولؐ نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ ناصرانِ اہلبیتؑ کے ضامن ہیں۔ اسی لئے انہوں نے فرمایا ہے کہ "چار افراد کا بروزِ قیامت میں شفیع ہوں گا، اگرچہ وہ میرے پاس تمام اہلِ ارض کے گناہ لے کر بھی کیوں نہ آئیں۔ ۱۔ میرے اہلِ بیتؑ کے مددگار۔ ۲۔ بوقتِ ضرورت ان کی حاجات پوری کرنے والا۔ ۳۔ دل و زبان سے ان کے ساتھ محبت کرنے والا۔ ۴۔ اپنے ہاتھ سے ان کا دفاع کرنے والا"۔ (عیونِ اخبار الرضاؑ ج ۱ صفحہ ۴۵۴)۔ اور امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "جب تم امام حسینؑ پر اتنا گریہ کرو کہ تمھارے آنسو تمھارے رخساروں پر آجائیں تو اللہ تمھارے تمام صغیرہ کبیرہ گناہ معاف کر دے گا"۔ (عیونِ اخبار الرضاؑ ج ۱ صفحہ ۵۲۱)

شیعوں میں ایک بحث یہ بھی چلتی ہے کہ محمدؐ و آلِ محمدؑ فرشتوں سے افضل ہیں۔ اللہ جانے اس احمقانہ نظریے کی ابتداء کس نے کی تھی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ و آلِ محمدؑ کا مقام تو

وہ خود ہی جانتے ہیں لیکن ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ فرشتے تو ان کے محبوں کے بھی خادم ہیں جیسا کہ خود رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''یقیناً ملائکہ ہمارے اور ہمارے محبوں کے خادم ہیں۔ حاملینِ ارض اور اس کے گرد مقرر فرشتے اللہ کی حمد کے ساتھ پاکیزگی بیان کرتے ہیں اور جو لوگ ہماری ولایت پر ایمان لائے ہیں ان کیلئے استغفار کرتے ہیں''۔ (عیونِ اخبار الرضاؑ ج ا صفحہ ۴۵۸)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے خود بھی محبانِ اہلبیتؑ ہیں اس لئے اپنے دوست کے دوستوں سے محبت اور ان کی خدمت گزاری کرتے ہیں جیسا کہ تفسیرِ نور الثقلین ج ا صفحہ ۲۰۲ پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ ''ملائکہ میں وہ فرشتہ خدا کا زیادہ مقرب ہوتا ہے جسے علیؑ سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ آسمانوں اور حجابات کے فرشتوں کو علیؑ کی زیارت کا اسی طرح سے اشتیاق ہوتا ہے جس طرح سے ایک ماں کو اپنے پیارے بیٹے کی ملاقات کا اشتیاق ہوتا ہے''۔ اور یہ بات صرف فرشتوں تک ہی محدود نہیں بلکہ انبیاءؑ بھی علیؑ ہی کی محبت کا دم بھرتے ہیں جیسا کہ القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۶۲ پر امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''خدا کی قسم کوئی نبی یا فرشتہ ایسا نہیں مگر یہ کہ وہ ہماری محبت کا معتقد ہے''۔ اور صرف انبیاؑ ہی نہیں بلکہ خود خاتمؐ الانبیاء بھی اسی محبت پر مامور ہیں جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''اللہ نے اپنی نبیؐ کی تربیت اپنی محبت پر فرمائی''۔ جو لوگ اللہ کی محبت سے واقف ہیں وہ اس بات کو سمجھ گئے ہوں گے۔

یہ وہ دوستی ہے جو تمام دوستیوں اور دشمنیوں کا مرکز ہے اور اسی بات سے دلوں کا امتحان

کیا جاتا ہے اور یہ امتحان کوئی اور نہیں بلکہ انسان خود ہی لیتا ہے کہ کیا وہ واقعی علیؑ کا دوست ہے یا کسی خوش فہمی میں مبتلا ہے۔ جنابِ امیرالمومنین اِس معیار کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ''اگر کوئی چاہتا ہے کہ وہ یہ جانے کہ وہ ہمارا دوست ہے یا ہمارا دشمن تو اپنے دل کا امتحان کرے۔ اگر وہ ہمارے دوست کو دوست رکھتا ہے تو وہ ہمارا دشمن نہیں اور اگر ہمارے دوست کو دشمن رکھتا ہو تو وہ ہمارا دوست نہیں''۔ (القطرۃ من بحار ج ۱ صفحہ ۴۵) یہی وہ معیار ہے جس پر نہ صرف محبت بلکہ انسان کے دین و ایمان کو پرکھا جاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ مشرک بننے کی کم از کم حد کیا ہے؟۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''جو اپنی طرف سے کوئی رائے قائم کرے اور اسی کو معیار بنا کر محبت اور نفرت کرے''(تفسیر نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۲۸۱)۔ گویا علیؑ کی طرح علیؑ کی محبت بھی لاشریک ہے اور حقیقی مشرک وہی ہے جو علیؑ کی محبت میں کسی کو شریک کرتا ہو۔

قبل اس کے کہ ہم اِس محبت کے چند فضائل آپ کی خدمت میں پیش کریں، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی جائے کہ جب انسان اس وادیٔ محبت میں قدم رکھنا چاہے تو پہلے ساری دنیا کو چھوڑے کیونکہ یہ وہ **''اِلّا''** ہے جو **''لا''** کے بغیر نہیں ملتا۔ محبت جان جوکھوں میں ڈالنے کا نام ہے۔ محبت لینے کا نام نہیں بلکہ دینے کا نام ہے۔ محبت اپنے آپ کو مصیبتوں کے طوفانوں میں پھینک دینے

کا نام ہے۔ جیسا کہ امام حسن عسکری نے فرمایا کہ ''ہمارے ساتھ رہ کر فقر و ناداری اُس ثروت و بے نیازی سے بہتر ہے جو ہمارے غیر کے ساتھ رہنے سے ملے اور ہمارے راستے میں قتل ہونا ہمارے دشمنوں کے ساتھ زندگی گزارنے سے بہتر ہے''۔ (القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۱۶)۔ پس انسان اچھی طرح دیکھ لے، پرکھ لے اور سوچ لے۔ ایک طرف محبتِ اہلبیتؑ ہے اور دوسری طرف دنیا ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ اگر کلیجہ بڑا ہے تو اس میدان میں قدم رکھے ورنہ جو کر رہا ہے وہ کرتا رہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک آنکھ اِدھر اور دوسری آنکھ اُدھر۔ بقولِ شاعر

قدم سُوئے مرقد نظر سُوئے دنیا
کہاں جا رہا ہوں کدھر دیکھتا ہوں

پس جو شخص دنیا کی رنگینیوں، جہنم کی اذیتوں اور جنت کی دل فریبیوں سے گزر کر علیؑ کا دامن تھامنا چاہے وہ آگے آئے اور دیکھے کہ وہ چاروں طرف سے نعماتِ الٰہیہ میں گِھرا ہوا ہے۔ وہ لوگ اور ہوں گے جنہیں قیامت کے روز جنت ملے گی۔ علیؑ کے محبّ کیلئے تو جنت خود چل کر اسی دنیا میں چلی آتی ہے۔ جنت اس کے پیچھے ہوتی ہے اور وہ علیؑ کے پیچھے۔ اللہ ہی جانے علیؑ کے محبّ کی وہ کون سی منزل ہے جہاں اسے جنت بھی ہیچ نظر آتی ہے اور وہ کہتا ہے

دوزخ میں پھینک دے کوئی لے کر بہشت کو

کچھ لوگ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اللہ سے جنت کی درخواست کی۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''تم اِس وقت جنت میں ہو۔ اللہ سے دعا کرو کہ وہ تمھیں اِس جنت سے نکالے نہیں''۔ مجلس میں حاضر لوگوں نے عرض کیا۔ ''آپؑ پر قربان جائیں!، ہم تو اس وقت دنیا میں ہیں۔ پس جنت میں کس طرح ہیں؟۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''کیا تم ہماری امامت کا اقرار نہیں کرتے ہو؟''۔ انہوں نے عرض کیا کہ بے شک ہم اقرار کرتے ہیں۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''یہی ہے جنت کے معنی۔ پس اللہ سے سوال کرو کہ وہ اس نعمت کو تم سے سلب نہ کرے''۔ (القطرۃ من بحارج ۲ صفحہ ۳۶۵)

جن لوگوں پر ان کے محبوب کی نگاہِ کرم ہے اور جن پر اِس دنیا ہی میں **''اولٰــــئک فــی جــنّٰــتٍ مکرّمون''** کا اطلاق ہورہا ہے، ان کے فخر و انبساط کیلئے ہم چند فرامینِ معصومینؑ پیش کرتے ہیں تا کہ وہ اپنی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرسکیں اور اللہ کا شکرِ خاص ادا کرسکیں کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا سانس لینا بھی اللہ کے نزدیک تسبیح کا درجہ رکھتا ہے۔

۱۔ القطرۃ من بحارج ۲ صفحہ ۳۳۱۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''جو کوئی ہم اہلبیتؑ کو دوست رکھتا ہو اور ہماری محبت کو اپنے دل میں مضبوط کرے تو اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری ہوجاتے ہیں اور اس کے دل میں ایمان تازہ

ہو جاتا ہے اور اس کیلئے ستّر انبیاءؑ، ستّر صدیقوں، ستّر شہیدوں اور ستّر ایسے عابدوں کا عمل لکھتے ہیں جنہوں نے ستّر سال اللہ کی عبادت کی ہو"۔ یہ واضح رہے کہ عربی میں سات، ستّر اور ستّر ہزار عدد کے معنی میں نہیں بلکہ بے شمار کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ پس مطلبی لوگ اپنی نمازوں اور روزوں کی گنتی کرتے رہیں لیکن علیؑ کے محبّ کے اعمالِ حسنہ کا شمار سوائے اللہ کے کوئی نہیں کر سکتا۔

۲۔القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۹۱۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

"میں تمھیں ایک ایسی چیز کے بارے میں بتاتا ہوں جس کے بغیر اللہ اپنے بندوں کا کوئی بھی عمل قبول نہیں کرتا اور وہ ہے اہلبیتؑ سے محبت کرنا، ان کی ولایت کو قبول کرنا، معصوم اماموںؑ کے دشمنوں سے بیزاری کرنا اور حضرتِ قائمؑ کے ظہور کے لئے چشم براہ ہونا"۔

۳۔القطرۃ من بحار ج ا صفحہ ۱۸۲۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

"جو کوئی معرفتِ علیؑ رکھتے ہوئے انہیں دوست رکھتا ہو تو اللہ ملک الموت کو اُس کی طرف اس طرح بھیجتا ہے جیسے اپنے پیغمبروں کی طرف بھیجتا ہے۔ جو کوئی علیؑ کے ساتھ محبت رکھتا ہوگا تو زمین میں اسے عبدِ خدا کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ جو کوئی علیؑ کو دوست رکھے گا تو اللہ اس کا نامۂ اعمال نہیں کھولے گا، اس کے لئے میزان نصب نہیں کرے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ ہر طرح کے حساب کے بغیر جنت میں داخل ہو جاؤ"۔

آپ سب اس بات سے واقف ہوں گے کہ اللہ کے نزدیک ''عبد'' بلند ترین درجہ ہے۔رسولؐ اللہ کو جب معراج پر لے جایا گیا تو بطورِ عبد لے جایا گیا نہ کہ بطورِ نبی یا رسول۔اسی سے محبِّ علیؑ کے مراتب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۴۔القطرۃ من بحارج ا صفحہ ۳۲۰۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''یا علیؑ!میری امت میں تیری مثال **قل ھو اللہ احد** جیسی ہے۔جس نے بھی ایک مرتبہ اس سورہ کو پڑھا اس نے قرآن کا تیسرا حصہ پڑھ لیا اور جس نے دو مرتبہ پڑھا تو اس نے قرآن کے دو حصے پڑھ لئے اور جس نے تین مرتبہ تلاوت کی اس نے پورے قرآن کی تلاوت کر لی۔پس جو تجھے زبان کے ساتھ دوست رکھے اس نے ایمان کا تیسرا حصہ حاصل کر لیا اور جس نے تجھے زبان اور دل سے دوست رکھا اس نے ایمان کا دو تہائی حصہ حاصل کر لیا اور جس نے تجھے زبان،دل اور ہاتھ سے دوست رکھا تو اس کا ایمان کامل ہوا''۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ ایمان سوائے محبتِ علیؑ کے کوئی شے نہیں ہے جو کبھی لا الٰہ الّا اللہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے،کبھی محمدؐ الرسول اللہ کی صورت میں نظر آتی ہے اور کبھی علیؑ ولی اللہ کی صورت میں جگمگاتی ہے۔

دشمنی

محبت کا دوسرا اور اہم پہلو دشمنی ہے جو محبت کے لازمی ردِّ عمل کے طور پر جنم لیتی ہے اور

جس کے بغیر محبت ایک بے معنی چیز ہے۔ جیسا کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''جان لو کہ اللہ کی محبت حاصل نہیں ہوتی مگر یہ کہ بہت سے لوگوں کی دشمنی سے اور اس کی ولایت بھی انہی کی دشمنی سے حاصل ہوتی ہے''۔ (محبت صفحہ ۳۶۱)۔ اور یہی وجہ ہے کہ امیرؑ المومنین نے فرمایا ہے کہ ''جب تم کسی کو دوست بنانا چاہو تو یہ دیکھو کہ اس کا دشمن کون ہے''۔ (محبت صفحہ ۱۳۳)۔ مراد یہ ہے کہ محبت کی اصل پہچان دشمنی سے ہوتی ہے۔ ایسے شخص سے ضرور دوستی کرنا چاہیئے جس کا دشمن اہلبیتؑ کا بھی دشمن ہو اور ایسے شخص سے ہرگز دوستی نہیں کرنا چاہیئے جس کا دشمن اہلبیتؑ کا دوست ہو۔ دشمنی چونکہ محبت ہی کا ردِ عمل ہوتی ہے اس لئے انسان کو جس شے سے جتنی شدید محبت ہوگی، اس کے غیر سے اتنی ہی شدید دشمنی ہوگی۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی دل میں دو متضاد محبتیں جمع ہو جائیں۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی دل میں علیؑ بھی رہتا ہو اور اس کا غیر بھی رہتا ہو اسی لئے خود مولا علیؑ ہی نے فرمایا ہے کہ ''جس کے دل میں غیر کی محبت ہے وہ ہمارا قاتل ہے''۔ (تفسیر فرات صفحہ ۳۹)۔

امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانے کی بات ہے کہ ایک جُمال جو اپنے اونٹ کرائے پر چلاتا تھا امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ''مولا! جب حج کا موسم آتا ہے تو ہارون رشید میرے اونٹ کرائے پر لیتا ہے اور میں اس کو دے دیتا ہوں کیونکہ وہ مجھے اس کا بھاری معاوضہ دیتا ہے۔ کیا میرے لئے ایسا کرنا جائز ہے؟''۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''یہ بتا کہ جب تو اسے اپنے اونٹ کرائے پر دیتا ہے تو اس وقت سے لے کر اس کی واپسی

تک کیا تیری یہ خواہش نہیں ہوتی کہ وہ زندہ رہے؟''۔اس نے کہا کہ ''جی ہاں مولا۔ کیونکہ اگر وہ مرگیا تو میرے اونٹ بھی گئے اور میرا کرایہ بھی''۔آپؑ نے فرمایا۔''یاد رکھ۔ ہمارے دشمن کی ایک لمحے کیلئے بھی زندگی چاہنا ہمارے ساتھ دشمنی کرنا ہے''۔ اس دشمنی سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُس محبت کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے جس کا ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے۔اور ایسی محبت بغیر معرفت کے ممکن نہیں ہوسکتی۔اسی لئے جو لوگ معرفت کی اعلیٰ منازل تک راہ نہیں پاتے وہ اس کا مداوا کرنے کیلئے صبح وشام اپنا وظیفہ یہ بنالیتے ہیں کہ انؑ کے دشمنوں پر بے شمار کرتے رہیں جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے

سلمانؓ و ابوذرؓ کو مبارک ہو محبت

ہم کو ترے دشمن سے عداوت ہے بڑی چیز

اور ایسے لوگوں کی ائمہؑ طاہرین نے تعریف کی ہے۔امام حسن عسکریؑ فرماتے ہیں۔''جو کوئی اہم اہلبیتؑ کی مدد سے عاجز ہو لیکن تنہائی میں ہمارے دشمنوں پر لعنت کرے تو اللہ اس کی آواز کو فرشتوں تک پہنچاتا ہے۔پس جب بھی وہ ہمارے دشمنوں میں سے کسی پر لعنت بھیجتا ہے تو فرشتے اُس لعنت کو اوپر لے جاتے ہیں اور جو لعنت نہیں کرتا، فرشتے اس پر لعنت کرتے ہیں۔اور ہمارے دشمنوں پر لعنت کی آواز جب فرشتوں تک پہنچتی ہے تو وہ اُس (لعنت بھیجنے والے) کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور

اُس پر درود بھیجتے ہیں''۔ (القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۱۴)۔

اہلبیتؑ کی محبت کو لوگ جس قدر آسان سمجھتے ہیں، درحقیقت وہ اتنی ہی مشکل ہے کیونکہ محبت وفا کا مطالبہ کرتی ہے اور وفا استقامت چاہتی ہے۔ اہلبیتؑ کی محبت ان کی غلامی میں مضمر ہے اور غلام اپنے کاموں میں آزاد نہیں ہوا کرتا۔ اس کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ جس سے چاہے دوستی کرے اور جس کو چاہے دشمن رکھے۔ وہ اس بات میں آزاد نہیں ہوتا کہ جس محفل میں چاہے بیٹھ جائے خواہ اس کے مفادات پر شدید ضرب ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ لہٰذا انؑ سے محبت کا دعویٰ کرنے سے پہلے انسان کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ آیا وہ انؑ کے دشمنوں سے ویسی دشمنی کر سکتا ہے جیسی وہ چاہتے ہیں؟۔ اور وہ کیسی دشمنی چاہتے ہیں وہ ہم آپ کی خدمت میں عرض کریں گے لیکن یہ بات بہرحال طے ہے کہ انسان پہلے اپنے ذاتی مفادات سے ہاتھ دھوئے تب اہلبیتؑ سے محبت کے بارے میں سوچے کیونکہ محبت ایک کھری اور خالص چیز ہے۔ اس میں سمجھوتے نہیں ہوا کرتے۔

جذبۂ رحم ایک پسندیدہ چیز ہے اور اسلام نے مخلوقِ خدا پر رحم کرنے کی تاکید کی ہے۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلانا، پیاسے کو سیراب کرنا، محتاج کی حاجت براری کرنا، یہ سب اخلاقِ حسنہ میں شمار ہوتے ہیں، یہاں تک کہ جانوروں تک کے ساتھ مہربانی کے ساتھ پیش آنا، انہیں اذیّت نہ دینا اور ان کی بھوک پیاس کا خیال رکھنا ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ لیکن اہلبیتؑ کا دشمن انسان تو کیا بلکہ جانوروں سے بھی بدتر جنس ہے

اور اگر اسے جانور بھی مانا جائے تو اس کا شمار موذی جانوروں میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں ہمیں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ انسانوں اور عام جانوروں سے مختلف ہیں اور ان احکام میں اتنی شدت ہے کہ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں انسان کا دین و مذہب تک خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہ اللہ کا عدل ہے اور اس کی حکمت ہے۔ بعض لوگوں پر انسان دوستی کا فرضی بھوت اس حد تک سوار ہوتا ہے کہ وہ احکامِ خدا تک پر اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ اگر انسان من حیث الکل واقعی کوئی ایسی مقدس گائے ہے جس کو ٹیڑھی نگاہ سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا تو پھر دنیا بھر میں عدالتیں کیوں قائم ہیں؟۔ پولیس کیا کر رہی ہے؟۔ جیل خانوں کا کیا کام ہے؟۔ سزائیں کیوں دی جاتی ہیں؟۔ پھانسی گھاٹ کیوں منھ کھولے کھڑے ہیں؟۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسان دوستی کے بلند و بانگ دعوے کرنے والوں کو جب بھی اقتدار ملا تو انسانوں پر سب سے زیادہ ظلم انہوں نے ہی ڈھائے ہیں۔ حقوقِ انسانی کا ڈھول پیٹنے والوں کا اگر اصلی چہرہ دیکھا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے پوری دنیا میں جنگ اور خونریزی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ہر سال لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور ہزاروں انسانی بستیوں کو اجاڑ کر ویران کر دیا جاتا ہے لیکن نعرہ وہی رہتا ہے کہ حقوقِ انسانی کی پاسداری ہر شے پر مقدم ہے۔ یہ سب کچھ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان اپنی ذات میں کچھ نہیں ہے۔ اصل شے عدل ہے یعنی جو شے جس قابل ہو اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا چاہیئے۔ دنیا بھر میں ہر روز کروڑوں جانور کاٹ کر

کھائے جاتے ہیں تو اس وقت وہ جذبۂ رحم کہاں چلا جاتا ہے؟۔ دوائیں چھڑک کر اربوں کی تعداد میں مچھروں، مکھیوں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کو مار دیا جاتا ہے۔ یہ کون سا رحم ہے؟۔ سانپوں، بچھوؤں اور دوسرے موزی جانوروں کو دیکھتے ہی مار دیا جاتا ہے یہ رحم کی کون سی اعلیٰ قسم ہے؟۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل قیمت انسان کی نہیں بلکہ مقصد کی ہوا کرتی ہے اور جو انسان اپنے مقصد کو پورا کرتے ہیں وہ تعداد میں بہت ہی قلیل ہیں، اتنے قلیل کہ انہیں کسی شمار میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔ اسی لئے اللہ نے فرمایا ہے کہ پوری انسانیت گھاٹے میں ہے سوائے چند قلیل لوگوں کے۔ یہ سب کچھ ہم نے اس لئے لکھا تا کہ دشمنانِ اہلبیتؑ کے بارے میں احکامِ خدا سن کر کسی کے پیٹ میں انسان دوستی کا مروڑ نہ اٹھنے لگے۔ ہم آپ کو بتا دیں کہ یہ زمین اور اس پر اُگنے والی تمام چیزیں، تمام اجناس اور تمام پھل۔ سارے دریا اور ان میں بہتا ہوا ٹھنڈا اور شیریں پانی اور ان میں بسنے والی مچھلیاں۔ یہ ساری فضا اور اس میں پھیلی ہوئی ہَوا، یہ سب کچھ جنابِ سیدہ فاطمۃ الزہراءؑ کی ملکیت ہے اور انہوں نے ان تمام چیزوں کو صرف اپنے محبوں کیلئے حلال کیا ہے۔ ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ ہیں وہ زمین پر چلتے ہیں تو حرام چلتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں تو حرام کھاتے ہیں، پانی پیتے ہیں تو حرام پیتے ہیں اور سانس لیتے ہیں تو حرام لیتے ہیں۔ یہاں اگر ان سے باز پرس نہیں کی جا رہی اور وہ حقِ زہراءؑ بے دریغ ہڑپ کئے جا رہے ہیں تو یہ سب اللہ کی رحمانیت کی وجہ سے ہے۔ لیکن رحمان اللہ ہے، ہم نہیں ہیں۔ ہمیں یہ زیب نہیں دیتا کہ دشمنانِ

اہلبیت کو پالنے پوسنے میں تعاون کریں۔ بلکہ ہمارا یہ فرضِ عین ہے کہ ہم ہر لحظہ ائمہؑ اطہار کے احکام کو پیشِ نظر رکھیں چاہے وہ ہماری خواہشات کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

۱۔ معانی الاخبار صفحہ ۱۵۷۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''جس نے ہمارے کسی دشمن کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا تو یقیناً اس نے ہمارے کسی دوست کو قتل کیا''۔

۲۔ معانی الاخبار صفحہ ۲۲۷۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''جو ہم اہلبیتؑ سے بغض رکھنے والے کی ذمہ داری اٹھائے کہ وہ اس کو کھانا کھلائے اور اس کی پیاس بجھائے تو جو شخص یہ کام انجام دے گا وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا''۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۵۸۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔

''اگر تمھارے باپ، دادا اور بھائی علیؑ کی ولایت پر کسی مخالف کی ولایت کو ترجیح دیں تو تم ان سے قطعِ تعلق کرلو اور جوان سے قطعِ تعلق نہ کرے گا تو وہ ظالم قرار پائے گا۔ نیز رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو ظالم سے محبت رکھے وہ بھی ظالم ہے''۔

یہاں لفظِ ''مخالف'' سے کوئی دھوکا نہ کھائے اور اس لفظ کو چند مخصوص افراد کی طرف نہ دھکیلے بلکہ یہ جان لے کہ ہر وہ شخص مخالف ہے جو ولایتِ علیؑ وائمہؑ میں شریک ہونا

چاہے یا امامِ زمانہ کے ہوتے ہوئے اپنی ولایت کا اعلان کرے چاہے اس پر لیبل کوئی بھی لگا ہوا ہو۔

۴۔حکمتِ بوتراب ج ۱صفحہ ۲۶۷۔امیر المومنینؑ نے فرمایا۔

''غدّاروں سے وفا کرنا اللہ کے نزدیک عینِ غدّاری ہے اور غدّاروں سے غدّاری کرنا اللہ کے نزدیک عینِ وفا ہے''۔اس فرمان سے وفا اور غدّاری کا صحیح مفہوم سمجھ میں آتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ اضافی (Relative) ہیں۔کسی مقام پر وفا، وفا رہتی ہے اور کسی مقام پر وفا، غدّاری بن جاتی ہے۔کسی مقام پر غدّاری، غدّاری رہتی ہے اور کسی مقام پر غدّاری، وفا بن جاتی ہے۔یعنی اہلبیتؑ اور ان کے دوستوں سے وفا اور اہلبیتؑ کے دشمنوں سے غدّاری ہی عینِ ایمان ہے۔

۵۔اور اب ہم دشمنانِ اہلبیتؑ کی ایک نئی قسم بیان کرتے ہیں۔یہ فرمان حضرتِ امیر المومنینؑ کا ہے جو کتاب ''محبت'' کے صفحہ ۴۲۷ پر موجود ہے۔آپ فرماتے ہیں۔

''اللہ دو اشخاص کو بڑا دشمن سمجھتا ہے۔ایک وہ جسے اس نے اُس کے نفس کے حوالے کر دیا ہو (کہ جو اس کے جی میں آئے کرے۔اسے توفیق اٹھالینا کہتے ہیں) اور نتیجے میں وہ راہِ راست سے بھٹک گیا ہو۔دوسرے وہ جو (کسی کے) بدعتی کلام کا شیفتہ ہو گیا ہو اور روزے نماز کا پابند ہو گیا ہو''۔

غیر سے محبت

ہم محبت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرر ہے ہیں، مثبت پہلو بھی اور منفی پہلو بھی۔ اور اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں کہ جب تک منفی پہلو کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے اس وقت تک محبت سمجھ میں نہیں آسکتی اور ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس بارے میں شیعوں کی اکثریت غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ اکثر وبیشتر لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ اہلبیتؑ کے دشمن انہی کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔ پھر خدا جانے انہیں آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ بہت سے وہ ہیں جو دشمنانِ اہلبیتؑ کو شیعوں کے علاوہ دوسرے مکاتبِ فکر میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اپنا نام شیعہ رکھ لینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان سچا اور کھرا محبِّ اہلبیتؑ بن گیا۔ حالانکہ اہلبیتؑ دشمنی کسی مذہب یا فرقے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک قلبی کیفیت ہے جس سے کوئی بھی انسان دو چار ہوسکتا ہے چاہے وہ کسی بھی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا ہو۔ اس لئے ہم بھی دشمنیٔ اہلبیتؑ کو ایک کیفیت کے طور پر زیرِ بحث لا رہے ہیں۔ ہمارا مقصد مسلمانوں کے کسی خاص مکتبِ فکر کو ہدف بنانا ہرگز نہیں ہے اور ایسا کبھی کرنا بھی نہیں چاہیئے۔ انسان کا فرض ہے کہ پہلے اپنے گھر کی طرف دیکھے، بعد میں باہر جھانکے۔

اہلبیتؑ کا غیر کون ہے؟۔ کیا اس سے چند مخصوص افراد مراد ہیں یا کوئی مستقل کسوٹی ہے

جس پر کسی کو پرکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ آیا وہ غیر کے زمرے میں آتا ہے یا نہیں؟۔ یقیناً ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ دشمنِ اہلبیت کو چند مخصوص افراد تک محدود کر دینا دیگر تمام مجرموں کو پناہ دینے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ہمیں طے کرنا پڑے گا کہ ہم لوگوں کو کس معیار پر جانچیں اور پھر اس معاملے میں اپنے اور پرائے میں فرق نہ کریں۔

ذیل میں ہم چند کسوٹیوں کا ذکر کر رہے ہیں تا کہ اہلبیتؑ کے غیر کا تعین کیا جا سکے۔

۱۔ اہلبیتؑ سے دشمنی: یہاں ہمیں دشمنی کے بارے میں ایک شفاف نظریہ اپنانا پڑے گا کیونکہ اس بارے میں اکثر شیعہ تذبذب کے عالم میں ہیں۔ جو اہلبیتؑ کی جان لینے کے در پے ہو وہ ان کا دشمن ہے۔ جو انؑ پر ظلم کرے وہ انؑ کا دشمن ہے۔ جو انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے وہ انؑ کا دشمن ہے۔ جو انؑ کے مشن کو نا کام بنانے کی کوشش کرے وہ ان کا دشمن ہے۔ جو انؑ کی بات کو رد کرے وہ ان کا دشمن ہے۔ جو ان کی شان گھٹائے وہ ان کا دشمن ہے جو لوگوں کو انؑ سے غافل کرے وہ ان کا دشمن ہے۔ جو انؑ کی برابری کا دعویٰ کرے وہ ان کا دشمن ہے۔ جو ان کا کوئی بھی حق غصب کرے وہ ان کا دشمن ہے اور حق سے مراد صرف فدک اور خلافت ہی نہیں ہے بلکہ اس میں انؑ کی امامت، انؑ کی ولایت، انؑ کی اطاعت، ان کی مرجعیّت، انؑ کا خمس اور انؑ کے القاب بھی شامل ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شیعہ حضرات کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ ان کا دل اس بات کو نہیں مانتا کہ وہ لوگ جو صدیوں سے شیعوں کے سربراہ کے طور پر جانے جاتے ہیں، جنہوں نے بڑا ابھاری اور قیمتی لباس پہنا ہوا ہے جسے وہ لباسِ علمی کہتے

ہیں، جو لوگوں کو مسائلِ شرعی بتاتے ہیں اور جن کی عملاً پوجا کی جاتی ہے، وہ بھی اہلبیتؑ کی دشمنی کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟۔ یہ وہم ان کے دل میں اسلئے بیٹھا ہوا ہے کہ وہ اپنے دین و مذہب کو چند شخصیات سے پہچانتے ہیں۔ ان کے ذہنوں کی تربیت کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ وہ حق کو حق کے ذریعے پہچاننے کے بجائے چند لوگوں کے ذریعے پہچاننا چاہتے ہیں۔ شخصیت پرستی کا یہی سحر ہے جس نے ان کی عقلوں کو ماؤف کر رکھا ہے اور وہ حق و باطل میں تمیز کرنے سے قاصر ہیں حالانکہ ان شخصیات کے چہروں سے بہت سے نقاب اٹھ چکے ہیں اور باقی نقاب بھی انشاء اللہ جلد ہی اٹھ جائیں گے۔ غضب یہ ہوا کہ ان کی محبوب شخصیات نے چھین جھپٹ کرکے ایک خطۂ زمین پر اقتدار بھی حاصل کرلیا ہے اور اقتدار پرستی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ لیکن جو صحیح الدماغ لوگ ہوتے ہیں وہ آدمی کو نہیں بلکہ اس کے کام کو دیکھتے ہیں اور ہم قوی امید رکھتے ہیں کہ خس خاشاک کے علاوہ جتنے بھی لوگ عقل رکھنے والے ہیں وہ ایک نہ ایک روز حقیقت تک ضرور پہنچ جائیں گے اور جان لیں گے کہ کون اہلبیتؑ کا دشمن ہے اور کہاں بیٹھا ہوا ہے۔

۲۔ <u>اہلبیتؑ کے دشمن کا دوست</u>: یہاں آکر کچھ لوگوں کو ہوش آنا شروع ہو جاتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی محبوب شخصیات ایسے لوگوں کی بغل میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں جو اہلبیتؑ کے علانیہ دشمن ہیں، <u>معاویہ اور یزید کو خلیفۂ رسول مانتے ہیں اور بارہ اماموں کی فہرست میں ان</u>

دونوں کو شامل کرتے ہیں اور یہ سب کچھ تقیے کے طور پر نہیں بلکہ حصولِ اقتدار کی خاطر کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی کسی کی دینی حمیّت بیدار نہیں ہوتی تو وہ اپنی طینت کی خبر لے۔ لیکن جو اہلبیتؑ کا دوست ہے وہ ان چہروں کو خوب پہچانتا ہے اور زبان سے نہ سہی لیکن دل سے ان پر ضرور تبرّا کرتا ہے۔

۳۔ اہلبیتؑ کے دوست کا دشمن: اس مقام پر بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ محبت کے خواص ہم بیان کر چکے۔ محبّ ہر حال میں اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی خوشی میں خوش ہوتا ہے اور اس کے غم میں غمگین ہوتا ہے۔ اب جو شخص ایسے لوگوں کا دشمن ہو اور جو کسی کو محض اسلئے دشمن رکھتا ہو کہ وہ علیؑ ولی اللہ کیوں کہتا ہے، وہ ذکرِ اہلبیتؑ کیوں کرتا ہے اور غمِ حسینؑ میں اپنے آپ کو زخمی کیوں کرتا ہے تو اس کے دشمنِ اہلبیتؑ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا اور ہمیں ایسے شخص کے ساتھ وہی رویّہ اختیار کرنا چاہیئے جو دشمنِ اہلبیتؑ کے ساتھ رکھا جاتا ہے اور جس کا حکم ہمیں خود اہلبیتؑ نے دیا ہے۔

۴۔ اہلبیتؑ کے مقابلے میں آنے والا: رسولؐ اللہ نے جنگِ خندق کے دن قیامت تک کیلئے یہ حتمی فیصلہ دے دیا تھا کہ جو بھی، جس مقام پر بھی اور جس زمانے میں بھی علیؑ کے مقابل آئے وہ کُلِ کفر ہوتا ہے۔ وہ لوگ کوتاہ نظر ہیں جو اس بات کو عمرو ابن عبدود تک محدود رکھتے ہیں۔ ایک عقلمند انسان کو اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں اور ہر اُس شخص کو دشمن رکھنا اپنے اوپر واجب کر لینا چاہیئے جو کسی بھی معاملے میں علیؑ کے مقابل آنا

چاہتا ہو چاہے اس شخص کا تعلق کسی بھی گروہ سے ہو۔

ہم نے ان لوگوں کی نشاندہی کر دی ہے جو اہلبیتؑ کے غیر کے زمرے میں آتے ہیں تاکہ جب آپ ایسے لوگوں کے بارے میں احکامِ معصومینؑ پڑھیں تو انؑ کے غیر کو شناخت کرنے میں آپ کو دشواری محسوس نہ ہو۔

ا۔تفسیرِ فرات صفحہ ۳۸۔مولا امیر المومنین فرماتے ہیں۔

''تین آدمی نجات پانے والے ہیں۔ ہمارا محبّ، ہمارا دوستدار اور اُن لوگوں سے دشمنی رکھنے والا جو ہمیں دشمن رکھتے ہیں۔ آدمی کو اپنے دل کو ٹٹولنا چاہیئے کیونکہ اللہ نے آدمی کے اندر دو دل خلق نہیں کئے کہ ایک سے محبت کرے اور دوسرے سے بغض رکھے۔ جس کے دل میں ہمارے غیر کی محبت ہے وہ ہمارا قاتل ہے یا ہم پر ظلم کرنے والا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسے شخص کا دشمن اللہ تعالیٰ، جبرئیل اور میکائیل ہیں اور اللہ صرف کافروں کو ہی دشمن رکھتا ہے''۔ مولاؑ کے اس فرمان پر انتہائی توجہ کی ضرورت ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے چاروں طرف نظر دوڑائے اور جہاں بھی اسے علیؑ کا غیر نظر آئے تو اس کے بارے میں یہ یقین رکھے کہ وہ علیؑ کا قاتل ہے یا علیؑ پر ظلم کرنے والا اور اللہ کی نظر میں کافر ہے۔ اور پھر اس سے ویسی ہی دشمنی رکھے جیسا کہ دشمنی رکھنے کا حق ہے کیونکہ غیر سے دشمنی کے بغیر اہلبیتؑ سے محبت کا کوئی تصور نہیں ہے کیونکہ وہ کھوٹی چیز کے خریدار نہیں ہیں اور کھرا بننے کیلئے خود کو

پگھلانا اور خود سے میل کچیل کو دور کرنا ضروری ہوتا ہے جیسا کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے کہ "ہمارے دوست ہمارے ساتھ ایسی خالص دوستی رکھتے ہیں جیسے سونے کو اگر آگ میں ڈالا جائے تو اس کی ملاوٹ ختم ہوجاتی ہے اور وہ خالص ہوجاتا ہے"۔ (القطرۃ من بحار ج ۱ صفحہ ۴۷)۔ اور جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "جس نے دنیا سے محبت کی اور ہمارے غیر سے دوستی رکھی تو اس نے سرے سے ہم سے محبت کی ہی نہیں"۔ (تفسیر نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۵۲)۔

۲۔ تورات میں اللہ فرماتا ہے کہ جو مجھے ڈھونڈتا ہے وہ مجھے پالیتا ہے لیکن جو میرے غیر کو ڈھونڈتا ہے وہ مجھے نہیں پاسکتا"۔ (محبت صفحہ ۲۸۲)۔

۳۔ تفسیر نور الثقلین ج ۱ صفحہ ۵۸۵۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

"اللہ پر حق ہے کہ جس کسی کے دل میں بھی مولا علیؑ کے حریفوں کی رائی کے دانے برابر محبت ہوگی وہ اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا"۔

۴۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ "ہمارے علاوہ لوگوں کو اپنا سہارا مت بناؤ کیونکہ ہمارے علاوہ ہر سہارا طاغوت ہے"۔ تفسیر نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۴۵)۔

۵۔ القطرۃ من بحار ج ۱ صفحہ ۴۷۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔

"جو کوئی یہ جاننا چاہے کہ وہ ہمیں دوست رکھتا ہے یا نہیں تو اپنے دل کا امتحان کرے۔ اگر ہماری دوستی کے ساتھ ہمارے دشمن کی دوستی کو شریک رکھے تو وہ ہمارا نہیں ہے اور

ہم اس سے نہیں ہیں''۔

ان تمام فرامینِ معصومینؑ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ محبت کا امتحان غیر سے دشمنی کے ذریعے کیا جاتا ہے لہٰذا جسے دشمنی کرنا نہیں آتا وہ ہرگز محبت نہیں کر سکتا۔

صحبتِ ناجنس

ہم نے عرض کیا تھا کہ جہاں ہم اپنی دوستی اور دشمنی میں آزاد نہیں ہیں اُسی طرح محبت ہمیں پابند کرتی ہے کہ ہم ہر کس و ناکس کی صحبت اختیار نہ کریں کیونکہ یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے۔تنہائی کی اذیّت جھیلنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم اپنے محبوب کے کسی دشمن کے ساتھ وقت گزاریں اور اس بارے میں احکام بہت واضح ہیں۔

۱۔امام زین العابدینؑ نے فرمایا۔''انسان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ جس کے ساتھ چاہے بیٹھ جائے''۔(تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۲۶۷)

۲۔مندرجہ بالا حوالے میں ہی امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔

''تین طرح کی محافل اللہ کو ناپسند ہیں اور اللہ ان پر اپنا عذاب بھیجتا ہے۔تم ان مجالس میں شرکت نہ کرو اور ان کے ساتھ نشست و برخواست نہ رکھو:۔

(الف)۔وہ مجلس جس میں جھوٹے فتاویٰ جاری ہوتے ہیں۔

(ب)۔وہ مجلس جس میں ہمارا ذکر بوسیدہ اور ہمارے دشمنوں کا ذکر تر و تازہ ہو۔

(ج)۔وہ مجلس جہاں ہماری محبت سے روکا جاتا ہو اور تمھیں معلوم ہو۔

شق (الف) کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں تو جھوٹے فتاویٰ کا ذکر ہے، سچے فتاویٰ کا نہیں تو ہم یہ واضح کر دیں کہ فتوے ہمیشہ جھوٹے ہی ہوا کرتے ہیں کیونکہ فتویٰ کے معنی ہیں ''ذاتی رائے'' اور قرآن وحدیث کو چھوڑ کر جو چیز بھی اپنے دماغ سے پیدا کی جائے گی وہ یقیناً جھوٹی ہوگی۔

۳۔ معصومؑ نے فرمایا۔ ''جو بھی کسی قوم سے دوستی رکھے وہ ان میں سے قرار پاتا ہے اگر چہ ان کی جنس علیحدہ ہی کیوں نہ ہو''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۲۸۸)۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر کوئی کتّوں کو دوست رکھتا ہے تو اس کا شمار بھی کتّوں میں ہی ہوگا اگر چہ اس کی جنس کتوں سے الگ ہے۔ دشمنِ اہلبیتؑ کتوں سے بھی نجس تر ہے۔ پس جو دشمنانِ اہلبیتؑ کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو وہ خود حساب لگا لے کہ اس کا تعلق کس جنس سے ہے۔

۴۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''جو کوئی بھی ایسے شخص کے ساتھ بیٹھے جو ہمارے عیب بیان کرتا ہو، یا ایسے شخص کی تعریف کرے جو ہمیں پیٹھ دکھا گیا ہو، یا ایسے شخص کے ساتھ رابطہ کرے جو ہم سے رابطہ منقطع کر چکا ہو، یا ایسے شخص سے رابطہ یا تعلق ختم کرے جس کا ہمارے ساتھ تعلق ہو، یا ہمارے دشمن کے ساتھ دوستی کرے، یا ہمارے دوست کے ساتھ دشمنی کرے تو یقیناً اس نے سورۂ حمد اور قرآنِ عظیم کو نازل کرنے والے اللہ کے ساتھ کفر کیا''۔ (القطرۃ من بحار ج ۱ صفحہ ۴۷)۔

اس حدیثِ مبارکہ میں امامؑ نے محبت اور دشمنی کی پوری حقیقت کھول کر سامنے رکھ دی ہے۔ لہٰذا اسے پڑھیئے، پھر پڑھیئے اور پھر پڑھیئے تاکہ محبت کے بارے میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے اور اپنا جائزہ خود لینے میں آسانی ہو جائے۔

دین بس یہی ہے

ہم نے محبت کے بارے میں بھی گفتگو کی اور دشمنی کے بارے میں بھی۔ ہم نے خاص طور پر اس بات پر زور دیا کہ محبت کو پرکھنے کا معیار دشمنی ہے کیونکہ دشمنی ہی وہ چیز ہے جو محبت کو خالص کرتی ہے اور ملاوٹ والی محبت اہلبیت کو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے۔ اگر ان نازک مراحل سے آپ بحسن وخوبی گزر چکے ہیں تو اب یہ جان لیجئے کہ جس دین پر آپ کاربند ہیں اُس کی اصل حقیقت صرف اور صرف محبت اور دشمنی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دین کوئی شے ہے ہی نہیں۔

اس مقصد کیلئے ہمیں یہ جائزہ لینا پڑے گا کہ مقصدِ خلقت کائنات ہے کیا اور خالقِ کائنات کو کیا ضرورت آپڑی تھی کہ وہ اشیاء کو عدم سے نکال انہیں زیورِ وجود سے آراستہ کرے اور پھر جزاء وسزا کا ایک مکمل نظام تشکیل دے۔ جب تک یہ بات واضح نہ ہو جائے اس وقت تک ہمارے مندرجہ بالا دعوے کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان مقاماتِ عالیہ تک محض اپنی عقل کے بل بوتے پر نہیں پہنچا جا سکتا اسلئے ہمیں ان پاک ہستیوں کی طرف لازماً رجوع کرنا پڑے گا جو ان مقامات کے محرمِ راز

ہیں۔ پس جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں وہ کسی فلسفی کی نازک خیالی یا کسی صوفی کی لن ترانی نہیں ہے بلکہ ایک دعوتِ تفکر وتدبر ہے جس کی بنیاد فرامینِ معصومینؑ ہیں۔

حسن اپنی تنہائیوں میں یکتا تھا۔ ایسی تنہائی کہ اس کیلئے لفظ تنہائی بھی گستاخی کے زمرے میں آتی ہے کیونکہ وہاں دوئی کا گزر تک نہیں ہے یہاں تک کہ تنہائی بھی اس بارگاہ میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ یہ وہ چیز ہے جو ہمارے وہم وگمان سے ماوراء ہے اس لئے صرف سمجھنے سمجھانے کیلئے ہم اس کو تنہا کہتے ہیں۔ لیکن کیا حسن تنہا رہ سکتا ہے؟۔ ہرگز نہیں! کیونکہ حسن پرستش کا طلبگار ہے جس کیلئے کوئی پرستش کرنے والا چاہیئے۔ لیکن یہ پرستش کی طلب کیوں ہوتی ہے؟۔ آپ اگر اس سوال پر غور فرمائیں گے تو ضرور اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس طلب کی بنیاد حسن کی خود اپنی ذات سے محبت ہے۔ حسن جب اپنی رعنائیوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنی ہی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غالبؔ اس صورتحال کی عکاسی کرتے ہوئے فرماتے ہیں

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

یہی وہ منزل ہے جب آواز آتی ہے۔ ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ مجھے محبت ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں۔ پس میں نے ایک خلق کو خلق کیا (تا کہ وہ مجھے پہچانے اور پہچان کر مجھ سے محبت کرے)''۔ آپ خود سوچئے کہ جب اُس حسنِ یکتا کے سوا وہاں کوئی

تھا ہی نہیں تو اسے محبت کس سے ہوگئی؟۔یقیناً اسے اپنے آپ سے محبت ہوئی اور تب اس نے چاہا کہ کوئی اور بھی اس سے محبت کرے، وہ محبت جسے پرستش کہتے ہیں، وہ محبت جو پوشیدہ رہتی ہے تو اس کا مقام دل ہوتا ہے اور جب ظاہر ہوتی ہے تو پیشانی پر آ کر اپنے محبوب کی امانت بن جاتی ہے اور جب پیشانی محبوب کے قدموں تک پہنچتی ہے تب جا کر یہ امانت ادا ہوتی ہے۔لیکن اس کیلئے ضروری تھا کہ وہ حسنِ یکتا ہوئیت سے الوہیت کی طرف نزول کرے تا کہ محبت کرنے والوں کی پیشانیاں اس کے قدموں تک پہنچ سکیں۔ یہی مقام **لا الٰہ الّا اللہ** ہے جس پر لوگ جھگڑا کرتے ہیں اور شرک کی پکار لگاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ یہ اُس حسنِ ازلی کا مقامِ نزول ہے۔

ہمارے ایک کرم فرمانے ہماری ہمت افزائی کرتے ہوئے فرمایا کہ "آپ نے علمِ الٰہیات میں قابلِ قدر اضافہ کیا"۔تو ہم نے عرض کیا کہ علمِ الٰہیات تو فلاسفہ کا موضوع ہے جس کی منزلِ آخر الوہیت ہے۔ ہمارا موضوع الٰہیات نہیں بلکہ "تجلیّات" ہے اور الوہیت میرے مولاؑ کے مقامات میں سے ایک مقام ہے جو بندوں کی پہنچ میں ہے۔اس سے آگے ہوئیت ہے جس کی طرف **"ھُو"** کا اشارہ جاتا ہے اور اس سے آگے ہمیں کچھ پتہ نہیں اور نہ ہم پتہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ایسی کوشش دیوانے ہی کر سکتے ہیں جن کا مقصد فقط ذہنی عیاشی ہوتا ہے۔

عرض یہ کیا گیا کہ ابتدائے خلق حسن کی اپنے آپ سے محبت ہے اور مقصدِ خلق مخلوق کی اس حسنِ مطلق سے محبت ہے جو پرستش کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور پرستش چند معیّن حرکات وسکنات کا نام نہیں بلکہ اپنے محبوب کی محبت میں بے خود ہو کر اپنے آپ کو مٹی میں ملا دینے کا نام ہے۔ محبت اپنے محبوب کا قرب حاصل کرنے کیلئے ساری دنیا کو چھوڑ دینے کا نام ہے اور یہی ہمارے محبوب کا ہم سے مطالبہ ہے جیسا کہ سورۂ مزمّل کی آٹھویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ **"وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا"**۔ یعنی (اے رسولؐ! تو اپنے رب کے اسم کا ذکر کیا کر اور سب سے کٹ کر اُسی کا ہو جا)۔

یہ موضوع بہت مشکل ہے لیکن ہم نے اپنی بساط بھر یہ کوشش کی ہے کہ آپ تک اس موضوع کی حقیقت پہنچا دی جائے اور آپ یہ جان لیں کہ پوری کائنات کا اوّل و آخر محبت ہے اور دین اس محبت کے آداب سکھانے کیلئے ہی بھیجا گیا ہے۔ پس جو محبت کی آگ میں کود پڑا وہی دیندار ہے اور جو اس موقعے پر سہم گیا وہ دین سے خارج ہو گیا اور ہم آپ کو بتا دیں کہ روزِ ازل جب اس بات کا فیصلہ کیا گیا تھا کہ کون مومن ہے اور کون کافر، کون جنّتی ہے اور کون جہنّمی، کون اللہ کی پارٹی میں ہے اور کون شیطان کی پارٹی میں، تو یہ امتحان بھی اسی محبت کی آگ کے ذریعہ لیا گیا تھا۔ پس جو اس میں کود پڑا وہی مومن ٹھہرا اور جو ٹھٹھک کر باہر رہ گیا وہی کافر قرار پایا۔ جس نے محبت کی تپش برداشت کر لی وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جہنم کی آگ سے محفوظ ہو گیا اور جو اس کی آنچ سے ڈر

گیا تو جہنم کی دائمی آگ اس کا مقدر ہے۔

محبت کا یہ بندھن جسے دین کہتے ہیں اُس دین سے یکسر مختلف ہے جو ڈنڈے کے زور پر چلتا ہے۔ یہاں خوف اور امید کا مطلب کچھ اور ہے۔ یہاں گناہ اور نیکی کا تصور عوامی تصور سے بالکل جدا ہے۔ یہاں خوف سے مرادِ محبوب کی دوری اور امید سے مرادِ محبوب کی قربت ہے۔ یہاں گناہ کا مطلب محبوب کے حق میں کوتاہی کرنا اور نیکی کا مطلب محبوب کی خوشنودی چاہنا ہے۔ جو لوگ دینِ ابلیس پر ہیں وہ تو اسی چیز سے ڈرتے ہیں جس سے ان کا پیرو مرشد ڈراتا ہے اور اسی چیز پر مٹے ہوئے ہیں جو اس نے سجا کر ان کے سامنے رکھ دی ہے لیکن دینِ خدا کوئی اور چیز ہے۔ یہاں صرف تصورِ محبوب ہی سب کچھ ہے۔

ایک شخص امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آپؑ پر قربان جاؤں، جب کبھی میں اکیلا ہوتا ہوں تو شیطان میرے پاس آتا ہے اور مجھے میرے گناہانِ گزشتہ اور برائیوں کی یاد دلاتا ہے اور میرے دل میں اس قدر وسوسے ڈالتا ہے کہ مجھے یاس اور ناامیدی کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اُس وقت میں آپؑ کے ساتھ اپنی محبت، ارتباط اور وابستگی کو یاد کرتا ہوں اور میرے اندر امید پیدا ہو جاتی ہے۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''اے زیاد! کیا محبت اور دشمنی کے علاوہ دین کوئی اور چیز بھی ہے؟''۔ (القطرۃ من بحار ج۲ صفحہ۴۲)۔

ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب پھر گزارش کر رہے ہیں کہ دین کا مقصد فقط یہ فیصلہ

کرنا ہے کہ کون کس کا آدمی ہے؟ کون کس کا دوست ہے اور کون کس کا دشمن؟۔ کون ہے جو علیؑ سے محبت کرکے مقصدِ خلقتِ کائنات کو پورا کررہا ہے اور کون ہے جو علیؑ کے غیر سے وابستہ ہوکر اُس محبوبِ ازلی کے مشن کو نا کام بنانا چاہتا ہے۔ اسی تقسیم کا نام دین ہے۔ دنیا میں بھی نجابت و شرافت کا معیار یہی ہے اور آخرت میں بھی یہی میزان نصب کیا جائے گا جس پر تمام مخلوقات کا وزن ہونا ہے۔ جیسا کہ معصومؑ فرماتے ہیں۔ ''قیامت کے دن دو گروہ ہوں گے۔ ایک علیؑ کو دوست رکھنے والا اور ایک علیؑ کو دشمن رکھنے والا''۔ (القطرۃ من بحار ج ۱ صفحہ ۱۸۱)۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ بات صرف اس زمین تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دستِ خلّاقِ عالمین نے جو خط بھی کھینچا ہے اُس کا رخ اپنی محبت کی طرف پھیرا ہوا ہے۔ بلکہ ہم پر تو پھر بھی کچھ عباداتِ ظاہری عائد کی گئی ہیں لیکن ہزاروں مقامات ایسے ہیں جہاں سوائے محبت کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ جیسا کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''اللہ نے اِس دنیا جیسے بارہ ہزار جہان ایسے خلق فرمائے ہیں کہ وہاں کے رہنے والے یہ نہیں جانتے کہ اللہ نے آدمؑ اور ابلیس کو پیدا کیا ہے۔ اُن پر ہماری ولایت اور ہمارے دشمنوں سے بیزاری کے علاوہ کچھ واجب نہیں کیا گیا''۔ (القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۶۵، ۶۶)۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ کا ایک ہی دین ہے۔ یہ نہیں ہے کہ زمین پر کوئی اور دین ہے اور آسمان پر کوئی اور۔ لہٰذا اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ زمین پر نظامِ عبادات اور قوانینِ شرعی کی اصل حقیقت کیا ہے۔ کیونکہ اگر یہ بالذّات مقصود ہوتے تو اُن بارہ ہزار عالمین پر بھی ان کا

اطلاق ضرور ہوتا۔لیکن وہاں ان کا اطلاق نہ ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ اپنی ذات میں مقصودِ خداوندی نہیں ہے بلکہ یہ تمام چیزیں ہمارے مقصدِ اصلی کی طرف ہماری توجہات مبذول کرانے کا ایک ذریعہ ہیں اور ہمیں غفلت سے بچانے کا ایک طریقہِ کار ہے۔پس جس شخص کی عبادت اس میں ارتکازتوجہ پیدا کرے اور اُس کے محبوب کو اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دے وہ کامیاب و کامران ہے اور جس شخص کی عبادت اسے اس کے محبوب سے غافل کرتی ہو تو سمجھو کہ وہ اپنی عبادتوں کی گٹھری سر پر اٹھائے ہوئے ذلّت اور بربادی کے سمندر میں غرق ہوگیا۔یہی دین ہے اور یہی اسلام ہے۔سورۂ زخرف کی آیت ''جو ایمان لائے ہماری آیات پر اور وہ مسلمین تھے'' کی تفسیر میں امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں۔''اس آیت میں مسلمین کے معنی محبین کے ہیں''۔(تفسیرِ فرات صفحہ ۲۹۰)۔اور رسول اللہؐ نے فرمایا۔ ''ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے اور دین کی بنیاد میرے اہلبیتؑ کی دوستی ہے''۔ (کوکبِ درّی صفحہ ۱۷۳)۔یہ وہی دوستی ہے جس سے انسان کا نسب پہچانا جاتا ہے۔بعض لوگ ان باتوں کا برا مناتے ہیں اور اسے گالی سمجھتے ہیں لیکن وہ یقین کرلیں کہ یہ کسی غصّے یا نفرت کا اظہار نہیں بلکہ حقیقتِ حال ہے۔طہارت ونجاستِ ولادت کا مکمل دارومدار اسی دوستی اور اسی دشمنی پر ہے۔اس میں ماں باپ کا کوئی کمال یا کوئی قصور نہیں ہوتا بلکہ آنے والے کی اپنی ایک مستقل حیثیت ہوتی ہے۔اہلبیتؑ کا دوست کبھی مقاماتِ حرام پر نہیں جاتا جبکہ ان کا دشمن ان مقامات کا خود انتخاب کرلیتا ہے کیونکہ اسے دنیا میں

آنے اور یہاں کی لذتوں کے حصول کی جلدی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں باپ اگر توبہ کرلیں تو اللہ ان کا گناہ معاف کردیتا ہے لیکن آنے والا ہرگز نہیں بخشا جاتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ کا کوئی قصور نہیں ہوتا تب بھی آنے والا خبیث الولادت قرار پاتا ہے۔ ان بے چاروں کو تو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہوا کیا ہے لیکن شیطانِ رجیم اپنا کام کر جاتا ہے اور آنے والا موقعے کو غنیمت جانتے ہوئے اِس دنیا میں آجاتا ہے۔ جیسا کہ القطرۃ من بحارج ۱صفحہ ۲۱۴ پر ابلیس کا ایک مکالمہ درج ہے جسمیں وہ جنابِ امیر المومنین ؑ سے کہتا ہے۔ ''خدا کی قسم آپؑ سے کوئی دشمنی نہیں کرے گا مگر یہ کہ اس کے باپ کے نطفے سے پہلے میرا نطفہ اس کی ماں کے رحم میں گیا ہوگا''۔ اسی لئے امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''ہم سے برائی کرنے میں جلدی وہی کرتا ہے جس کی ولادت مشکوک ہو''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۴۲۵)۔ واضح رہے کہ معصومؑ نے یہاں لفظِ ظلم استعمال نہیں فرمایا بلکہ لفظِ ''برائی'' کا انتخاب کیا ہے۔ اِس حکمت پر آپ خود غور فرمائیں کیونکہ ظلم کے مقابلے میں برائی ایک چھوٹا لفظ ہے اور اس کے بارے میں ہم پہلے ہی بہت کچھ عرض کر چکے ہیں۔ یہاں تک ہم نے دشمنِ اہلبیتؑ کے نسب کیطرف چند اشارات دئے اور اب ہم اُس کی شان بیان کرتے ہیں جس کی ولادت کو اللہ نے طیّب وطاہر قرار دیا ہے اور یہ وہی ہے جس نے اہلبیتؑ سے کو لگائی ہوئی ہے اور ان کے غیر سے دشمنی جس کا منشور ہے۔

القطرۃ من بحارج ۱صفحہ ۳۱۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''ہم اہلبیتؑ کی محبت اور دوستی کو اللہ عرش کے نیچے خزانوں میں سے آسمان سے نازل کرتا ہے، جیسے سونے اور چاندی کے خزانے ہوں۔ اور ان کو مقدارِ معیّن کے علاوہ نازل نہیں کرتا اور اپنے بہترین بندوں کے سوا کسی کو عطا نہیں کرتا۔ اور اس کے لئے ایک بادل ہے، بارش برسانے والے بادل کی طرح۔ جب اللہ چاہتا ہے کہ اِس محبت (یعنی محبتِ اہلبیتؑ) سے اُس کو بہرہ مند کرے جسے وہ دوست رکھتا ہے تو اُس بادل کو برسنے کی اجازت دیتا ہے۔ اُس وقت وہ برستا ہے اور جو بچہ ماں کے شکم میں ہوتا ہے وہ بھی اس سے مستفید ہوتا ہے''۔

آپ کو یقیناً علم ہو گیا کہ محبِّ اہلبیتؑ کس طرح اس دنیا میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمادیا ہے کہ ''اصل نسب (خاندان) مودّت ہے''۔ (حکمتِ بوتراب ج ا صفحہ ۴۳)۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر کوئی مجھ سے میرا نسب پوچھے اور میں یہ کہوں کہ میں اولادِ علیؑ و فاطمہؑ ہوں تو اس سے میری قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ اولادِ علیؑ و فاطمہؑ میں تو اچھے برے سبھی شامل ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے نام کے ساتھ ''سیّد'' لگاتے ہیں اور پھر اپنے باپ ہی کے خلاف زہر اُگلتے ہیں۔ لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں علیؑ و فاطمہؑ کی مودّت کا بیٹا ہوں تو یہ بات یقیناً میرے لئے باعثِ فخر ہوگی کیونکہ میرے نبیؐ نے فرمادیا ہے کہ ''اصل نسب مودّت ہے''۔

ہم نے امام جعفر صادقؑ کا جو فرمان پیش کیا ہے اس سے چند باتیں سامنے آتی ہیں جن پر تدبر کرنا ضروری ہے کیونکہ قولِ معصومؑ سے سرسری طور پر گزر جانا کوئی فائدہ نہیں

پہنچاتا۔ ہمارے لئے یہ جاننا انتہائی ضروری ہے کہ اللہ کی محبت کیا ہوتی ہے اور کیا یہ محبت (معاذ اللہ) قرعہ اندازی کے ذریعے کی جاتی ہے یا اس کیلئے کسی استحقاق کا ہونا ضروری ہے؟

اللہ کیسے محبت کرتا ہے؟

محبت بے سبب نہیں ہوتی بلکہ اس کیلئے کسی نہ کسی استحقاق کی ضرورت ہوتی ہے اور اس استحقاق کی بنیاد علم، مشاہدہ، تجربہ اور معرفت ہوا کرتی ہے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہماری ہر چیز ناقص ہے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ آج اگر کوئی ہم سے محبت سے پیش آتا ہے اور ہم سے اچھا سلوک کرتا ہے تو ہم اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور کل اگر وہی شخص ہمارے ساتھ کوئی برا سلوک کردے تو ہم اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس شخص کو پوری طرح جانتے نہیں اور صرف وقتی تجربات پر بھروسا کرتے ہیں۔ اسی لئے ہماری محبتیں اور نفرتیں عارضی ہوتی ہیں اور آج کی محبت کل کی نفرت اور کل کی نفرت آج کی محبت میں بدلتی رہتی ہے۔ لیکن اللہ علیم بالذات ہے۔ وہ اپنی ہر مخلوق کی حقیقت سے واقف ہے لہٰذا اس کی محبت ویسی نہیں ہوتی جیسی ہماری ہوتی ہے بلکہ وہ مستقل بنیادوں پر محبت یا دشمنی کرتا ہے جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "<u>جب اللہ کسی سے محبت کرتا ہے تو کبھی اس سے نفرت نہیں کرتا۔ اور جب کسی سے بغض رکھتا ہے تو کبھی اُس سے محبت نہیں کرتا</u>"۔ امامؑ کا یہ فرمان اس

نظریے کی نفی کرتا ہے کہ انسان اگر کوئی نیکی کرے تو اللہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے اور اگر گناہ کرے تو اللہ اس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ یہ نظریہ مولویوں کا ہے جس کی تردید امامؑ نے کی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہمیشہ سے اس بات سے واقف ہے کہ اس کا کون سا بندہ مومن ہے اور کون سا کافر ہے۔ جو اس کا مومن بندہ ہوتا ہے وہ اس سے ہر حال میں محبت کرتا ہے چاہے وہ اپنی زندگی کے کسی دور میں بتوں کو ہی کیوں نہ پوج رہا ہو اور چاہے وہ گناہ پر گناہ ہی کیوں نہ کرر ہا ہوں۔ اور اس کا جو بندہ کافر ہوتا ہے، وہ اس سے ہر حال میں دشمنی رکھتا ہے، چاہے وہ اسے سجدے کر کرکے اپنی پیشانی ہی کیوں نہ شق کرر ہا ہو اور چاہے اس نے نیکیوں کا انبار ہی کیوں نہ لگار کھا ہو کیونکہ اللہ کی نظر میں اعمالِ ظاہری استحقاقِ محبت پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ کوئی اور چیز ہے جو اللہ کی محبت کی بنیاد ہے۔ اگر انسان اُس بنیاد سے ہی واقف نہیں تو وہ ہمیشہ محبتِ خدا سے محروم رہے گا چاہے اُس نے اپنی دانست میں خود کو اطاعتِ خدا کیلئے وقف ہی کیوں نہ کرر کھا ہو۔ یہ جاننے کیلئے کہ اللہ کی محبت اور اس کی دشمنی کی بنیاد کیا ہوتی ہے، ہم رجوع کرتے ہیں معجزاتِ آلِ محمدؑ (ترجمہ مدینۃ المعاجز) ج ا صفحہ ۳۶۸ کی طرف جہاں اللہ کا حبیبؐ فرماتا ہے کہ مجھ سے اللہ نے فرمایا کہ ''اے محمدؐ! میں نے اپنی ذات کی قسم کھا کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں علیؑ کی محبت کی طرف اس کے دل میں الہام کروں گا جو میرا پیارا ہوگا۔ چنانچہ میں جس سے محبت کرتا ہوں

اس کے دل میں علیؑ کی محبت ڈال دیتا ہوں اور جس سے بغض رکھتا ہوں اس کے دل میں علیؑ کی دشمنی ڈال دیتا ہوں"۔ محبت ڈالنے اور دشمنی ڈالنے سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ یہ دونوں چیزیں جبری ہیں بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ یومِ الست جس جس نے اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ولایتِ علیؑ کا اقرار کیا وہ محبتِ خدا کا حقدار بن گیا اور اللہ اُس کی محبت کو پروان چڑھاتا اور اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اور جس نے اُس روز اختیاری طور پر ولایتِ علیؑ کا انکار کیا تو اللہ اس کے عذاب میں اضافہ کرنے کیلئے اسے چھوٹ دے دیتا ہے تا کہ وہ جی بھر کے علیؑ سے دشمنی کر لے اور بدترین عذاب کا مستحق بن جائے۔ اس بات کو مولا امیرالمومنین اس طرح بیان فرماتے ہیں۔ "اللہ نے جس بندۂ مومن کے دل کا امتحان لیا ہے تو وہ اپنے دل میں ہماری مودّت کی ٹھنڈک محسوس کرتا ہے اور جس بندے پر اللہ ناراض ہوتا ہے تو وہ اپنے دل میں ہماری عداوت محسوس کرتا ہے"۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۷۲)۔

اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ محبتِ خدا کا تعلق اِس دنیا سے نہیں بلکہ میثاقِ الست سے ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان ابھی اس دنیا میں آیا بھی نہیں اور ابھی اس نے کوئی عمل سرانجام ہی نہیں دیا، اس کے باوجود وہ محبوبِ خدا قرار پایا اور ماں کے پیٹ میں ہی اس پر نعمات کی بارش ہونے لگی۔ پس لازم ہے کہ ہم اُس عمل کو پہچانیں جس نے اُس کو محبتِ خدا کا حقدار بنا دیا اور عذابِ خدا سے اسے مامون کر دیا اور اسی عمل کی طرف وہ فرمانِ معصومؑ اشارہ کر رہا ہے جو ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

تفسیرِ نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۳۸۴ ۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''جب اللہ نے بعض لوگوں کی سعادت کا فیصلہ کیا تو اس نے اپنے اہلِ محبت کو اپنی معرفت کی قوت عطا فرمائی اور نیک اعمال کرنے میں جو گرانی محسوس ہوتی ہے اس نے اُن سے وہ گرانی دور کردی۔ اور اہلِ معصیت کو معصیت کی قوت عطا کی اور ان سے قبولیت کی طاقت روک دی۔ اسی لئے انہوں نے وہی اعمال و افعال کئے جو پہلے سے اللہ کے علم میں گزر چکے تھے اور وہ اُن اعمال سے دور رہے جو ان کو عذاب سے نجات دلا سکتے تھے''۔

اسی لئے ہم نے روزِ اوّل سے لیکر آج تک کبھی بھی منکرینِ ولایت کو اپنا مخاطب نہیں بنایا کیونکہ ہم جانتے تھے کہ یہ لوگ اُس منزل پر ہیں جس کے بارے میں پروردگارِ عالم نے اپنے رسولؐ سے فرمایا تھا کہ ''تو انہیں ڈرایا نہ ڈرا، ان کیلئے برابر ہے کیونکہ یہ لوگ ایمان لانے والے ہیں ہی نہیں''۔ کیونکہ سارے معاملات تو یومِ الست ہی طے ہو چکے ہیں۔ دنیا میں تو انسان کو اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ اپنے عمل سے خود ثابت کرے کہ وہ کون ہے اور اللہ کے روبرو اس کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کرنا تو اسے وہی ہے جس کا فیصلہ اُس نے یومِ الست کیا تھا۔ سورۂ انعام آیت ۲۸ میں ارشاد ہوتا ہے۔ اور اگر انہیں دوبارہ لوٹا بھی دیا جائے تو بھی وہی عمل کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا تھا''۔ تفسیرِ نور الثقلین جلد سوم میں امامؑ فرماتے ہیں۔ ''اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر دشمنانِ علیؑ بالفرض دنیا میں واپس لوٹ بھی

آئیں تب بھی وہ مولا علیؑ کی دشمنی سے باز نہ آئیں گے"۔

یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ علیؑ سے محبت کا دعویٰ کرنے سے پہلے انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ علیؑ سے محبت کا مطلب کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں کیونکہ علیؑ ہے ہی مشکل چیز۔ ان کی ولایت بھی مشکل اور ان کی محبت بھی مشکل ہے کیونکہ یہ باقی محبتوں سے یکسر مختلف ہے۔ ہم نے محبت کے موضوع پر جو یہ پوری کتاب لکھ ڈالی اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ محبانِ حیدرِ کرار اُس منزل پر آ کر اپنے محبوب سے محبت کریں جو اُسؑ کے شایانِ شان ہے اور جس کا اُس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور اس کیلئے ساری دنیا سے کٹ کر علیؑ کو دیکھنا پڑتا ہے کیونکہ وہ ہے ہی یکتا اسی لئے اس سے محبت کرنے کیلئے ساری محبتوں سے دستبردار ہونا پڑتا ہے اور سارے رشتوں کو ایک طرف رکھنا پڑتا ہے۔ حضرتِ ختمی مرتبتؐ علیؑ کی محبت کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "اے اللہ کے بندے! اللہ کی راہ میں محبت کر اور اللہ کی راہ میں بغض رکھ۔ بے شک اللہ کی ولایت اور دوستی نہیں پہنچ سکتی سوائے اِن چیزوں کے ذریعے۔ اور کوئی آدمی ایمان کا مزا چکھ نہیں سکتا اگر چہ اس کی نمازیں اور روزے بہت زیادہ ہوں جب تک وہ ایسا نہ ہو"۔ پھر آپؐ نے علیؑ کی طرف اشارہ فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ "اس کا دوست اللہ کا دوست ہے، تو تُو اس سے دوستی رکھ۔ اور اس کا دشمن اللہ کا دشمن ہے، تو تُو اس سے دشمنی رکھ۔ اور تو اس کے دوست سے دوستی رکھ، اگر چہ وہ تیرے باپ یا

بیٹے کا قاتل ہی کیوں نہ ہو۔اور تو اس کے دشمن سے دشمنی رکھ،اگر چہ وہ تیرا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو''۔ (معانی الاخبار صفحہ ۷۵)۔پس انسان کو چاہیئے کہ وہ خود کو اِس کسوٹی پر پرکھے اور جائزہ لے کہ کیا وہ اس قابل ہے کہ علیؑ سے محبت کر سکے؟۔اور اگر کوئی کوتاہی پائے تو پھر اس سلسلے میں شعوری کوشش کرے اور اپنے دل کو مارے کیونکہ مودّت اسی کا نام ہے۔یہ محبّ اور محبوب کو اس طرح ملاتی ہے کہ درمیان میں کوئی شے حائل نہیں رہتی۔یہ معیّتِ دائمی ہے جو کسی مرحلے پر ختم نہیں ہوسکتی چاہے وہ دنیا ہو یا آخرت۔یہاں اعمالِ ظاہری پیچھے رہ جاتے ہیں اور محبت آگے نکل جاتی ہے کیونکہ اس میں اتنی کشش ہے کہ یہ محبّ اور محبوب کو کسی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں رہنے دیتی۔مولا محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔''خدا کی قسم اگر کوئی پتھر بھی ہم سے محبت کرے تو خدا اُسے بھی ہمارے ساتھ محشور کرے گا۔دین محبت کے علاوہ اور کیا ہے؟''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۵۴)۔اور مولا امیرؑ المومنین فرماتے ہیں۔ ''آگ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی ہمارے محبّ کو اور جنت میں داخل نہیں ہوگا ہم سے بغض رکھنے والا۔قسم بخدا میرے محبت کرنے والوں کیلئے کوئی پیاس نہیں ہے اور میرے دوستوں کیلئے کوئی خوف نہیں ہے''۔(معانی الاخبار صفحہ ۹۹)۔اور رسولؐ اللہ نے فرمایا۔''ہمارا کوئی محبّ دوزخ میں نہیں جائے گا اور ہمارا کوئی دشمن جنت میں نہیں جائے گا''۔(تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۳۷۷)۔یہ محبت چونکہ دائمی ہوتی ہے

اس لئے محبت کرنے والوں کی آپس کی محبت بھی دائمی ہوتی ہے۔ اسی لئے امیرؑ المومنین نے فرمایا ہے۔ "دنیاوی بھائیوں کی محبت منقطع ہوجاتی ہے لیکن اللہ کیلئے دینی بھائیوں کی محبت کو ہمیشہ دوام رہتا ہے، اس لئے کہ اس کا سبب دائمی ہے"۔ (حکمتِ بوتراب ج اصفحہ ۳۰۶)۔

تاثیرِ محبت

ہر چیز ایک اثر رکھتی ہے۔ اگر آپ چٹکی بھر نمک بھی زبان پر رکھیں تو اس کا بھی ایک اثر ہوگا پھر یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ محبت کا کوئی اثر نہ ہو جبکہ یہ پوری کائنات کی طاقتور ترین چیز ہے۔ مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتی ہے، چاند سمندر کو بے قرار کردیتا ہے، زمین ہر شے کو اپنی کشش کے ساتھ باندھ لیتی ہے تو محبت کیا کچھ نہ کرتی ہوگی۔ محبت تو ایک انقلابِ عظیم کا نام ہے جو کیفیت و ماہیت تک کو بدل ڈالتی ہے اور اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہے کہ یہ انسان کے وجود سے نجاستوں کو نوچ کر پھینک دیتی ہے اور اسے طیب و طاہر بنا دیتی ہے تا کہ وہ اپنے محبوب کی بارگاہ میں پہنچے تو اس کا ظاہر و باطن پاک ہو۔ سورۂ انفال آیت 11 میں ارشاد ہوتا ہے۔ "اور وہ آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا تا کہ تمھیں پاک کردے اور شیطانی نجاست کو تم سے دور کردے اور تا کہ تمھارے دلوں کو مضبوط کرے اور تمھیں ثابت قدم رکھے"۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ اس آیت میں اللہ نے جن جن چیزوں کا ذکر کیا ہے ان سب کا تعلق عقیدے سے

ہے۔ پاک ہونا، شیطانی نجاست کا دور ہونا، دلوں کا مضبوط ہونا اور انسان کا ثابت قدم رہنا، یہ سب عقیدے سے متعلق ہیں۔ محبت کے یہی کام ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ بے شک ہماری بات نہ مانو لیکن اللہ کا کہنا تو مان لو کہ محبت کا کام عقیدے کی حفاظت ہے نہ کہ عقیدے سے غافل کر کے دوسرے کاموں میں لگانا۔ کیونکہ محبت کی منزل قربِ محبوب ہے اور قربِ محبوب کو جو شے یقینی بناتی ہے وہ عقیدہ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''اس آیت میں آسمان سے رسولؐ مراد ہیں اور بارش سے علیؑ مرتضیٰ مراد ہیں اور علیؑ کی محبت محبوں کے دلوں کو پاک کرتی ہے اور جو علیؑ سے محبت کرے گا اس سے شیطانی نجاست دور ہو جائے گی۔ اسی طرح ولایتِ علیؑ کے عقیدے سے دل کو مضبوطی نصیب ہوتی ہے اور عقیدے میں ثبات پیدا ہوتا ہے''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۵۴۷)۔ امامؑ کا یہ فرمان کہ آسمان سے رسولؐ مراد ہیں، ترتیبِ معرفت کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اللہ اور رسولؐ کے درمیان وسیلہ علیؑ ہیں اور مخلوق اور علیؑ کے درمیان وسیلہ رسولؐ ہیں کیونکہ اللہ نے نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ اپنے نبیؐ کو ولایتِ علیؑ مخلوق تک پہنچانے کا ذریعہ قرار دیا ہے کیونکہ مخلوق براہِ راست تجلّیاتِ ولایت کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ <u>پس رسولؐ ہی وہ آسمان ہیں جس سے ولایتِ علیؑ کی بارش نازل کی جاتی ہے جو قطروں کی شکل میں ہوتی ہے اور مخلوقِ خدا اس سے فائدے حاصل کرتی ہے۔ اگر وہ سارا پانی جو قطروں کی شکل میں نازل ہوتا ہے، یکبارگی زمین پر آجاتا تو زمین کا کلیجہ</u>

شق ہو جاتا اور خلق خدا ہلاک ہو جاتی۔

محبت جب محبّ کو پاک کر لیتی ہے تو اب اُس کا کام یہ ہوتا ہے کہ محبّ کا ہاتھ پکڑ کر اسے محبوب کی دہلیز پر لا بٹھاتی ہے اور محبت کی زبان میں اسی کا نام جنت ہے۔ محبت کی اس تاثیر کے بارے میں ہم آئندہ صفحات میں تفصیل سے لکھیں گے۔ یہاں صرف چند مقامات پر اکتفاء کیا جا رہا ہے۔

ا۔ قیامت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں لوگوں کو پچاس مقامات پر ٹھہرایا جائے گا جنہیں ''موقف'' کہتے ہیں اور ہر موقف میں ایک ہزار سال تک کھڑے رہنا ہوگا۔ گویا لوگ پچاس ہزار سال تک دھکے کھاتے پھریں گے تب کہیں جا کر یہ فیصلہ ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے۔ لیکن اس تمام بھگدڑ میں علیؑ کے چاہنے والے کس حال میں ہوں گے یہ ہم رسولؐ اللہ کی زبانی بیان کرتے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں۔ ''یا علیؑ! تم اور تمھارے شیعہ موقف میں تلاش کئے جائیں گے جبکہ وہ جنت میں اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے''۔ (تفسیر فرات صفحہ ۱۷۷)

یہاں یہ بات ضرور سوچنی چاہیئے کہ شیعوں کو موقف میں کون تلاش کرے گا؟۔ وہاں کس کو اتنا ہوش ہوگا کہ وہ دوسروں کو تلاش کرتا پھرے؟۔ یہ وہی لوگ ہوں گے جو دنیا میں شیعوں کو گھیرنے میں لگے رہتے تھے اور وہاں پریشان ہوں گے کہ جن لوگوں کو ہم نے بہلایا تھا پھسلایا تھا، ڈرایا تھا دھمکایا تھا وہ کہاں ہیں؟۔

۲۔ القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۳۲۔

''ایک شخص نے امام محمد باقرؑ سے عرض کیا کہ میرا ایک ہمسایہ ہے جو ہر طرح کے حرام کام کو انجام دیتا ہے۔ تمام اہم ترین فرائض کو بجا نہیں لاتا اور باقی واجبات کو تو وہ اہمیت ہی نہیں دیتا۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''سبحان اللہ! تیری نظر میں یہ بہت بڑی بات ہے؟۔ کیا تجھے اس سے بھی بدتر کے بارے میں نہ بتاؤں؟''۔ عرض کیا کہ ضرور فرمائیے۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''ناصبی اس سے بھی بدتر ہے۔ جان لو کہ کوئی ایسا بندہ نہیں ہے جس کے پاس ہم اہلبیتؑ کا تذکرہ کیا جائے اور اُس کا دل اُس تذکرے سے نرم ہو جائے مگر یہ کہ فرشتے اس کی پشت پر اپنے پر پھیرتے ہیں اور اللہ اُس کے تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا سوائے اُن گناہوں کے جو اسے ایمان کے دائرے سے خارج کر دیں''۔

۳۔ القطرۃ من بحارج ۲ صفحہ ۸۰۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''آلِ محمدؑ کے دوست کو دوست رکھو اگرچہ گناہ گار شخص ہی کیوں نہ ہو۔ اور دشمنِ آلِ محمدؑ کو دشمن رکھو اگرچہ وہ زیادہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو''۔

۴۔ القطرۃ من بحارج ۲ صفحہ ۱۲۵۔ امام رضاؑ نے فرمایا۔

''آلِ محمدؑ کو دوست رکھو اگرچہ تم فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ اور آلِ محمدؑ کے دوستوں سے دوستی رکھو اگرچہ وہ فاسق ہی کیوں نہ ہوں''۔

آپ ذرا اِس محبت کی طاقت کا اندازہ لگائیے جو گناہ گار کو گناہ گار نہیں رہنے دیتی، جو

فاسق کو فاسق نہیں رہنے دیتی بلکہ فاسق کی دوستی کو واجب کر دیتی ہے اور جس کی مرغوب غذا محبانِ اہلبیتؑ کے گناہ ہیں۔ جیسا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ ''علیؑ کی محبت گناہوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جیسے آگ لکڑی کو''۔ اور جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''بے شک ہماری محبت بندوں کے گناہوں کو اس طرح گراتی ہے جیسے تیز ہوا درخت کے پتوں کو گراتی ہے''۔ (القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۸۱)۔

۵۔ عبید بن زرارہ کہتے ہیں کہ میں امام صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُس وقت بقباق یعنی ابوعباس حضرتؑ کے پاس موجود تھا۔ میں نے عرض کیا کہ ایک شخص بنوامیّہ کو دوست رکھتا ہے تو کیا وہ بھی انہی کے ساتھ ہے؟۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''ہاں''۔ میں نے عرض کیا کہ ایک شخص آپ کو دوست رکھتا ہے تو کیا وہ آپ کے ساتھ ہے؟۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''ہاں''۔ میں نے عرض کیا کہ اگر چہ وہ زنا کار اور چور ہی کیوں نہ ہو؟۔ امامؑ نے بقباق کی طرف دیکھا کہ وہ متوجہ نہیں ہے تو میری طرف سر کے ساتھ اشارہ کر کے فرمایا۔ ''ہاں''۔ (القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۷۰)۔

۶۔ القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۳۸۹۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''ہم اہلبیتؑ کی محبت گناہوں کا کفارہ ہے اور نیکیوں میں اضافہ کرتی ہے۔ اللہ ہمارے دوستوں کے ذمّے دوسرے لوگوں کے جو حقوق اور قرضے ہوں گے انہیں اپنے ذمہ لے لے گا۔ سوائے اُن حقوق کے جن میں کسی مومن نے دوسرے مومن کو نقصان پہنچایا ہو گا یا اس پر ظلم کیا ہو گا''۔

۷۔محبت صفحہ ۲۶۵۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''جو شخص جس قوم سے محبت رکھتا ہے اُس کا شمار اُسی قوم کے ساتھ ہوگا۔اور جو کسی قوم کے عمل کو پسند کرتا ہے وہ اس کے عمل میں شریک ہوگا۔آلِ محمدؑ کے دوستوں سے محبت کرو جب تک کہ وہ ان کے محبّ ہیں۔اور آلِ محمدؑ کے دشمنوں سے اس وقت تک دشمنی رکھو جب تک وہ انؑ کے دشمن ہیں خواہ وہ دن میں روزہ رکھتے ہوں اور راتوں میں نمازیں پڑھتے ہوں۔اور محمدؐ وآلِ محمدؑ کے محبّ کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ کیونکہ اگر گناہوں کی کثرت کیوجہ سے اُس کا ایک قدم پھسل بھی گیا تو اُنؑ کی محبت کیوجہ سے اس کا دوسرا قدم ثابت رہتا ہے''۔

آپ نے دیکھا کہ نیک وبد کا جو معیار لوگوں کے پاس ہے اس معیار کو اللہ تسلیم نہیں کرتا بلکہ اللہ کے نزدیک صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ اس کا کون سا بندہ علیؑ کا دوست ہے اور کون سا بندہ علیؑ کا دشمن ہے۔جو علیؑ کا دوست ہے وہ اللہ کے نزدیک نیک ہے اگر چہ بظاہر وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو۔اور جو علیؑ کا دشمن ہے وہ اللہ کے نزدیک بدترین گنہگار ہے اگر چہ وہ بظاہر سر سے پیر تک نیکیوں میں ڈوبا ہوا ہو کیونکہ اللہ اعمالِ ظاہری کی بنیاد پر بندوں کا امتحان نہیں لے گا بلکہ محبتِ علیؑ کے ذریعے ان کا امتحان لیا جائے گا جیسا کہ القطرۃ من بحارج ۳ صفحہ ۱۹ پر اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ''لوگوں کو علیؑ کی وجہ سے آزمایا جائے گا''۔

انتہائی اہم

اس مقام پر ہم تھوڑی دیر کیلئے رُکتے ہیں کیونکہ ابھی ہمیں کافی دُور جانا ہے اور قبل اس کے کہ ہم خود کو کسی بڑی مصیبت میں پھنسا لیں بہتر یہی ہے کہ اسی مقام پر کچھ ضروری وضاحت کر دیں کیونکہ مندرجہ بالا سطور میں جو تھوڑا بہت ہم نے لکھا ہے اس کو پڑھ کر بہت سے لوگ پتھر جمع کر رہے ہوں گے اور ہم پر لوگوں کو بے خوف کرنے کے الزامات کو آخری شکل دے رہے ہوں گے حالانکہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ مستند حوالوں سے لکھا ہے لیکن ہمارے ناقدین کے پاس بھی کچھ دلائل ہیں جن پر گفتگو کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جہاں اللہ نے محبانِ علیؑ کے تمام گناہوں سے صرفِ نظر کیا ہے، جہاں یہ کہا ہے کہ میں علیؑ کے محبّ کو ضرور ضرور بخش دوں گا چاہے اس کے گناہ ریت کے ذرّوں اور سمندر کے جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں، جہاں یہ فرمایا ہے کہ مومن پر لفظِ ''فاسق'' کا اطلاق ہوتا ہی نہیں چاہے وہ کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، وہیں ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے اعمالِ ظاہری کی تاکید ظاہر ہوتی ہے اور ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ ان دونوں قسم کی روایات کی آپس مین مطابقت کی کیا صورت ہے۔ یہ بات تو بہر حال ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ گناہ کرنا کبھی بھی پسندیدہ چیز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ معاف کر دینا اللہ کی شانِ کریمیت پر تو دلیل ہو سکتا

ہے لیکن اسے ایک لائسنس ہرگز نہیں سمجھنا چاہئے اور مومن کا ظاہری عمل بھی اُس محبت کے شایانِ شان ہونا چاہیئے جو اس کا اصلِ سرمایہ اور سببِ نجات ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی کہ مومن کو معاشرے میں ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جائے۔ اسے تو اپنے محبوب کیلئے باعثِ زینت ہونا چاہیئے نہ کہ باعثِ ننگ و عار۔ لیکن ہم نے جس چیز پر زور دیا ہے اور دے رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اعمالِ ظاہری سے ایک صحتمند اور صالح معاشرہ تشکیل دینے میں تو ضرور مدد ملتی ہے لیکن نجاتِ اُخروی کا ان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس کا انحصار خالصتاً محبِ اہلبیتؑ پر ہے جو ایک قلبی عمل ہے اور جسے ذکرِ خفی کہا جاتا ہے۔

اعمالِ ظاہری کی تاکید میں یوں تو متعدد روایات ہیں لیکن ان تمام کو یہاں نقل کرنا اور پھر ان پر فرداً فرداً گفتگو کرنا ایک لایعنی عمل ہوگا لہٰذا ہم ایک حدیث نقل کرتے ہیں جو ہماری نظر میں ایسی تمام روایات کا احاطہ کرنے کیلئے کافی ہے۔ پہلے تو ہم اس کے ظاہری خدوخال پر گفتگو کریں گے اور پھر اُس حقیقت کی نشاندہی کریں گے جو ایسی تمام روایات کے پیچھے کارفرما ہے۔

القطرۃ من بحار میں امام محمد باقرؑ سے ایک روایت منقول ہے جس میں آپ فرماتے ہیں۔ ''جس نے خدا کی نافرمانی کی اسے ہماری محبت کوئی فائدہ نہ دے گی''۔ پہلے ہم اس کی ظاہری تاویل پر بات کرتے ہیں کیونکہ اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں جن کا ذکر صاحبِ القطرۃ جناب احمد مستنبط نے اِس طرح کیا ہے۔

۱۔ایک صورت یہ ہے کہ بظاہر تو ہر شخص محبتِ اہلبیتؑ کا دعویدار ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں ایک آدمی بھی ایسا نہ ہوگا جو کھڑے ہوکر علی الاعلان یہ کہدے کہ ''میں اہلبیتؑ کا دشمن ہوں''۔اس صورت میں بعض اوقات انسان غیر ضروری خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو اہلِ بہشت خیال کر کے خود کو مادر پدر آزاد تصور کرنے لگتا ہے اور خوفِ خدا اس میں باقی نہیں رہتا اور یقیناً یہ صورتِ حال اہلبیتؑ کیلئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ نہ ہی محبتِ اہلبیتؑ کا یہ مقصد ہے کہ انسان جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جیسے جیسے محبتِ اہلبیتؑ دل میں جڑ پکڑتی جاتی ہے ویسے ویسے انسان علائقِ دنیوی سے دور ہوتا جاتا ہے۔اسی لئے جب ہم حقیقی محبانِ اہلبیتؑ کی زندگیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے کردار پر کوئی داغ نظر نہیں آتا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کچھ ایسے گناہوں کا عادی ہو جائے جو رفتہ رفتہ محبت ہی کو ختم کر دیں۔ کیونکہ جناب امیرؑ المومنین کے فرمان کے مطابق اللہ نے انسان کو ایک ہی دل دیا ہے، دو دل نہیں دیئے کہ ایک سے اہلبیتؑ سے محبت کرے اور دوسرے سے دنیاوی لذتوں سے محبت کرے۔ چنانچہ جب انسان دنیاوی لذتوں کے جال میں پوری طرح جکڑا جاتا ہے تو اُس کا اہلبیتؑ کی طرف سے غافل ہو جانے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

۳۔تیسری صورت یہ ہے کہ انسان گناہوں میں اس حد تک گرفتار ہو جائے کہ گناہ کو

گناہ سمجھنا ہی چھوڑ دے، نہ پشیمان ہو اور نہ توبہ کرے اور اس طرح رفتہ رفتہ اہلبیتؑ سے محبت کا رشتہ خود بخود منقطع ہو جائے لیکن جو لوگ اپنے گناہوں پر شرمندہ ہوتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں، ایسے لوگ ضرور نجات پانے والے ہیں کیونکہ اللہ نے اس کا وعدہ کیا ہے اور ہمیں اللہ کے وعدے پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

۴۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ عالمِ برزخ میں شاید یہ محبت کام نہ آئے کیونکہ برزخ ردِ عمل کا مقام ہے اور فطری طور پر ہر گناہ کا ایک ردِ عمل ضرور ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص نادانستگی میں کوئی زہریلی چیز کھالے تو اگرچہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوگا اور نہ آخرت میں اس کو کوئی سزا ملے گی لیکن زہر تو اپنا کام بہرحال کرے گا۔ اسی طرح اللہ کی طرف سے مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ گناہ آخرت میں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن گناہ کا جو فطری ردِ عمل ہے وہ تو بہرحال برزخ میں سامنے آئے گا لیکن قیامت میں محبتِ اہلبیتؑ ضرور فائدہ دے گی۔ جیسا کہ معصومؑ نے فرمایا۔ ''جس نے بھی امیرؑ المومنین کی ولایت کو قبول کرلیا اور آپ کے دشمنوں سے بیزاری چاہی، اُن کے حلال کو حلال اور ان کے حرام کو حرام جانا لیکن اس کے باوجود گناہ کا ارتکاب کیا تو عالمِ برزخ میں اُن گناہوں کی وجہ سے اسے عذاب ہوگا۔ البتہ جب قیامت کے دن وارد محشر ہوگا تو اس کیلئے کوئی گناہ باقی نہ ہوگا کہ جس کی وجہ سے اس سے پوچھ گچھ ہو''۔ (القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۴۹)۔

یہ ایک باریک فرق ہے جس کو سمجھنا ضروری ہے۔ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان گناہ کرے لیکن اُس گناہ کو گناہ سمجھے، شراب پیئے لیکن شراب کو حرام سمجھے۔ یہ صورت قابلِ معافی ہے۔لیکن اگر انسان شراب کو حلال سمجھ کر پیئے، زنا کو جائز سمجھ کر زنا کرے تو یہ چیز بغاوت کے زمرے میں آتی ہے اور نا قابلِ معافی ہے اور ایسا شخص اگر محبت کا دعویٰ کرے تو اسے اپنے دعوے میں جھوٹا سمجھا جائے گا۔ یہ تو تھیں وہ مختلف صورتیں جن کا احتمال اس حدیث میں موجود ہے لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

جامع الاخبار، باب القرآن، صفحہ ۷۷، حدیث ۱۶۵۔

امام حسینؑ نے فرمایا۔ "کتاب خدا چار چیزوں پر مشتمل ہے۔ اوّل عبادت، دوسرے اشارے، تیسرے لطائف، چوتھے حقائق۔ پس عبادت تو عوام کیلئے ہے اور اشارے خواص کیلئے۔ لطائف اولیاء کیلئے ہیں اور حقائق انبیاءؑ کیلئے"۔

اِس فرمانِ معصومؑ کی تشریح کیلئے بہت تفصیل کی ضرورت ہے جس کا نہ تو یہ محل ہے اور نہ ہمارا موضوع اس تفصیل میں جانے کی اجازت دیتا ہے۔ اتنا جان لیجئے کہ ارکانِ دین اگر چہ اپنے مقام پر ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں لیکن ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان کا ادراک کرتا ہے اس لئے اُس حکیم مطلق نے بھی ہر شخص کو اُس کی سُوجھ بُوجھ کے مطابق ہی مکلّف قرار دیا ہے۔ اصولِ کافی کتابِ عقل میں معصومؑ کا یہ قول موجود ہے کہ ہر شخص کو اُس کی عقل کے مطابق جزا اور سزا دی جائے گی۔ یہاں آ کر ہر شخص کے عقائد، معرفت، حقوق اور فرائض میں فرق پڑ جاتا ہے اور ہر شخص کو پرکھنے اور جانچنے

کیلئے معیارات مختلف ہو جاتے ہیں۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ انبیاءؑ ہوں یا ایک عام آدمی، ہر ایک کو معرفتِ علیؑ کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ انبیاءؑ اور عام انسانوں کو معرفت کی ایک ہی سطح پر نہیں جانچا جا سکتا۔ انبیاءؑ کا معیارِ معرفت اور ہے اور انسانوں کا معیارِ معرفت الگ ہے۔ اس طرح معرفت اگرچہ دونوں میں مشترک ہے لیکن معیارات جدا جدا ہیں۔ یہاں تک اگر بات واضح ہوگئی تو یہ بات بھی آپ سے پوشیدہ نہیں کہ تمام انسانوں کی سطحِ معرفت بھی ایک جیسی نہیں ہوتی کیونکہ معرفت بقدرِ عقل ہوا کرتی ہے اور انسانی عقول کے بہت سے درجات ہیں اور ہر سطح کی عقل کیلئے ایک الگ معیار ہے۔ انسانوں کی ایک غالب اکثریت ایسی ہوتی ہے جو واجبی سی عقل رکھتی ہے۔ بات کی گہرائی میں جانا، صحیح تجزیہ کرنا، نتائج نکالنا اور جزو سے کُل کی طرف سفر کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو امام حسینؑ نے ''عوام'' کا نام دیا ہے۔ اگر ایسے لوگوں پر معرفتِ عمیق کی تکلیف ڈال دی جاتی تو وہ یقیناً ہلاک ہو جاتے۔ تو امامؑ نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کو پرکھنے کے لئے معیار ظاہری عبادت کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ ظاہری عبادت میں غور و تدبر کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ یہ ایک جسمانی مشقت ہے جس سے یہ بات بہرحال ظاہر ہوتی ہے کہ یہ شخص احکامِ خدا کی رعایت کرنے والا ہے اور ایسی عقل والوں کیلئے یہی چیز کافی ہے۔ سورۂ نساء کی آیت ۹۹ میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور ظالمانہ ماحول سے نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے تو قریب ہے کہ اللہ انہیں معاف کر دے اور اللہ

بڑا معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے"۔اس آیت کے بارے میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "اس کے ضمن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں ناصبی بننے کیلئے راستہ نہیں ملتا کہ وہ ناصبی بن جائیں۔اور انہیں حق کے راستے کی بھی مکمل پہچان میسر نہیں کہ وہ حق کے دائرے میں داخل ہوجائیں۔ یہ لوگ اپنے نیک اعمال اور برائیوں سے اجتناب کی وجہ سے جنت میں جائیں گے لیکن اُن کو ابرار کی منزلت نہیں ملے گی"۔(تفسیر نورالثقلین ج ۲ صفحہ ۴۶۹)۔

اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہنا چاہیئے کہ احادیثِ معصومینؑ میں جہاں جہاں اعمالِ ظاہری کی تاکید وارد ہوئی ہے وہ ایسے ہی لوگوں کیلئے ہے جن کو پرکھنے کا معیار صرف عبادتِ ظاہری ہوتا ہے اور اگر انہوں نے اس میں کوئی کمی کی تو ان کے بخشے جانے کی کوئی اور صورت نہیں ہے کیونکہ ایسے لوگ معرفت سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اسی لئے ان کو محبت کا بھی صحیح ادراک نہیں ہوتا اور ان کی محبت کی بنیاد ان کی ذاتی احتیاج واغراض ہوتی ہیں۔ان کی محبت کی معراج مجالسِ حسین میں شرکت کرلینا اور علَم، تابوت، ذوالجناح اور ضریح پر جاکر مَنّتیں ماننا ہوتی ہے اور چونکہ ان کی محبت غرضی اور مطلبی ہے اس لئے ایسی محبت واقعی ان کے کسی کام نہیں آئے گی جب تک وہ فرائض ومحرّمات کی مکمل پابندی نہ کریں۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جنہیں مولاؑ نے "خواص" کا نام دیا ہے۔ یہ لوگ محبت کے

تقاضے پورے کرنے والے ہوتے ہیں اورمعرفت کے گہرے سمندروں میں سفر کرنا ان کا کام ہوتا ہے۔ان سے جھک جھک نہیں کرنی پڑتی بلکہ یہ اشارے سمجھتے ہیں۔ یہ ہرحکم کی غایتِ اصلی کو جانتے ہیں۔یہ اپنے محبوب کے لہجے سے مانوس ہوتے ہیں اسی لئے فوراً سمجھ لیتے ہیں کہ اُس نے کیا کہا اور اُس کی مراد کیا ہے۔اشارات ایسے ہی لوگوں کیلئے ہوتے ہیں، ہرکس و ناکس کیلئے نہیں۔''اشارات'' کی وضاحت ہم ایک مختصر سے واقعے سے کرتے ہیں تاکہ بات پوری طرح سمجھ میں آجائے۔

حسّان بن ثابت جسے عام طور پر پہلا نعت گوشاعر کہا جاتا ہے (حالانکہ یہ اعزاز حضرتِ ابوطالب **علیہ السلام** کو حاصل ہے) یہ پہلے رسولؐ اللہ کی ہجو کہا کرتا تھا اور لوگوں کو سنا سنا کر آنحضرتؐ کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکایا کرتا تھا۔جب یہ پکڑا گیا اور رسولؐ اللہ کے سامنے حاضر کیا گیا تو آپؐ نے اسے نگاہِ غضب سے دیکھا اور امیرؑ المومنین کی طرف متوجہ ہوکرفرمایا۔''یا علیؑ !اس کی زبان کاٹ دو''۔مولاعلیؑ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے گھر لے گئے۔وہاں لے جا کر اسے نہلایا دھلایا، کھلایا پلایا، نئے کپڑے پہنائے اور سواری عطا فرمائی اور اس کے بعد کہا۔''جہاں دل چاہتا ہے چلے جاؤ''یہ حسنِ سلوک دیکھ کر اب جو وہ واپس ہوا تو آنحضرتؐ کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور تبھی سے یہ نعت گوشاعر مشہور ہوا۔اسے کہتے ہیں اشارات سمجھنا۔کوئی اور ہوتا تو واقعی زبان کاٹ دیتا۔اِن خواص کو اس بات پر پرکھا جائے گا کہ وہ اپنے محبوب کی طرف متوجہ رہے یا نہیں، کیونکہ جب تک متوجہ نہیں رہیں گے اس وقت تک

اشارات کو نہیں سمجھ سکتے۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہیں معصومؑ نے ''اولیاء'' کے نام سے یاد کیا ہے اور ان کا کام نہ صرف اشارات کو سمجھنا ہے بلکہ اپنے علم اور معرفت کو ان لوگوں تک منتقل کرنا ہے جو اس کے اہل ہیں۔ اسے ''لطف'' کہتے ہیں اور اسی معیار پر انہیں جانچا جائے گا۔

چوتھی قسم انبیاء کی ہے جن کا کام حقائق تک پہنچنا ہے۔ یہ تفصیل کا وقت نہیں لیکن اتنا سمجھ لیجئے کہ کائنات کی ہر شے کی حقیقت ولایتِ علیؑ ہے۔ جو احباب علمِ منطق سے مس رکھتے ہیں وہ علّتِ مادّی اور علّتِ صوری کے ذریعے اس بات کو سمجھ سکتے ہیں۔ انبیاء کا فرضِ منصبی اور مقصدِ نبوت بھی ولایت کے اعلیٰ مقامات کی سیر کرنا ہوتا ہے۔ وہاں ان سے کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں اور کہیں کہیں ان کی قوتِ برداشت بھی جواب دینے لگتی ہے اور یہی وہ مقامات ہیں جہاں ان کے لئے تنبیہات وارد ہوتی ہیں۔ آدمؑ ہوں یا موسیٰ، یونسؑ ہوں یا ذکریاؑ، یہ سب اسی معیار سے گزرے ہیں۔ لیکن یہ بات اُن کے اور ان کے خالق کے درمیان ہے۔ جہاں تک ان کے اور مخلوق کے درمیان معاملات کا تعلق ہے تو وہاں ان سے کسی بھی قسم کی کوتاہی یا بھول چُوک کا سرزد ہو جانا محال ہے کیونکہ انبیاء کا معصوم ہونا عقلاً واجب ہے، بصورتِ دیگر پورا دین ہی غیر معتبر اور مشکوک ٹھہرے گا۔

ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کی ہے کہ اُس حقیقت کا ادراک کرا دیں جس کا سہارا لے کر مولوی لوگوں کو ڈراتا دھمکاتا اور اہلبیتؑ کی طرف سے غافل کرتا ہے۔

دیدارِ محبوب

آپ یہ جان چکے کہ قرآن میں جس اللہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ اسم ہے، معنی نہیں۔ لہٰذا اللہ کے جو جو خصائص قرآن نے بیان کئے ہیں وہ یقیناً اسم کے خصائص ہیں اور اس بات میں کسی قسم کی پریشانی لاحق نہیں ہونی چاہیئے۔ اللہ کی ایک خصوصیت جو قرآن نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بالذّات نا قابلِ رویت ہے۔ یعنی اس کو مادّی آنکھوں سے کسی صورت بھی نہیں دیکھا جا سکتا چاہے انسانی بصارت کروڑ گنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے کیونکہ اس کی لامحدودیت رویت کو مانع ہے۔ اُس اللہ کے بے شمار مقامات ہیں اور ہر مقام پر اُس کی ایک نئی شان اور ایک نئی خاصیت ہوتی ہے۔ جب تک وہ صفتِ ذات بن کر رہتا ہے اس وقت تک نہ تو بصارت اس تک پہنچ سکتی ہے اور نہ بصیرت اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ لیکن جب وہ صفتِ فعل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو بصیرت کے ذریعے اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے لیکن عام لوگوں کی بصارت کی رسائی تب بھی اس تک نہیں ہو سکتی۔ پھر جب وہ لباسِ بشر میں آتا ہے تو بصارت اور بصیرت، دونوں کی پہنچ میں آ جاتا ہے۔ یہ وضاحت ہم نے اس لئے کی تا کہ دیدارِ محبوب کی کوئی غلط توجیہ نہ کر لی جائے۔ جہاں تک بصیرت کے ذریعے اس کا مشاہدہ کرنے کا تعلق ہے تو یہ ہر مومن پر واجبِ عینی ہے کیونکہ معرفت کا تعلق بصیرت سے ہے۔ لیکن بصارت کے ذریعے اس کا دیدار کرنا ہر محبت کرنے والے کی تمنا ہوتی ہے۔ وہ محبّ ہی نہیں جو اپنے

محبوب کے دیدار کا پیاسا نہ ہو۔ یہ تقاضائے معرفت نہیں بلکہ تقاضائے محبت ہے۔ اس سلسلے میں جو احادیث ہم نقل کریں گے،ان سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ جب کوئی اللہ کی رویت کی تمنا کرتا ہے تو وہ اللہ سے کیا مراد لے رہا ہوتا ہے اور اپنے محبوب کا کون سا مقامِ منزلت اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔

ا۔محبت صفحہ ۲۹۵۔حضرتِ شعیبؑ یہ مناجات کیا کرتے تھے۔

''پروردگار میرے دل میں تیری محبت بیٹھ گئی ہے اس لئے مجھے اُس وقت تک صبر نہیں آ سکتا جب تک تیرا دیدار نہ ہو جائے''۔

۲۔امیرالمومنین نے فرمایا۔''اللہ نے حضرتِ موسیٰ پر وحی کی کہ اے موسیٰ !ذکر کرنے والوں کیلئے میرا ذکر،مشتاق لوگوں کے لئے میرا دیدار،اطاعت کرنے والوں کیلئے میری جنت اور محبوں کے لئے میں خود ہوں''۔(محبت صفحہ ۲۸۵)۔کیا ہی خوش نصیب ہے وہ بندہ جسے یہ چاروں چیزیں مل جائیں۔یہ واضح رہے کہ ذکر شوق کی کنجی ہے۔ انسان جتنا جتنا ذکر کرے گا ویسے ویسے اس کا شوق بڑھتا جائے گا اور شوق کی منزلِ مراد دیدارِ محبوب ہے اور دیدارِ محبوب ہی اس کی جنت ہے اور اس کی معراج یہ ہے کہ اُس کا محبوب اسے اپنا لے۔ محبّ دم بہ دم اپنے محبوب کو یہی یقین دلاتا ہے کہ میں تیرا ہوں۔مگر وہ کیسا سہانا منظر ہوگا جب اس کا محبوب اس سے کہے کہ میں تیرا ہوں۔

۳۔محبت صفحہ ۳۲۵۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''اے اللہ! میں تجھ سے تیری قضا کے ساتھ تیری خوشنودی کو، اور زندگی کے بعد موت کی برکت کا، اور موت کے بعد زندگی کی خوشی کا، اور تیرے چہرے کے دیدار کی لذّت کا، اور نقصان دہ تنگی اور گمراہ کرنے والے فتنے کے بغیر تیرے دیدار اور ملاقات کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! مجھے اپنے چہرے کی طرف دیکھنے کی لذت اور اپنی ملاقات کا شوق عطا فرما''۔

رسولؐ اللہ کے فرمان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے محبوب کا دیدار کر کے بہت سے لوگ گمراہ بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ ہمارا محبوب ہے ہی ایسا۔ تاریخ بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جس نے بھی آنکھ جما کر علیؑ کو دیکھ لیا وہ پھر خدا سے کم کی بات نہیں کرتا۔

۴۔ بی بی فاطمۃؑ الزہراء نے فرمایا۔''اے اللہ! میں تجھ سے تیرے دیدار اور تجھے دیکھنے کا سوال کرتی ہوں''۔(محبت صفحہ ۳۲۷)۔

۵۔تفسیر نورالثقلین ج ۳ صفحہ ۴۶۵۔امام علیؑ رضا نے فرمایا۔

''رسولؐ اللہ کیلئے بھی کوہِ فاران سے وہی نور بلند ہوا جو حضرتِ موسیٰؑ کے لئے کوہِ طور پر اور حضرت عیسیٰؑ کیلئے کوہِ ساعیر پر چمکا تھا''۔

اب ذرا یہ بھی دیکھ لیں کہ حضرتِ موسیٰؑ نے کس کے دیدار کی تمنا کی تھی۔

۶۔تفسیر نورالثقلین ج ۳ صفحہ ۴۴۱۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''جب موسیٰ نے اللہ کے دیدار کا تقاضا کیا تھا تو اللہ نے فرمایا کہ اِس پہاڑ پر بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد اللہ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ صف در صف برق، رعد، ہَوا اور کڑک کو لے کر موسیٰ کے پاس سے گزریں۔ چنانچہ جب ایک گروہ موسیٰ کے پاس سے گزرتا تو آپ اس سے پوچھتے کہ ''کیا تم میں میرا رب بھی ہے؟''۔ وہ گروہ کہتا کہ نہیں! وہ آنے ہی والا ہے۔ اے فرزندِ عمران! تم نے بہت بڑا سوال کیا ہے''۔

ہم اس کی کوئی وضاحت نہیں کریں گے۔ اب یہ آپ کی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ کون سا رب ہے جو فرشتوں کے جھرمٹ میں آتا ہے؟۔ اسی رب کے دیدار کا تقاضا موسیٰ نے کیا تھا۔ اور اسی رب نے کوہِ فاران پر حضرتِ ختمی مرتبت کو اپنا جلوہ دکھایا تھا۔ اور اسی رب کو بار بار دیکھنے کے اشتیاق کا اظہار آنحضرتؐ فرمایا کرتے تھے۔

۷۔ القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۱۰۱۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''ایک دن رسولؐ اللہ اپنی بیٹی جنابِ فاطمۃؑ الزہراء کے گھر میں موجود تھے اور حضرتِ امام حسینؑ آنحضرتؐ کے پہلو میں تشریف رکھتے تھے کہ اچانک پیغمبرِ خدا نے گریہ کرنا شروع کیا اور سجدہ ریز ہو گئے۔ پھر فرمایا۔ ''اے فاطمہؑ! اے دخترِ محمدؐ! علیؑ اعلیٰ ابھی خوبصورت شکل میں آپؑ کے گھر میں مجسّم ہوا اور کہا کہ اے محمدؐ! کیا تم حسینؑ سے محبت رکھتے ہو؟''۔

یہی وہ علیِ اعلیٰ ہے جس کے دیدار کی آس لئے ہم جی رہے ہیں۔ اسی کے دیدار کے

وعدے نے موت کو ہمارے لئے خوش خبری بنا دیا ہے جیسا کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''تم میں سے کسی بھی شخص کے اور اس چیز کے دیدار کے درمیان جو اس کی آنکھ کی ٹھنڈک اور روشنی کا باعث بنے صرف اور صرف اتنا فاصلہ ہے کہ اس کی جان اس کے حلق تک پہنچ جائے۔(القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۳۸۱) اور اسی کے دیدار کی امید ائمہ طاہرینؑ نے دلائی ہے۔ اس بارے میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں۔ ''جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے یہاں تک کہ وہ اللہ کو دیکھ لے اور اللہ اسے دیکھ لے تو اسے چاہیئے کہ وہ آلِ محمدؐ سے محبت کرے اور ان کے دشمنوں پر تبرّا کرے اور اس خاندان میں سے امامؑ کا پیروکار ہو۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ اللہ کو دیکھ لے گا اور اللہ اس پر نظر فرمائے گا''۔(القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ٦٦)۔

صرف ہم ہی نہیں بلکہ فرشتے بھی اس پیکرِ جمال کی ایک جھلک کو ترس رہے ہیں۔ امام حسن عسکریؑ فرماتے ہیں۔ ''بے شک آسمانوں اور حجابوں کے فرشتے اس طرح علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کے دیدار کے مشتاق ہیں جس طرح سے ایک شفیق ماں اپنے بچوں کو دیکھنے کی تڑپ رکھتی ہے''۔(القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۴۳۱)۔

جب محبوب محبّ بن جائے

یہ محبت کی وہ منزل ہے جس کی ہر محبّ آرزو رکھتا ہے۔ جب محبوب اپنے محبّ کے ناز

اٹھانے لگے اور اُس کی کیفیات کو اپنے اوپر طاری کرلے تو پھر محبت لافانی ہو جاتی ہے۔ پھر محبّ کیلئے موت ایک بے معنی لفظ بن جاتا ہے کیونکہ محبت وہ آبِ حیات ہے جو محبّ کو زندۂ جاوید بنا دیتی ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی کہ آپ کا محبوب آپ کو کس طرح سوچتا ہے۔

ا۔ القطرۃ من بحارج ۲ صفحہ ۲۹۸۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا۔

''جو کوئی ہمارے شیعوں سے دشمنی کرے اس نے ہمارے ساتھ دشمنی کی۔ اور جو کوئی ان سے محبت کرے اس نے ہمارے ساتھ محبت کی کیونکہ وہ ہم سے ہیں اور ہماری طینت سے خلق ہوئے ہیں۔ ہمارے شیعہ نورِ خدا سے دیکھتے ہیں اور اس کی رحمت میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ وہ کرامتِ خدا سے ہدایت پاتے ہیں۔ ہمارا کوئی شیعہ مریض نہیں ہوتا مگر یہ کہ ہم اُس کے مریض ہونے سے مریض ہوتے ہیں۔ جب وہ مغموم ہوتے ہیں تو ہم بھی مغموم ومحزون ہوتے ہیں اور اگر وہ خوشحال ومسرور ہوں تو ہم بھی خوشحال ومسرور ہوتے ہیں۔ ہمارا کوئی بھی شیعہ ہماری نظروں سے پنہاں نہیں ہے۔ خواہ وہ زمین کے مشرق میں رہتا ہو یا مغرب میں۔ اگر ان میں کوئی مقروض ہو جائے تو ہم اس کا قرض ادا کرتے ہیں''۔

۲۔ القطرۃ من بحارج ۲ صفحہ ۲۴۸۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''اے میرے معبود! یہ شیعہ بہت کم تعداد میں ہیں۔ ان کی زندگی ہماری زندگی اور

<u>ان کی موت ہماری موت کی مانند قرار دے۔ اپنے دشمنوں کو ان پر مسلّط نہ کر کہ اس طرح ہمارے دل کو اذیّت ہوتی ہے</u>۔ کیونکہ اگر تو اُن کیوجہ سے ہمیں مصیبت میں گرفتار کرے تو ہرگز زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا"۔

۳۔ القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۸۲۔

یہ ہمارے زمانے کے امامؑ کی ایک دعا ہے۔ اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ماں اپنے بچے کو اپنے دامن میں چھپا کر اسے تمام آفات سے بچالیتی ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس صورتِ حال سے لگائیے کہ جب باپ اپنے بچے پر غضبناک ہوکر اسے سزا دینا چاہتا ہے تو ماں کس طرح آگے بڑھ کر اپنے بچے کی ڈھال بن جاتی ہے۔ ہماری جانیں قربان ہوں اپنے آقاؤں پر! ہمیں تو محبت کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔ ہم کہاں اس قابل ہوگئے کہ وہ ہمارے ہر عیب پر پردے ڈالیں اور ہمیں ہر مصیبت سے بچائیں؟۔

امامؑ فرماتے ہیں۔ "اے معبود! ہمارے شیعہ ہماری بچی ہوئی مٹی سے پید ہوئے اور ہماری ولایت کے پانی کے ساتھ مخلوط کئے گئے ہیں۔ اے اللہ! <u>ہماری محبت کے بھروسے پر انہوں نے جو گناہ کئے ہیں ان کو معاف کردے</u> اور قیامت کے دن اُن کے معاملات ہمارے سپرد کردے۔ اور ہماری عزت واکرام کی خاطر جو گناہ وہ انجام دے چکے ہیں انہیں معاف فرمادے اور انہیں عذاب نہ کر۔ <u>ہمارے دشمنوں</u>

کے سامنے انہیں سزا نہ دینا اور اگر ان کی نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہو تو ہماری نیکیوں کے ذریعے سے اسے وزنی کر دینا"۔

علیؑ کے غیر مسلم دوست

محبت وہ طاقتور سمندر ہے جو ذات پات، رنگ و نسل، مذہب و ملّت، غرض ہر شے کو تنکوں کیطرح بہا کر لے جاتا ہے۔ جو بھی علیؑ کا ہو گیا تو وہ علیؑ ہی کا ہو کر رہ گیا۔ اب اس کی پہچان نہ کوئی قوم رہ جاتی ہے نہ کوئی مذہب اب اس سے پوچھو کہ تو کون ہے؟ تو وہ جواب دے گا کہ میں علیؑ کا بندہ ہوں اور اس کی علیؑ سے محبت اُسے ایک نہ ایک دن علیؑ سے ملحق کر کے رہتی ہے۔ درمیانی مراحل چاہے کچھ بھی ہوں لیکن اس کا انجام بہر حال بخیر ہوتا ہے۔ یہاں ہم تفصیل سے کام نہیں لیں گے بلکہ صرف ایک واقعہ نقل کریں گے جو ہمارے مدعا کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

القطرۃ من بحار ج ا صفحہ ۲۸۷۔

"امیرالمومنینؑ کا ایک یہودی دوست تھا جو آپؑ کے ساتھ بڑا مانوس تھا اور حضرتؑ کا جو بھی کام ہوتا اسے انجام دیتا۔ یہاں تک کہ وہ اِس دنیا سے چل بسا۔ علیؑ اُس کی خاطر بڑے غمگین ہوئے۔ پیغمبرؐ نے مسکراتے ہوئے علیؑ کو دیکھا اور فرمایا۔ "یا ابوالحسنؑ! آپؑ کے اس یہودی دوست کے ساتھ کیا ہوا؟" علیؑ نے عرض کیا کہ وہ مر گیا ہے اور اس دنیا سے چلا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "اُس کی خاطر غمگین ہو؟" عرض کیا کہ ہاں یا

رسولؐ اللہ۔ آپؐ نے فرمایا۔ ''کیا اسے دیکھنا چاہتے ہو؟'' ۔عرض کیا جی ہاں۔ آپؐ نے فرمایا۔ ''اپنا سر اوپر کرو اور دیکھو''۔ جب مولاؑ نے سر اوپر کیا تو چوتھے آسمان تک ان کی آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھ گئے اور وہاں ایک سبز رنگ کا گنبد دیکھا جو قدرتِ خدا کے ساتھ بغیر کسی چیز کے لٹکا ہوا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ ''یا ابوالحسنؑ! یہ اُن کا ٹھکانہ ہے جو کفارِ ذمّی، یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں میں سے تیرے ساتھ محبت رکھتے ہوں گے۔ لیکن تیرے شیعہ مومن قیامت کے دن میرے اور تیرے ساتھ بہشت میں ہوں گے''۔

گرفتارِ محبت..........شیعانِ علیؑ

اب تک ہم نے اپنے محبوب کے بارے میں گفتگو کی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ محبوب کے ذکر سے کبھی دل بھرتا ہی نہیں۔ ہم صدقِ دل سے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ہم ذکرِ محبوب کا حق ادا نہ کرسکے اور یہ بات ہمارے بس کی ہے بھی نہیں اس لئے ہم تو بجائے خوش ہونے کے اپنے محبوب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنی کوتاہی کی معافی مانگتے ہیں اور رزقِ معرفت کا سوال کرتے ہیں۔ اب ہم نے اپنے محبوب کو خوش کرنے کا ایک اور راستہ ڈھونڈا ہے اور وہ یہ کے ان کے محبوں کی بات کی جائے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اہلبیتؑ کا محبّ اللہ کا محبوب ہوتا ہے اور انکا نام ''گرفتارِ محبت'' بھی ہم نے از خود تجویز نہیں کیا بلکہ یہ نام بھی ہم نے خود معصومؑ سے ہی مستعار لیا ہے جیسا کہ فضائل الشیعہ صفحہ ۲۵ پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ ''آگاہ رہو! جو بھی علیؑ سے محبت کرے گا، آسمانوں اور زمین میں اسکا نام ''اسیرِ خدا'' رکھا جائے گا''۔ لہٰذا آیئے اب ہم انؑ کے محبوں کے ساتھ کچھ لمحے گزارتے ہیں اور ان کے شب و روز پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

محبّ اور شیعہ میں فرق

ہمارے محبوب کی محبت عام ہے اور کائنات کی ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اسے

کسی خاص گروہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔لیکن شیعہ ایک ارتقائی منزل ہے جس تک محبّ اپنی کوشش کے ذریعے پہنچتا ہے اور یہ ارتقاء عقیدے اور معرفت کا ہے۔محبّ کان سے نکلے ہوئے سونے کی مانند ہے جسے عقیدے اور معرفت کی آنچ پر تپایا جاتا ہے تو وہ کندن بن جاتا ہے اور شیعہ کہلاتا ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ یہ فرق ہم آپ کو معصومؑ کی زبان سے ہی سنوائیں تا کہ اِس بہانے خود اُنؑ کا ذکر بھی ہو جائے۔

معجزاتِ آلِ محمدؑ (ترجمہ مدینۃ المعاجز) ج ۴ صفحہ ۲۴۹۔

''ابو یعقوب یوسف بن زیاد اور علی بن یسار سے یہ روایت مروی ہے کہ ہم ایک شب امام حسن عسکریؑ کی زیارت کے لئے انؑ کے بالا خانے پر گئے۔اُس وقت کا والی آپؑ کی بڑی تعظیم کیا کرتا تھا اور اس کے حاشیہ نشین بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔اسی دوران ہم نے دیکھا کہ کوتوالِ شہر آرہا ہے اور اس نے ایک شخص کو زنجیروں میں پابند کیا ہوا ہے۔امام حسن عسکریؑ نے دریچے سے جھانک کر دیکھا تو وہ اپنی سواری سے اترا اور آپؑ کا احترام بجالایا۔اس نے کہا کہ ''مولاؑ! آپ اِس شخص کو دیکھ رہے ہیں؟۔یہ رات کے وقت ایک صرّاف کی دوکان پر بیٹھا تھا۔میں نے اسے چور سمجھ کر گرفتار کیا ہے اور میرا اصول یہ ہے کہ میں چور اُچکّوں کو پانچ سو کوڑے سزا دیتا ہوں۔لیکن جب میں نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا تو اس نے مجھ سے کہا۔''خدا سے ڈر۔میں امیرؑ المومنین کا شیعہ ہوں اور میں قائمؑ بامر اللہ کے والد کا شیعہ ہوں''۔جب میں نے اس سے یہ بات سنی تو میں نے سزا کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے یہاں آپؑ کے پاس لے کر

آیا ہوں اور میں نے اس سے یہ کہہ دیا ہے کہ میں تجھے امام حسن عسکریؑ کے سامنے لے جاؤں گا۔ اگر انہوںؑ نے تیرے شیعہ ہونے کی تصدیق کر دی تو میں تجھے چھوڑ دوں گا ورنہ میں تجھے ہزار کوڑے ماروں گا اور اُسکے بعد تیرے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا۔

اب فرزندِ رسولؐ! آپؑ ہی اسکے متعلق فیصلہ فرمائیں کے کیا یہ واقعی امیرؑالمومنین کا شیعہ ہے؟۔ امامؑ نے فرمایا۔ ''معاذ اللہ! یہ امیرؑالمومنین کا شیعہ نہیں ہے اور اسکے اسی گمان کیوجہ سے تو اللہ نے اُسے تیرے ہاتھوں میں قید کر دیا ہے''۔ یہ سنکر کوتوال شہر نے کہا: اب آپؑ نے میرا مسئلہ حل کر دیا ہے اب میں اسے پورے پانچ سو کوڑے ماروں گا۔ پھر وہ اُسے لیکر دُور چلا گیا اور کچھ فاصلے پر اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے لٹاؤ۔ چنانچہ سپاہیوں نے اُسے لٹایا۔ پھر اُس نے دو سپاہیوں سے کہا کہ ایک اِسکی دائیں طرف کھڑا ہو جائے اور دوسرا اس کی بائیں طرف کھڑا ہو جائے اور اسے ڈنڈوں سے خوب پیٹا جائے۔ چنانچہ دو سپاہی اسکے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور اُنہوں نے ڈنڈے مارے لیکن کوتوال یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اِن کے ڈنڈے اس کی کمر پر لگنے کی بجائے زمین پر لگ رہے تھے اور ملزم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی۔ کوتوال نے چیخ کر کہا: تم یہ کیا کر رہے ہو تم تو ڈنڈے زمین پر برسا رہے ہو اس کی کمر پر مارو۔ سپاہیوں نے پھر سے جو ڈنڈے مارے تو ملزم کو لگنے کے بجائے وہ خود انکے سروں پر لگنے شروع ہو گئے۔ کوتوال نے ڈانٹ کر کہا: ارے تم تو پاگل ہو گئے ہو۔ ایک دوسرے پر ڈنڈے کیوں چلا رہے ہو ملزم کو کیوں نہیں مارتے؟۔ اُنہوں نے کہا: ہم مارنا تو ملزم

کو چاہتے ہیں لیکن جیسے ہی ہاتھ اُٹھاتے ہیں تو ہمارے ہاتھوں میں لرزہ پیدا ہوتا ہے اور ہم ایک دوسرے کو ڈنڈے مارنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر کوتوال نے اپنے ساتھ موجود دوسرے چھ سپاہیوں سے کہا کہ تم آگے بڑھو اور ملزم کو مارو اور کوتوال خود انکے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ چنانچہ جب تمام سپاہیوں نے ڈنڈے اُٹھا کر ملزم کو مارنا چاہا تو اُنکے ہاتھوں میں لرزہ پیدا ہو گیا اور ملزم کو لگنے کے بجائے وہ ڈنڈے خود کوتوال کے جسم پر پڑے۔ جب کوتوال کو ڈنڈے لگے تو وہ سواری سے گر پڑا اور چیخ کر کہا: ظالمو! تم نے مجھے مار ڈالا۔ تم نے یہ کیا کیا؟ سپاہیوں نے کہا: خدا کی قسم! ہم نے تو اس ملزم کو ہی ڈنڈے مارنے کیلئے ہاتھ اُٹھائے تھے لیکن ہمارے ہاتھ کانپ گئے اور یہ ڈنڈے آپکو جا لگے۔ اُس وقت ملزم نے کوتوال سے کہا کہ آپ مجھے دوبارہ میرے آقا و مولاؑ کی خدمت میں لے جائیں اور میرے متعلق وہؑ جو حکم صادر فرمائیں تم اُس پر عمل کرو۔

کوتوال اُسے دوبارہ امام حسن عسکریؑ کے پاس لے آیا اور اُس نے کہا مولاؑ! آپؑ نے تو فرمایا تھا کہ یہ شخص امیرؑ المومنین کے شیعوں میں سے نہیں ہے۔ اور میرا تو ایمان یہ ہے کہ جو آپکا شیعہ نہ ہو وہ ابلیس کا شیعہ ہوتا ہے اور دوزخی ہے جبکہ میں نے تو اِسکے اتنے معجزات مشاہدہ کئے ہیں کہ اتنے معجزات انبیاءؑ کے ہی ہو سکتے ہیں آپؑ نے کوتوال سے فرمایا بندۂ خدا! یہ شخص اگر چہ اپنے دعوۂ شیعہ میں جھوٹا ہے لیکن یہ پھر بھی معذور ہے کیونکہ اسے یہ علم ہی نہیں ہے کہ شیعہ کون ہوتے ہیں۔ اگر اسے معلوم ہوتا کے شیعہ کون ہیں اور پھر وہ شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتا تو تمھاری تمام سزا ابھی اسے

برداشت کرنا پڑتی اور تیس سال تک کا عرصہ زندان میں بسر کرنا پڑتا۔ اللہ نے اسکی لاعلمی کیوجہ سے اس پر رحم کیا ہے۔ تم اسے چھوڑ دو۔ یہ شخص ہمارا دوست اور ہمارا محبؔ ہے"۔

یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں سے اصل واقعہ ہم نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے بعد امامؑ نے شیعہ ہونے کو دو شرائط سے مشروط کیا، ایمان اور عملِ صالح۔ مراد یہ کہ محبؔ تو کوئی بھی ہوسکتا ہے لیکن شیعہ ہونے کیلئے ضروری ہے کہ:۔

۱۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہو یعنی **الا الٰـہ الّا الـلـہ، محمدؐ الرسول اللہ** کا قائل ہو۔

۲۔ دائرۂ ایمان میں داخل ہو یعنی **علیؑ ولی اللہ** کا قائل ہو۔

۳۔ اہلبیتؑ کی معرفت میں کوشاں ہو۔

۴۔ اللہ نے جس شے کو حلال کیا ہے اسے حلال جانے اور جس شے کو حرام کیا ہے اسے حرام جانے یعنی شریعتِ محمدیؐ میں سے کسی چیز کا انکار نہ کرتا ہو اور حتی الامکان ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہو۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ یہ چاروں ضمنی شرائط ہیں۔ بنیادی شرط بہر حال محبتِ اہلبیتؑ ہے جس کے بغیر یہ چاروں چیزیں فائدہ نہیں دیتیں۔ یعنی شیعہ اُس محبؔ کو کہتے ہیں جو مندرجہ بالا شرائط پر بھی پورا اترتا ہو۔

متقین کون ہیں؟

سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا۔ ''وہ کتاب صرف متقین کو ہدایت کرتی ہے''۔ اور سورۂ مائدہ ۲۷میں ارشاد ہوا۔ ''بس اور بس، اللہ صرف متقین سے ہی قبول کرتا ہے'' ان دو آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ عقیدہ ہو یا عمل، دونوں کیلئے متقی ہونا لازمی ہے۔ لیکن متقی کون ہوتا ہے، اس بات پر شاید ہی کبھی غور کیا گیا ہو۔ حیرت ہے کہ جس چیز پر نجات کا مکمل دار و مدار ہے اس سے آج تک بے اعتنائی برتی گئی اور شیعوں میں شاید ہی کوئی جانتا ہو کہ تقویٰ کیا چیز ہوتی ہے۔ اسی لئے ہم نے ضروری جانا کہ اس مسئلے کو بھی واضح کر دیا جائے تا کہ ہر شیعہ کو متقی ہونے کا یقین ہو سکے۔

تقویٰ کا مطلب ہے ''خود کو اللہ کے غضب سے بچالینا''۔ اور اس کیلئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ جانا جائے کہ اللہ کن باتوں پر غضبناک ہوتا ہے تا کہ انسان ان باتوں سے پرہیز کرے اور اللہ کے غضب سے خود کو بچالے۔ ذیل میں ہم قرآنِ مجید سے چند آیات پیش کرر ہے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ اللہ تقویٰ سے کیا مراد لیتا ہے۔

۱۔ بقرہ ۱۸۹۔ ''اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو، لیکن نیکی اس کی ہے جو اللہ کے غضب سے بچے۔ اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور اللہ کے غضب سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ''۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ گھروں میں دروازوں سے داخل نہ ہونا اللہ کے غضب کو دعوت دیتا

ہے۔ اب اس کا مطلب کیا ہے، یہ جاننے کیلئے ہم معصومؑ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تفسیرِ نورالثقلین صفحہ ۲۰۷ بحوالہ تفسیرِ صافی صفحہ ۵۷۔ جناب امیرالمومنین نے فرمایا۔

''ہم وہ بیوت (گھر) ہیں جن کے دروازوں میں سے آنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور ہم اللہ کا دروازہ (باب اللہ) ہیں اور ہم اللہ کے گھر ہیں جن میں آنا چاہیئے۔ پھر جس نے ہماری مطابعت کی اور ہماری ولایت کا اقرار کیا، وہ تو بے شک گھروں میں دروازے سے آیا۔ اور جس نے ہماری مخالفت کی اور غیر کو ہم پر فضیلت دی وہ گھروں کے پچھواڑے سے آیا''۔

مولاؑ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ اللہ کے غضب سے بچنے کیلئے ولایتِ علیؑ کا اقرار، ہر معاملے میں اہلبیتؑ کی طرف رجوع کرنا، اہلبیتؑ کی مخالفت نہ کرنا چاہے وہ مخالفت قولی ہو یا فعلی اور کسی اور کو اہلبیتؑ کا متبادل نہ سمجھنا، امرِ لازمی ہے۔ پس جو بھی ولایتِ علیؑ کی کسی بھی طریقے سے مخالفت کرتا ہو، اہلبیتؑ کے بجائے کسی اور کی طرف رجوع کرتا ہو اور انؑ کی ولایت میں کسی اور کو شریک کرتا ہو، وہ گروہِ متقین سے خارج ہے کیونکہ اس نے تو غضبِ خدا کو اپنے اوپر واجب کرلیا ہے۔

۲۔ آلِ عمران ۷۶۔ ''ہاں جس نے اپنا عہد پورا کیا اور اپنے آپ کو غضبِ خدا سے بچالیا تو یقیناً اللہ تعالیٰ متقین سے محبت کرتا ہے''۔

یہ ظاہر ہے کہ دنیاوی وعدوں کو پورا کرنا انسان کو محبوبِ خدا نہیں بنا سکتا کیونکہ وعدے کی

پابندی کرنے والے مسلمانوں سے زیادہ دیگر اقوام میں کہیں زیادہ نظر آتے ہیں لہٰذا یہ چیز غضبِ خدا سے نہیں بچا سکتی۔ غضبِ خدا سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ اُس عہد و میثاق کی پاسداری ہے جو یومِ الست ہم سے لیا گیا تھا۔ پس جس کو وہ عہد یاد ہی نہیں اس کا تقویٰ سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔

۳۔ توبہ ۳۶۔ ''یقیناً اللہ کے نزدیک مہینوں کی تعداد، جس دن سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، اللہ کی کتاب میں بارہ ہی مہینے ہے، ان میں سے چار حرمت والے ہیں، یہی پکا دین ہے۔ پس تم اُن میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرو، اور تم سب مل کر مشرکوں سے جنگ کرو جس طرح وہ سب مل کر تم سے جنگ کرتے ہیں اور جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے''۔

بارہ مہینوں سے کیا مراد ہے، ہم اس پر بحث نہیں کریں گے کیونکہ یہ مسلّماتِ شیعہ سے ہے کہ ان سے مراد ائمہ اثناعشر ہیں۔ آیت سے پتہ چلتا ہے کہ متقین وہی ہیں جو بارہ ائمہؑ سے خود کو وابستہ رکھتے ہیں اور ان کی تعداد میں کمی یا زیادتی نہیں کرتے۔ آیت نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اِن بارہ سے روگردانی کرنے والا اللہ کے نزدیک مشرک ہے۔

۴۔ توبہ ۱۱۹۔ ''اے وہ لوگوں جو ایمان لا چکے ہو تم اللہ کے غضب سے خود کو بچاؤ اور صادقینؑ کے ساتھ ہو جاؤ''۔

تفسیر المتقین صفحہ ۳۶۶ بحوالہ تفسیرِ صافی اور تفسیر مجمع البیان میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ صادقین سے مراد ہم ہیں اور امام رضاؑ فرماتے ہیں کہ صادقین سے مراد

ائمہؑ ہیں۔معلوم ہوا کہ متقی بننے کیلئے ضروری ہے کہ انسان خود کو ہر حال میں ائمہؑ طاہرین سے وابستہ رکھے اوران کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر نہ بھاگے۔

یقیناً ان آیات کے ذریعے آپ صحیح نتیجے تک پہنچ گئے ہوں گے کہ تقویٰ اہلبیتؑ سے محبت،انؑ کی ولایت پر ایمان اور انؑ سے وابستہ ہو جانے کا نام ہے اور جب انسان انؑ سے وابستہ ہو جائے تو پھر اس کی ہدایت بھی ہوتی ہے،اس کے اعمال بھی قبول ہوتے ہیں اور اس کے گناہ بھی بخشے جاتے ہیں۔ یہاں ہم چند احادیث نقل کررہے ہیں تا کہ ہماری بات کی مکمل توثیق ہو جائے۔

۱۔کمال الدین وتمام النعمہ ج ۲ صفحہ ۳۴۸۔

سورۂ بقرہ کی آیت **"ذٰلک الکتاب لاریب فیه هدی اللمتقین"** کی تفسیر میں امامِ جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔"اس آیت میں متقین سے مراد مولا علیؑ کے شیعہ ہیں"۔

۲۔تفسیرِ نورالثقلین ج ا صفحہ ۵۹،۶۷۔

امامِ جعفر صادقؑ نے فرمایا۔"متقین سے مراد ہمارے شیعہ ہیں"۔

۳۔القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۴۷۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔"خدا کی قسم فقط تمھارے اعمال قبول کئے جائیں گے۔خدا کی قسم خدا صرف تمھیں بخشے گا"۔

۴۔القطرۃ من بحارج ۲صفحہ ۳۷۔

امام محمد باقرؑ نے فرمایا۔ ''ہماری مودّت اور دوستی مخصوص ہے متقین کے ساتھ''۔

قلّتِ شیعہ

جو شے جتنی زیادہ قیمتی ہوتی ہے اتنی ہی نایاب ہوتی ہے۔شیعانِ علیؑ سے زیادہ قیمتی اور کون سی چیز ہوسکتی ہے اس لئے اِس جنسِ گراں کا دستیاب ہونا بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ خاص طور پر زمانۂ غیبت میں کسی شیعہ کو پالینا ایک عظیم کامیابی ہے کیونکہ یہ آزمائش کا زمانہ ہے اور کوئی کوئی ہوتا ہے جو اِس دَور میں اپنے ایمان کو بچا کر لے جائے۔ یہاں ہر قدم پر شیطان نے اپنے جال پھیلائے ہوئے ہیں جن سے صرف وہی محفوظ رہ سکتا ہے جو خالص شیعہ ہو اور حق و باطل کی واضح پہچان رکھتا ہو۔جس کے پاس یہ تمیز نہ ہو وہ خوش عقیدہ ہوتے ہوئے بھی کہیں نہ کہیں ضرور پھنسے گا۔کوئی اُسے مولا علیؑ کے نام پر گھسیٹ لے گا،کوئی امامِ حسینؑ کے نام پر پھانس لے گا اور کوئی اسے امامِ زمانؑ کے نام پر اپنا قیدی بنالے گا۔محفوظ صرف وہی رہے گا جس نے اپنی ساری محبتیں،ساری عقیدتیں اور ساری اطاعتیں صرف اہلبیتؑ کے دامن سے وابستہ کررکھی ہوں۔ہم اس بارے میں چند نصوصِ معصومینؑ پیش کررہے ہیں تاکہ آپ کو ہماری بات کی صداقت کا یقین آسکے۔

۱۔تفسیرِ نور الثقلین ج ۲صفحہ ۲۰۲۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''اُس (حضرتِ قائمؑ) کے زمانۂ غیبت میں اُس کا عقیدہ رکھنے والے افراد سرخ گندھک سے بھی زیادہ نایاب ہوں گے''۔

۲۔تفسیرِ نورالثقلین ج ۴صفحہ ۲۹۶۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''زمانۂ غیبت میں ان کی امامت کے عقیدے پر وہی قائم رہے گا جس کے دل کا اللہ نے امتحان لے لیا ہو''۔

۳۔کمال الدین وتمام النعمہ ج ۲صفحہ ۳۶۰۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''اللہ تعالیٰ ہمارے قائمؑ کی غیبت کے عرصے کو طویل کردے گا تاکہ حق واضح ہوجائے، ایمان ارتداد کی کدورت سے خالص ہوجائے اور وہ جن کی طینت خبیث ہے وہ ہمارے اُن مخلص شیعوں سے جدا ہوجائیں جو ان کے نفاق سے ڈرتے ہیں''۔

یہ بہت اہم حدیث ہے جس سے ہمارے لئے ایک صحیح سمت معیّن ہوتی ہے اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ایمان صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے جبکہ:۔

(الف)۔ہم خبیث اور طیّب میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور ہر اس شخص کے پیچھے نہ لگ جاتے ہوں جو علیؑ ولی اللہ کا قائل ہو کیونکہ شیطان کے حربوں میں سے ایک حربہ یہ بھی ہے کہ وہ محبتِ اہلبیتؑ کے نام پر بھی لوگوں کو پھانستا ہے اور جب وہ اس کی گرفت میں آجاتے ہیں تو پھر وہ جہاں چاہتا ہے انہیں لے جاکر پھینک دیتا ہے۔اور یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان کسی کی شخصیت کے سحر میں

گرفتار ہو جائے۔

(ب)۔ ہم ایسے لوگوں کو پہچان کر بے خوف نہ ہو جائیں بلکہ ان کے مختلف ہتھکنڈوں سے ہمہ وقت چوکنے رہیں اور خود کو ایسے لوگوں سے جدا رکھیں۔ جیسا کہ نہج الاسرار ج اصفحہ ۴۷ پر امیر المومنین فرماتے ہیں۔ ''لوگوں سے کم میل جول دین کی نگہبانی کرتا ہے''۔ اور امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ ''سعادتمندی ہے اس شخص کیلئے جس کی پروا نہ کی جائے۔ وہ لوگوں کو جانتا ہے اور اپنے بدن سے اُن سے ملتا ہے اور ان کے اعمال میں دل سے نہیں ملتا۔ وہ اسے ظاہر سے جانتے ہیں اور وہ انہیں باطن سے جانتا ہے''۔ (معانی الاخبار صفحہ ۴۳۱)

۴۔ القطرۃ من بحار ج ۴ صفحہ ۳۸۸۔ امام علی نقیؑ نے فرمایا۔

''ہمارے شیعہ گنے چُنے اور شناخت شدہ لوگ ہیں کہ نہ تو ان میں سے کوئی شخص کم ہوگا اور نہ زیادہ''۔

خصائصِ شیعہ

خود کو شیعہ کہلانا ایک بہت آسان کام ہے۔ یہاں تک کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی جنہوں نے شیعہ مذہب کی رد میں ''تحفۂ اثناعشری'' جیسی بدنامِ زمانہ کتاب لکھی ہے، وہ بھی شیعہ ہونے کے دعویدار ہیں۔ لیکن شیعہ ہونا ایک الگ بات ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر مصیبت سہنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اسے صبر کی اُس منزل پر قائم و

دائم ہونا پڑتا ہے جس کی حدیں شکر سے ملتی ہیں اور جو انسان شعوری اور اختیاری طور پر مذہب شیعہ میں داخل ہوتا ہے وہ ان تمام مصائب کا سامنا کرنے کیلئے ہر وقت آمادہ ہوتا ہے اور کسی قسم کی بے قراری کا شکار نہیں ہوتا۔ شیعوں کیلئے ایک مشکل، جسے لوگ چھوٹا سمجھتے ہیں، حقیقتاً بڑی صبر آزما ہوتی ہے اور وہ ہے لوگوں کے طعنے سننا اور انہیں ہنسی خوشی برداشت کرنا۔ کوئی انہیں کافر کہتا ہے، کوئی غالی کہتا ہے اور کوئی نصیری کے نام سے پکارتا ہے لیکن اُن کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں پڑتی اور اللہ کے نزدیک یہی ان کا کمال ہے جیسا کہ امام رضاؑ نے فرمایا کہ ''مخالفین کی طعنہ زنی برداشت کرنے کے لئے بہت بڑے حوصلے کی ضرورت ہے''۔ (تفسیر نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۲۵۹)۔ شیعوں کی اسی آزمائش کا ذکر کرتے ہوئے امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''تمھارے ایمان کی اس وقت تک تکمیل نہ ہوگی جب تک تم پر وہ حالات نہ گزریں جو تم سے پہلے صالحین پر گزرے تھے۔ تم سے تمھاری جان و مال کا امتحان لیا جائے گا اور تمھیں دشمنانِ خدا سے بہت سی اذیتناک باتیں سننا ہوں گی اور تمھیں ہر بات پر صبر کرنا ہوگا۔ لوگ تمھیں رسوا کریں گے اور تم سے بغض رکھیں گے اور تمھیں خدا کی رضا اور آخرت کے گھر کے حصول کے لئے تمام مظالم برداشت کرنا پڑیں گے۔ تمھیں غصّے کے گھونٹ پینے ہوں گے۔ لوگ تمھاری سچی باتوں کو جھٹلائیں گے اور تم سے بغض و عناد رکھیں گے مگر تمھیں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامنا ہوگا''۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۸۴)۔ یہ کام بظاہر آسان لگتا ہے لیکن اس کی گراں باری کو وہی جانتا ہے جو اس کیفیت سے گزرا ہو۔

جس کام کو معصومؑ مشکل قرار دیں اس سے زیادہ مشکل اور کون سی ہو سکتی ہے۔ تفسیر نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۴۲۴ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ ''لوگوں کو راضی رکھنا ناممکن ہے اور لوگوں کی زبانوں کو خاموش رکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ لوگوں کی زبانوں سے تو انبیاءؑ تک محفوظ نہ رہے''۔ اسی طرح معانی الاخبار صفحہ ۴۷ پر امام حسن عسکریؑ فرماتے ہیں۔ ''ان (شیعوں) کا ہمارے دشمنوں سے سنی جانے والی باتوں پر آنے والے غصے پر صبر سے کام لینا اور برداشت کرنا راہِ خدا میں اپنے خون میں غوطہ زن ہونے کا ثواب رکھتا ہے''۔

غریب شہر

حقیقت یہ ہے کہ مومن اپنے شہر میں رہتے ہوئے بھی غریب الوطن ہوتا ہے۔ القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۸۶ پر امیرالمومنینؑ نے پہلے ہی اس حالت کی نشاندہی کر دی تا کہ شیعوں کے دل مضبوط رہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں۔ ''آئندہ ایسا فتنہ پیش آنے والا ہے جو تاریک، اندھا اور پوشیدہ ہے۔ اس فتنے سے صرف ناشناس اور گمنام اشخاص ہی نجات پا سکیں گے۔ یہ وہ اشخاص ہیں جو لوگوں کو جانتے ہیں لیکن لوگ انہیں نہیں جانتے''۔ یہ بات ایسی ہے جس پر ہر شیعہ کو کاربند ہونا چاہیئے کیونکہ طلب شہرت ایسا زہر ہے جو ایمان کو کھا جاتا ہے۔ اِس بات سے ناواقفیت کا ہی نتیجہ ہے کہ لوگ اپنے ہر کام میں شہرت کا پہلو ضرور رکھتے ہیں یہاں تک کہ دین کو بھی حصولِ شہرت کیلئے

استعمال کرتے ہیں حالانکہ شیعہ اور شہرت دو متضاد چیزیں ہیں۔ امیرؑالمومنین اس بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔ ''مومن کے چہرے پر بشاشت اور دل میں غم و اندوہ ہوتا ہے۔ ہمت اس کی بلند ہے لیکن وہ اپنے کو ذلیل وخوار سمجھتا ہے۔ وہ شہرت سے نفرت کرتا ہے''۔ (القطرۃ من بحارج ۳ صفحہ ۴۵۷) ۔اور تجلیاتِ حکمت صفحہ ۴۰۵ پر آپؑ ہی کا ارشاد ہے کہ ''مومن رفعت و بلندی کو ناپسند کرتا ہے اور شہرت کو برا سمجھتا ہے''۔

مومن کی غریب الوطنی کے بارے میں یہاں دو احادیث پیش کی جارہی ہیں جن سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مومن اس دنیا میں کس طرح زندگی گزارتا ہے۔

ا۔تفسیرِ فرات صفحہ ۱۷۴۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''ہمارے محبّ کو لگاتار جلاوطن کیا جائے گا، اذیّت دی جائے گی، اکیلا ہوگا، مارا جائے گا، بھگایا جائے گا۔ جھٹلایا جائے گا۔ وہ غمگین، آنکھ سے آنسو بہانے والا اور کبیدہ خاطر ہوگا اور اسی حالت میں مر جائے گا''۔

۲۔ الخصال صفحہ ۱۸۲۔ امام زین العابدینؑ نے فرمایا۔

''اے زرارہ! ہمارے زمانے کے لوگ چھ قسم کے ہیں۔ شیر، بھیڑیا، لومڑ، کتا، خنزیر اور بکری۔ شیر وہ بادشاہ ہے کہ جسے چاہتا ہے اسے قابو میں کرلیتا ہے۔ خود غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا۔ بھیڑیے تمھارے تاجر ہیں۔ جب چیز خریدتے ہیں تو اس کی برائی

کرتے ہیں اور جب فروخت کرتے ہیں تو اس کی تعریف بیان کرتے ہیں۔ لومڑ وہ ہیں جو دین کے نام سے روٹی کھاتے ہیں اور اس کو شریعت کا نام دیتے ہیں۔ جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا۔ کتے وہ ہیں جو بدزبان ہیں اور کتے کی طرح لوگوں کو زبان سے کاٹتے ہیں اور لوگ ان کے شر کی وجہ سے ان کی عزت کرتے ہیں۔ خنزیر وہ ہیں جو ہیجڑے اور ان سے مشابہ ہیں۔ ان کو بدی کی دعوت دی جائے تو وہ قبول کرتے ہیں۔ بکری سے مراد مومن ہیں جن کے بال نوچے جاتے ہیں، اُن کا گوشت کھایا جاتا ہے اور اُن کی ہڈیاں توڑی جاتی ہیں۔ بھلا شیر، بھیڑیے، لومڑ، کتے اور خنزیر کے درمیان رہ کر بکری کیا کرسکتی ہے؟"۔

تیسری چیز طلبِ ریاست ہے جو شیعوں کو ہلاک کر دینے والی ہے۔ یاد رکھیئے کہ از روئے قرآن حکومت کرنا صرف خلفاء اللہ کا حق ہے اور کسی اور کا حکومت و اقتدار پر قبضہ کرنا اہلبیتؑ کے حق کو غصب کرنا ہے چاہے وہ حکومت اسلام کے نام پر ہی کیوں نہ حاصل کی گئی ہو۔ یہ وہی کرسی ہے جو سقیفہ سے چلی اور آج تک گردش کرتی پھر رہی ہے اور جس کے پاس طاقت ہوتی ہے وہ بڑھ کر اس پر بیٹھ جاتا ہے۔ شیعوں کا اِس چھینا جھپٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا فرض صرف اتنا ہے کہ گھروں میں بیٹھے رہیں اور اپنے امامؑ کے ظہور کا انتظار کرتے رہیں۔ جیسا کہ امیرالمومنینؑ نے فرمایا۔ "علماءِ حق اور ان کے پیروکار باطل حکومتوں کے دَور میں رہ کر خاموشی سے اپنا وقت بسر

کرتے ہیں اور حق کی حکومت کے منتظر رہتے ہیں"۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۵۳۱)۔ بعض جو شیلے حضرات کو یہ بات شاید نا گوار گزرے لیکن انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ وہ اللہ کا گروہ ہیں اور اللہ کا گروہ ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ اور مولا امیرؑ المومنین نے بھی فرمایا ہے کہ "حق پر رہتے ہوئے مغلوب ہونا درحقیقت غالب ہونا ہے"۔ (حکمتِ بوتراب ج ۱ صفحہ ۱۸۳)۔ اس سلسلے میں چند اور احادیث پیش کی جارہی ہیں تا کہ ایک شفاف نظریہ اپنایا جا سکے اور خواہشاتِ نفسانی کو کچل کر اطاعتِ معصومؑ پر ثابت قدم رہا جا سکے۔

۱۔ القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۹۳۔ امیرؑ المومنین نے فرمایا۔

"اپنی جگہ آرام سے رہو، بلاؤں پر صبر کرو، اپنے ہاتھوں اور تلواروں کو اپنی خواہشات میں حرکت نہ دو اور جس چیز کو اللہ نے تمھارے لئے مقدر نہ کیا ہو اس کے وقت آنے سے پہلے اس کی طرف جلدی نہ کرو۔ بے شک ہر چیز کیلئے ایک خاص زمانہ اور مدّت معیّن کی گئی ہے۔

۲۔ القطرۃ من بحار ج ۳ صفحہ ۲۱۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

"میرے بعد بہترین لوگ وہ ہیں جو ہماری حکومت و ولایت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں (نہ کہ خود میدانِ اقتدار میں کود پڑتے ہیں)"۔

۳۔ القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۹۱۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

"اُس زمانے میں دینداری بہت مشکل ہوگی اور جو کوئی اس زمانے میں اپنے دین کو

محفوظ رکھے گا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کانٹے دار شاخ ہاتھ میں لے کر کھینچے اور اس کے کانٹے صاف کرے"۔

۴۔القطرۃ من بحار ج ۲ صفحہ ۲۸۸۔امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا۔

"خوش قسمت ہیں ہمارے شیعہ جو غیبت کے زمانے میں ہماری ولایت کے ساتھ تمسک کریں گے اور ہماری دوستی اور ولایت پر اور اسی طرح ہمارے دشمنوں سے برأت اور بیزاری پر ثابت قدم رہیں گے۔ وہ ہماری امامت کے ساتھ خوش اور ہم ان کے شیعہ ہونے کے ساتھ راضی ہیں۔ پس وہ خوش قسمت ہیں اور واقعتاً خوش قسمت ہیں"۔

۵۔تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۸۹۔

"ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ جو شیعہ حکومت کے اندر شمولیت اختیار کرتے ہیں اور حکومت کیلئے کام کرتے ہیں اور اربابِ اقتدار سے محبت کرتے ہیں اور ان سے دوستی رکھتے ہیں، ان کے متعلق آپؑ کی کیا رائے ہے؟۔ آپؑ نے فرمایا۔"وہ شیعہ نہیں ہیں بلکہ وہ انہی (اربابِ اقتدار) کا حصہ ہیں"۔

۶۔تفسیر نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۱۰۰۔امیر المومنینؑ نے فرمایا۔

"ہر وہ عمل جو اللہ کے منتخب بندوں کے علاوہ کسی اور کے ہاتھوں نافذ ہو تو بندوں کے ذاتی قائم کردہ حدوں، عہود، قوانین، رسوم اور ان کے آئین اور دستور کی کوئی

اہمیت نہیں۔ وہ قابلِ قبول نہیں ہیں، اگر چہ ان پر ایمان کے الفاظ کا اطلاق ہی کیوں نہ ہوتا ہو"۔

یہ ساری بھاگ دوڑ اسی لئے کی جاتی ہے کہ انسان مال و دولت اور عزت و شہرت کا بھوکا ہوتا ہے۔ اگر شیعوں کو اپنی قدر و قیمت کا علم ہو جائے اور یہ علم حدِ یقین تک پہنچ جائے تو یہ تمام چیزیں اس کی نظر میں ہیچ ہو جائیں گی کیونکہ وہ جان لے گا کہ عزت تو ہے ہی شیعوں کیلئے۔ اللہ کے نزدیک شیعوں کے علاوہ کوئی باعزت ہے ہی نہیں۔ رہی شہرت کی بات تو جن کی شہرت آسمانوں میں ہو اور فرشتے جن کے خادم ہوں اُن کو دنیاوی شہرت کی کیا ضرورت ہے۔ مال و دولت کی بات کریں تو شیعوں سے بڑا سرمایہ دار تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا جیسا کہ امیرؑ المومنین نے فرمایا ہے کہ "ہمارے شیعوں کو خوش ہونا چاہیئے۔ اللہ نے انہیں ہماری محبت کی جو دولت عطا کی ہے وہ اُس سونے چاندی سے کہیں بہتر ہے جو ہمارے دشمنوں کو عطا ہوئی ہے"۔ (تفسیرِ نورالثقلین ج ۴ صفحہ ۲۴۱)۔ شیعوں کو اگر اُس پہلی نعمت کا صحیح اندازہ ہو جائے جو اللہ نے انہیں عطا فرمائی ہے، یعنی طہارتِ ولادت، تو ساری دنیا کی قیمت ان کی نظر میں مچھر کے پر کے برابر بھی نہ رہے۔ مولا امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "حضرتِ نوحؑ نے اپنی کشتی میں کتّے اور خنزیر کو بٹھایا تھا لیکن آپ نے کسی حرامزادے کو کشتی پر سوار نہیں کیا تھا"۔ (تفسیرِ نورالثقلین ج ۴ صفحہ ۳۲۰)۔ پھر کیا

خوش نصیب ہوگا وہ شخص جو کشتیِ نجات پر سوار ہو؟۔

فضیلتِ شیعہ

ہم نے سطورِ بالا میں شیعوں کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان کا مقصد یہ تھا کہ ہر شخص اپنا جائزہ خود لے اور دیکھے کہ لفظِ شیعہ اس پر صادق آتا ہے یا نہیں۔ اور جب اسے اپنے شیعہ ہونے کا یقین ہو جائے گا تو وہ خود محسوس کرے گا کہ اس دنیا میں جن جن مصائب اور آزمائشوں سے وہ گزرتا ہے وہ اُن مراتب و درجات کے مقابلے میں ہیچ ہیں جو اللہ کے نزدیک اسے حاصل ہیں۔ اس مقام پر ہمارا ارادہ تھا کہ منازلِ شیعہ کے بارے میں تفصیل سے لکھیں لیکن خرابیِ صحت ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے بیان کو طول دیں۔ اس لئے ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا لکھنے پر اکتفاء کریں گے جتنا تفہیمِ مطلب کیلئے ضروری ہے اور اپنے بیان کو اُن احادیث تک محدود رکھیں گے جو فضائلِ شیعہ میں وارد ہوئی ہیں اور ابتداء ایک ایسی حدیث سے کریں گے جس سے اکثر لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، خاص طور پر ان لوگوں کی جو نجاتِ اُخروی کیلئے اعمالِ ظاہری کو ہی معیار سمجھتے ہیں۔

حدیثِ طینت

علل الشرائع صفحہ ۴۹۲۔ "ابی اسحاق لیثی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے امام محمد باقرؑ کی

خدمت میں عرض کیا کہ اے فرزندِ رسولؐ یہ بتائیں کہ ایک صاحب بصیرت مومن جبکہ اس کی معرفت حد درجہ تک پہنچ جائے اور کامل ہوجائے تو کیا وہ زنا کرتا ہے؟ فرمایا۔ ''خدا کی قسم ہرگز نہیں''۔ میں نے عرض کیا۔ ''کیا وہ لواطہ کرتا ہے''۔ فرمایا۔ ''خدا کی قسم ہرگز نہیں''۔

میں نے عرض کیا۔ ''پھر کیا وہ چوری کرتا ہے؟''۔ فرمایا۔ ''نہیں''۔ میں نے عرض کیا۔ ''تو پھر کیا وہ شراب نوشی کرتا ہے؟''۔ فرمایا۔ ''نہیں''۔ میں نے عرض کیا۔ ''پھر کیا ان گناہانِ کبیرہ میں سے کوئی گناہِ کبیرہ یا ان فواحش میں سے کسی فحش کام کا مرتکب نہیں ہوگا؟''۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''نہیں'' میں نے عرض کیا۔ ''اچھا تو پھر کیا وہ کوئی گناہ کرتا ہے؟''۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''ہاں! مگر وہ مومن گناہ گار اور لائق ملامت ہوا''۔ میں نے عرض کیا۔ ''ملامت شدہ کے کیا معنی؟''۔ فرمایا۔ ''جس گناہ پر اس کی سرزنش اور تنبیہ کردی جائے گی اور اس پر کوئی الزام یا کوئی آنچ نہیں آئے گی''۔ میں نے عرض کیا۔ ''سبحان اللہ! یہ تو عجیب بات ہے کہ وہ زنا نہیں کرتا، لواطہ نہیں کرتا، چوری نہیں کرتا، شراب نہیں پیتا، کوئی گناہِ کبیرہ نہیں کرتا، کسی فحش کام کا مرتکب نہیں ہوگا''۔ فرمایا۔ ''اللہ کے کام سے تعجب نہ کرو۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اور جو کرتا ہے اس پر اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں بلکہ بندوں سے باز پرس کی جائے گی''۔ پھر فرمایا۔ ''اے ابراہیم! تمھیں کس بات پر تعجب ہے؟۔ تم اور پوچھو اور پوچھنے سے باز نہ آؤ۔ اس میں شرم نہ کرو، اس لئے کہ ایسے علوم کی تعلیم کسی متکبر یا تعلیم حاصل کرنے سے شرمانے

والے کو نہیں دی جاتی "۔ میں نے عرض کیا۔ "فرزندِ رسولؐ! میں آپ کے شیعوں میں ایسے لوگوں کو پاتا ہوں جو شراب پیتے ہیں، رہزنی کرتے ہیں، ڈاکہ مارتے ہیں، لواطہ کرتے ہیں، سود کھاتے ہیں اور بہت سے فواحش کا ارتکاب کرتے ہیں۔ نماز، روزہ اور زکوٰۃ کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اعزہ اور اقرباء سے قطعِ رحمی کرتے ہیں۔ گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ تو یہ کیا ہے اور ایسا کیوں ہے؟"۔ آپؑ نے فرمایا۔ "اے ابراہیم! کیا اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی تمھارے دل کو کھٹکتی ہے؟"۔ میں نے عرض کیا۔ "جی ہاں فرزندِ رسولؐ! میں آپؑ کے دشمنوں اور ناصبیوں میں ایسے لوگ بھی پاتا ہوں جو نماز بھی کثرت سے پڑھتے ہیں، روزے بھی زیادہ رکھتے ہیں، زکوٰۃ بھی نکالتے ہیں، پے در پے حج وعمرہ بھی بجالاتے ہیں، جہاد کے بھی خواہشمند رہتے ہیں، لوگوں کے ساتھ نیکی اور رشتہ داروں کے ساتھ صلۂ رحمی بھی کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں کے حقوق بھی ادا کرتے ہیں اور اپنے مال سے ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔ شراب خوری، زنا اور لواطہ اور دیگر فواحش سے اجتناب بھی کرتے ہیں۔ تو پھر یہ سب کیا ہے اور کیسا ہے؟۔ فرزندِ رسولؐ! میرے لئے اس کو وضاحت سے بیان فرمائیں اور اس پر کوئی دلیل وبرہان ہے تو وہ بھی بتائیں۔ اس لئے کہ خدا کی قسم میں اکثر اسی فکر میں رہتا ہوں۔ راتوں کو نیند نہیں آتی۔ میں اس کو سوچتے سوچتے تنگ آ گیا ہوں"۔ یہ سن کر امامؑ مسکرائے اور فرمایا۔ "جو کچھ تم نے پوچھا ہے اس کا شافی جواب لے لو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے علم و اسرار کے خزانوں میں سے ایک پوشیدہ علم ہے۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ

ان دونوں گروہوں کا اعتقادتم کیسا پاتے ہو؟''۔ میں نے عرض کیا۔''فرزندِ رسولؐ! میں آپ لوگوں سے محبت کرنے والوں کو اور آپ لوگوں کے شیعوں کو ایسا پاتا ہوں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی ساری دنیا کا سونا اور چاندی دیا جائے اور کہا جائے کہ وہ آپ لوگوں کی دوستی اور محبت ترک کردے، آپ کے اغیار کی محبت اور دوستی اختیار کرے، تو وہ اس سے باز نہیں آئے گا، خواہ اس کی ناک پر تلوار ماری جائے اور اسے قتل کیا جائے، وہ آپ لوگوں کی محبت اور ولایت سے نہیں بھاگے گا۔ اور ناصبیوں کو ہم ایسا پاتے ہیں کہ باوجودیکہ وہ بڑے روزے اور نماز والے ہیں، اگر ان کو مشرق و مغرب کے درمیان کا تمام سونا اور چاندی دیا جائے اور کہا جائے کہ تم ان طاغوتوں کی محبت اور موالات کو ترک کرکے آپ لوگوں کی محبت اختیار کرو تو وہ ہرگز اس کیلئے تیار نہ ہوں گے اور اپنے اعتقاد پر اڑے رہیں گے، خواہ ان کی ناک پر تلوار ماری جائے اور انہیں قتل کیا جائے، وہ اپنے اعتقاد سے نہیں پھریں گے۔ وہ ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک آپ حضرات کی منقبت اور آپ لوگوں کے فضائل کو سنتا ہے تو منہ بنالیتا ہے اور اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوجاتا ہے اور اس کے چہرے سے ناگواری ظاہر ہوتی ہے، محض اس لئے کہ وہ آپ لوگوں سے بغض رکھتا ہے اور اپنے طاغوتوں سے محبت کرتا ہے''۔ یہ سن کر امامؑ پھر مسکرائے اور فرمایا۔''اے ابراہیم! اسی جگہ تو وہ ہلاک ہوگئے۔ عمل کرنے والے ناصبی دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور انہیں ایک کھولتے ہوئے چشمے کا پانی پلایا جائے گا۔ (سورۂ غاشیہ ۳،۴،۵)۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ

کا ارشاد ہے کہ ان لوگوں نے دنیا میں جو کچھ نیک کام کئے ہیں ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہم ان کو گویا اُڑتی ہوئی خاک بنا کر برباد کر دیں گے۔ (فرقان ۲۳)۔ وائے ہو تم پر اے ابراہیم۔ تمھیں نہیں معلوم اس کا سبب اور اس کا قصہ کیا ہے اور لوگوں سے یہ بات پوشیدہ کیوں رکھی گئی ہے''۔ میں نے عرض کیا۔ ''فرزندِ رسولؐ! آپ ہی اس کی تشریح بہ دلائل بیان بیان فرمائیں''۔ آپؑ نے فرمایا۔ ''اے ابراہیم! اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے عالم اور قدیم ہے اور اس نے اشیاء کو پیدا کیا مگر کسی شے سے پیدا نہیں کیا۔ اور جس کا یہ خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو کسی شے سے پیدا کیا وہ کافر ہے۔ اس لئے کہ وہ شے جس سے یہ تمام اشیاء خلق ہوئیں وہ قدیم ٹھہرے گی اور اللہ کی ازلیت اور حقیقت میں شریک سمجھی جائے گی اور وہ شے بھی ازلی ہوگی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو بلا کسی شے کے پیدا کیا اور جن چیزوں کو اللہ نے بلا کسی شے کے پیدا کیا ان میں سے ایک پاک اور طیّب زمین پیدا کی اور اس میں شیریں پانی کے چشمے نکالے اور اس پر ہم اہلبیتؑ کی ولایت اور محبت پیش کی اور اس نے اس کو قبول کیا۔ اُس زمین پر پانی سات دن تک پھیلا رہا۔ اس کے بعد وہ پانی سمٹ کر ایک جگہ تھم گیا تو اس میں سے کچھ صاف و شفاف مٹی لی اور اس کو ائمہ طاہرینؑ کی طینت کیلئے مخصوص کیا۔ اس کے بعد اس کے نیچے سے تلچھٹ غیر شفاف اور ثقیل مٹی لی اور اس سے ہمارے شیعوں کو پیدا کیا اور اگر تم لوگوں کی طینت اسی حالت پر چھوڑ دیتا جیسا کہ ہم لوگوں کی طینت کو اس نے چھوڑ دیا تھا تو ہم لوگ اور تم لوگ ایک ہی جیسے ہوتے''۔ میں نے عرض کیا۔

"فرزندِ رسولؐ! پھر اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کی طینت کے ساتھ کیا کیا؟"۔ آپؑ نے فرمایا۔ "اے ابراہیم! ابھی بتاتا ہوں۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک گندی اور بدبودار زمین خلق کی اور اس میں کھارا، نمکین اور سڑا ہوا پانی ڈالا اور اُس پر ہم اہلبیتؑ کی ولایت کو پیش کیا۔ اُس نے قبول نہیں کی تو وہ پانی اس پر سات دن تک بہتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ زمین کُل کی کُل اس میں ڈوب گئی۔ پھر وہ سارا پانی سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو گیا اور اس میں سے کچھ مٹی لی اور اس سے دنیا کے سارے سرکش اور ان کے سردار پیدا کئے۔ پھر تم لوگوں کی اُس ثقیل مٹی سے اِس کو مخلوط کر دیا اور اگر اُن لوگوں کی طینت کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا اور تم لوگوں کی طینت سے اس کو نہ ملاتا تو وہ لوگ نہ کلمۂ شہادتین پڑھتے نہ نماز پڑھتے نہ روزہ رکھتے نہ زکوٰۃ دیتے نہ حج کرتے نہ لوگوں کی امانتیں ادا کرتے۔ ان لوگوں کی صورت تم لوگوں کی صورت کے مشابہ ہوتی ہے اور ایک مومن کے لئے یہ بھی بہت گراں ہے کہ وہ اپنے دشمن کی صورت کو اپنی صورت کے مشابہ دیکھے"۔ میں نے عرض کیا۔ "فرزندِ رسولؐ! پھر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں طینتوں کو کیا کیا؟"۔ آپؑ نے فرمایا۔ "ان دونوں کو ملایا اور پہلے اور دوسرے پانی کو ڈال کر خوب گوندھا۔ اس طرح ملایا جس طرح چمڑے کی مالش کی جاتی ہے۔ پھر اس میں سے یک مٹھی لی اور کہا یہ جنت میں جائیں گے اور ہمیں پروانہیں۔ اور دوسری مٹھی اٹھائی اور کہا یہ جہنم میں جائیں گے اور ہمیں پروانہیں۔ پھر ان دونوں کو مخلوط کیا تو اس طرح مومن کی طینت کافر کی طینت سے مس ہوئی اور کافر کی طینت مومن کی طینت

سے مس ہوئی اور اب جو تم ہمارے شیعوں میں زنا، لواطہ، ترک نماز و ترک صوم و ترک حج و ترک جہاد اور خیانت یا گناہانِ کبیرہ دیکھتے ہو تو ناصبیوں کی طینت سے مس ہونے کا اثر ہے اور وہ عنصر ہے جو ان میں مل گیا ہے اس لئے کہ ناصبیت کی طینت و عنصر گناہ کا ارتکاب اور آلودۂ فواحش و کبائر ہوتا ہے۔ اور تم جو ناصبیوں میں یہ پابندیِ نماز و روزہ و زکوٰۃ و حج و نیکی کے اقسام دیکھتے ہو وہ ان میں مومن کی طینت و عنصر کیوجہ سے ہے جو ان میں مخلوط ہوگئی ہے اس لئے کہ مومن کی طینت کی خاصیت نیکی کرنا خیرو خیرات کرنا گناہوں سے اجتناب ہے۔ پس جب یہ کل کے کل اعمال اللہ کے سامنے پیش ہونگے تو اللہ تعالیٰ کہے گا کہ میں عادل ہوں جور نہیں کرتا منصف ہوں ظلم نہیں کرتا، میں حکم ہوں نا انصافی اور کسی کی جانب داری نہیں کروں گا کسی پر زیادتی نہیں کرونگا۔ ان تمام برے اعمال کو جو مومن سے سرزد ہوئے ہیں ناصبیوں کی طینت سے ملحق کردو اور جتنے نیک اعمال ہیں جو ناصبیوں نے کئے ہیں وہ سب طینتِ مومن سے ملحق کردو اور ان سب کو انکی طرف پلٹا دو اس لئے کہ میں اللہ ہوں نہیں ہے کوئی اللہ میرے سوا میں ہر پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والا ہوں میں اپنے بندوں کے دلوں کا بھید جاننے والا ہوں اور میں ظلم و زیادتی نہیں کرتا اور خلقت سے پہلے میں نے جس کو پہچان لیا ہے اس پر الزام رکھتا ہوں۔

اسکے بعد حضرت امام محمدؑ باقرؑ نے فرمایا! اے ابراہیم اس آیت کو پڑھو۔ میں نے عرض کیا فرزندِ رسولؐ کس آیت کو؟ آپؑ نے فرمایا قرآن کی اس آیت کو "حضرت یوسفؑ

نے کہا معاذ اللہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ ہم نے جسکے پاس اپنی چیز پائی ہے اسے چھوڑ کر دوسرے کو پکڑ لیں اگر ایسا کریں گے تو ظالم قرار پائیں گے''۔ (سورۂ یوسف آیت نمبر ۷۹)۔ اسکا ظاہری مطلب تو وہی ہے جو تم سمجھتے ہو مگر خدا کی قسم اسکا باطنی مطلب بعینہ یہی ہے۔ اے ابراہیم قرآن کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ایک محکم ہوتا ہے اور ایک متشابہ۔ ایک ناسخ ہوتا ہے اور ایک منسوخ۔ پھر فرمایا اچھا اے ابراہیم ایک بات بتاؤ جب آفتاب طالع ہوتا ہے اور اسکی شعاعیں مساوی دنیا میں پھیلتی ہیں تو یہ شعاعیں کیا آفتاب کے قرص سے جدا ہوتی ہیں؟ میں نے عرض کیا طلوع ہوتے وقت تو جدا ہوتی ہیں آپؑ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ جب آفتاب غروب ہونے لگتا ہے تو وہ شعاع قرصِ آفتاب کیطرف سمٹتی ہیں تا کہ اسکی طرف پلٹ جائیں۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپؑ نے فرمایا بس اسی طرح ہر شے اپنی نسخ اپنے جواہر اور اپنی اصل کیطرف پلٹتی ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ناصب کی نسخ وطینت مع اسکے ثقل وبوجھ کے مومن سے نکال لے گا اور وہ ناصب سے ملحق کردیگا اور مومن کی نسخ و طینت سے اسکے تمام حسنات وابوابِ خیر واجتہاد نکال کر مومن سے ملحق کردیگا۔ کیا تم اسکو ظلم وزیادتی سمجھتے ہو، میں نے عرض کیا نہیں اے فرزندِ رسولؐ۔ آپؑ نے فرمایا۔ خدا کی قسم اسی کا نام قضاء وفیصلہ اور حکمِ قطعی اور بین بین عدل ہے اللہ جو کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جائے گا۔ بندوں سے پوچھا جائے گا۔ اے ابراہیم یہی حق ہے۔ تمھارے رب کی طرف سے۔ تم شک کرنے والوں میں نہ ہوجانا یہ ملکوت کا حکم ہے۔ میں نے

عرض کیا فرزندِ رسولؐ حکمِ ملکوت کیا ہے؟ فرمایا! خدا کا حکم اسکے انبیاءؑ کا حکم اور حضرت خضرؑ وحضرتِ موسیٰؑ کا قصہ یاد کرو جب انہوں نے انکی صحبت اختیار کی تو حضرتِ خضرؑ نے کہا تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کرسکو گے اور اس پر کسطرح صبر کرسکتے ہو جو تمھارے احاطہ علم میں نہ ہو۔ اے ابراہیم اسے سمجھو اور عقل میں لاؤ کہ حضرت موسیٰؑ نے خضرؑ پر اعتراض کیا اور انکے افعال کو درست نہ سمجھا تو حضرت خضرؑ نے ان سے کہا اے موسیٰؑ میں نے یہ سب کچھ اپنی طرف سے نہیں کیا ہے بلکہ حکمِ خدا سے کیا ہے۔ اے ابراہیم تم پروائے ہو قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے جو تواتر کے ساتھ اللہ کے احکام ہم لوگوں تک پہنچاتا ہے جو اس میں سے صرف ایک کو رد کردے گا اور وہ کافر و مشرک ہو جائے گا اور اللہ کے فرمان کو رد کردے گا۔

لیثی کا بیان ہے کہ میں چالیس سال سے ان آیات کو پڑھ رہا ہوں لیکن آج کے سوا کبھی نہ سمجھا تھا۔ میں نے عرض کیا فرزندِ رسولؐ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپؐ کے دشمنوں کے اعمالِ نیک آپؐ کے شیعوں کو عطا کردئے جائیں گے اور آپؐ کے محبین کے گناہ آپؐ کے دشمنوں کے ذمہ کردیئے جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں ہاں اس اللہ کی قسم جسکے سوا کوئی اللہ نہیں وہ دانوں کو شگافتہ کرنے والا ہے اور ہر ذی روح کو پالنے والا ہے اور زمین وآسمان کا خالق ہے میں نے تمھیں حق کی ایسی بات بتائی ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں بتایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا ہے اور نہ اللہ بندوں پر ظلم کرتا ہے۔ جو باتیں میں نے تمھیں بتائی ہیں وہ سب قرآن میں موجود

ہیں۔میں نے عرض کیا کہ بعینہ یہی قرآن میں موجود ہیں؟ آپؑ نے فرمایاہاں یہ بات قرآن میں تیس سے زیادہ مقامات پر مذکور ہے۔کیاتم چاہتے ہو کہ میں تمھیں وہ آیات پڑھ کر سناؤں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں اے فرزندِ رسولؐ۔آپؑ نے فرمایا اچھا سنو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "اورلوگوں نے جو کافر ہو گئے ان لوگوں سے کہا جو ایمان لائے کہ ہمارے راستے کی پیروی کرواور ہم ضرور تمھاری خطاؤں کو اپنے ذمہ لے لیں گے حالانکہ وہ انکی خطاؤں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں۔یقیناً وہ جھوٹے ہیں اور اپنے بوجھ تو ضرور اٹھائیں گے اور اپنے بوجھ کے ساتھ کئی اور بوجھ بھی"۔(سورۃ عنکبوت آیت نمبر ۱۳۔۱۲)۔اے ابراہیم مزید کوئی اور آیت پڑھوں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں اے فرززندِ رسولؐ۔تو آپؑ نے یہ آیت پڑھی "تا کہ قیامت کے دن وہ اپنے گناہوں کے پورے بوجھ اور جن لوگوں کو انہوں نے بے جا گمراہ کیا انکے گناہوں کے بوجھ بھی انہیں اٹھانے پڑیں گے ذرا دیکھو یہ لوگ کیسا برابوجھ اپنے اوپر لادے چلے جارہے ہیں"۔(سورۃ نحل آیت نمبر ۲۵)۔فرمایا کیاتم چاہتے ہو کہ کوئی مزید آیت بتاؤں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں اے فرزندِ رسولؐ۔تو آپؑ نے یہ آیت پڑھی۔"البتہ ان لوگوں کے گناہوں کو اللہ نیکیوں سے بدل دے گا اور خدا تو بڑا بخشنے والا مہربان ہے"۔(سورۃ فرقان۔آیت نمبر ۷۰) تو اللہ تعالیٰ ہمارے شیعوں کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے گا اور ہمارے دشمنوں کی نیکیوں کو گناہوں سے بدل دے گا اور میں خدائے ذوالجلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہی اسکا عدل اور انصاف ہے اسکے فیصلے کو

کوئی رد نہیں کرسکتا اور اس کے حکم کو کوئی پسِ پشت نہیں ڈال سکتا وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور کیا میں تم سے دونوں طینتوں کے باہم مخلوط کرنے کی بات قرآن سے بیان کردوں؟ میں نے عرض کی جی ہاں اے فرزندِ رسولؐ۔ آپؑ نے فرمایا اچھا اے ابراہیم یہ آیت پڑھو "جو گناہانِ صغیرہ کے سوا گناہانِ کبیرہ سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے رہتے ہیں بیشک تمھارا پروردگار بڑی بخشش والا ہے اور وہی تم کو خوب جانتا ہے اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا"۔ (سورۃ النجم آیت نمبر۳۲) یعنی طیب مٹی اور سڑی اور بدبودار مٹی سے۔ "تو تم لوگ تکبر سے اپنے نفس کی پاکیزدگی نہ جتایا کرو جو پرہیز گار ہے اسکو وہ خوب جانتا ہے"۔ سورۃ النجم آیت نمبر۳۲۔ اس آیت کے آخری ٹکڑے میں وہ کہتا ہے کہ کوئی تم میں سے کثرتِ نماز وروزہ وزکوٰۃ وعبادت پر فخر نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ تم لوگوں میں سے کون پرہیز گار ہے اس لئے کہ یہ مخلوط ہوجانے کیوجہ سے ہے"۔ کیا تمھیں کچھ اور سناؤں اے ابراہیم؟ میں نے عرض کیا جی ہاں اے فرزندِ رسولؐ۔ تو آپؑ نے یہ آیت سنائی۔ "جسطرح اس نے تمھیں شروع شروع پیدا کیا اسی طرح دوبارہ زندہ کیئے جاؤ گے اسی نے ایک فریق کی ہدایت کی اور ایک فریق پر گمراہی سوار ہوگئی ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو سرپرست بنالیا"۔ (سورۃ اعراف آیت ۳۰-۲۹) یعنی ائمہِ حق کو چھوڑ کر ائمہِ ظلم و جور کو اپنا سرپرست بنایا۔ وہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ راہِ راست پر ہیں۔ اے ابواسحاق میری اس حدیث کو یاد کرلو اس لئے کہ یہ ہم لوگوں کی بہت روشن احادیث میں سے ہے یہ ہم

لوگوں کے سر بستہ اسرار اور پوشیدہ خزانوں میں سے ہے"۔

اس حدیثِ مبارکہ سے تمام اشتباہات ختم ہوجاتے ہیں اور کوئی ابہام باقی نہیں رہتا اور اس کی مزید تائید امام جعفر صادقؑ کے اس فرمان سے ہوتی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں۔ "ہمارے چاہنے والے آخر کار اسی طینت کی طرف پلٹائے جائیں گے جس سے اُن کی تخلیق ہوئی تھی"۔ (تفسیر نور الثقلین ج ۳ صفحہ ۱۶۱)۔ ہمیں یقین ہے کہ فضائلِ شیعہ کے بارے میں جو احادیث ہم بیان کریں گے ان سے آپ انشاءاللہ کسی الجھن کا شکار نہیں ہوں گے لیکن یہ بہر حال ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ان فضائل کو بیان کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ لوگ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوجائیں بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم ان معیارات پر پورا اترنے کیلئے دن رات کوشش کریں جو شیعہ ہونے کا دعویٰ کرنے کیلئے لازمی ہیں اور جو بھی یہ کوشش کرے گا وہ یقیناً خود کو اس سانچے میں ڈھالنے کی بھی کوشش کرے جو اس کے محبوب کو پسند ہے۔

غیر مغضوب: یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ شیعہ پر ایک لمحے کیلئے بھی غضبِ خدا نازل نہیں ہوتا کیونکہ وہ محبوبِ خدا ہے۔ سورۂ فاتحہ کی آیت **"صراط الّذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضآلّین"** کے بارے میں حضرتِ ختمی مرتبتؐ فرماتے ہیں۔ "اس سے مراد علیؑ کے شیعہ ہیں کہ جن پر اللہ نے علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ولایت کے ذریعے نعمتیں نازل کی ہیں اور اللہ ان پر کبھی غضبناک نہیں ہوا اور نہ وہ کبھی گمراہ ہوئے"۔ (معانی الاخبار صفحہ ۳۷)۔

صالح: اللہ نے قرآنِ مجید میں عملِ صالح کا حکم دیا ہے اور جو لوگ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں انہیں اس نے صالحین کے نام سے یاد کیا ہے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ عملِ صالح کیا چیز ہے اور صالحین کون ہیں۔

۱۔تفسیرِ نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۴۲۱۔

امام محمد باقرؑ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ "مولاؑ! میرے پاس زیادہ نیکیاں موجود نہیں ہیں"۔ آپؑ نے فرمایا۔ "اللہ پر جھوٹ نہ تراش! اللہ نے تجھے صالح کے نام سے یاد کیا ہے اور صالحین سے وہ لوگ مراد ہیں جو امیرؑ المومنین اور ہم پر ایمان لائے ہیں"۔

۲۔تفسیرِ فرات صفحہ ۶۷۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ "ہم ایمان باللہ کی جڑ ہیں۔ خواہ فرشتے ہوں یا اور تمام مخلوق ہوں، ہم میں سے ایک نگران ہوتا ہے مخلوقِ خدا پر، جس سے صالحین کے اعمال ٹھیک ہوتے ہیں اور صالحین سے مراد علیؑ کے شیعہ ہیں"۔

۳۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "ہمارے ماننے والوں پر ابلیس کا کوئی تسلّط نہیں۔ ابلیس اُن کی نظر میں ایمان کو قابلِ نفرت اور کفر کو لائقِ محبت نہیں بنا سکا"۔ (تفسیر نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۵۳۱)۔

۴۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ "یا علیؑ! تیرے شیعوں کا ذکر ان کی پیدائش سے پہلے ہر

بھلائی سے مذکور ہے"۔ (تفسیرِ فرات صفحہ ۱۷۸)

عزّت:۔

۱۔ تفسیرِ نور الثقلین ج ۵ صفحہ ۳۴۳ پر امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ "مومن کعبے سے بھی زیادہ محترم ہے"۔ اسی صفحے پر رسولؐ اللہ فرماتے ہیں۔ "مومن اللہ کی نظر میں ملکِ مقرب سے بھی زیادہ صاحبِ عزت ہے"۔

۲۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ "مومن کی فراست سے بچو کیونکہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ (تفسیرِ نور الثقلین ج ۴ صفحہ ۶۵۰)

مغفرت: رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا۔ "**من مات علىٰ حبّ آلِ محمدؐ مات مغفورا**" ۔ یعنی جو محبتِ آلِ محمدؐ پر مر گیا وہ بخشا ہوا مرا۔ مغفرت مخصوص ہے علیؑ کے شیعوں سے کیونکہ ان کے پاس ایک ایسی نیکی ہے جو سارے گناہوں کو کھا جاتی ہے۔

۱۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "کتابِ خدا میں اس کے اوراق پر تحریر موجود تھی مخلوق کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے۔ پھر خدا نے اس کو اپنے ساتھ عرش پر رکھا۔ اُس میں یہ بات تحریر تھی۔ "اے آلِ محمدؐ کے شیعو! میں تمھیں مانگنے سے پہلے عطا کروں گا، مغفرت طلب کرنے سے پہلے بخش دوں گا، ولایتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ لے کر جو بھی میرے پاس آئے گا میں اپنی رحمت سے اس کو جنت میں ساکن کر دوں گا"۔ (تفسیرِ فرات

صفحہ۲۲۲)۔

۲۔معانی الاخبار صفحہ ۴۰۰۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

''یاعلیؑ! بے شک اللہ نے تمھارے شیعوں پر گناہوں کو مجھ سے اٹھوایا اور پھر میرے حق میں ان گناہوں کی مغفرت فرمادی۔اسی کے مطابق اللہ کا قول ہے۔''تاکہ خدا آپؐ کے اگلے پچھلے تمام گناہوں کی مغفرت کردے''۔

۳۔رسولؐ اللہ نے فرمایا۔''دنیا سے رخصت ہوتے وقت اگر کسی مومن کے ذمے تمام اہلِ زمین کے گناہ بھی ہوئے تو موت اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گی۔البتہ خدا یہ مغفرت و بخشش علیؑ کے محبوں اور شیعوں کو عطا کرے گا''۔(تفسیرِ نورالثقلین ج۲ صفحہ۳۸۲)۔

۴۔فرقان ۷۰۔''اللہ ان کے گناہوں کو نیکیوں میں تبدیل کردے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔اس کی تفسیر میں امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ''یہ آیت اہلبیتؑ کے گناہ گار شیعوں کے ساتھ مخصوص ہے''۔(القطرۃ من بحار ج۲ صفحہ۴۴)۔

۵۔تفسیرِ نورالثقلین ج۱ صفحہ۴۹۲۔امام جعفرصادقؑ نے فرمایا۔

''ہمارے نمازی شیعہ کی وجہ سے اللہ ہمارے بے نمازی شیعوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ہمارے زکوٰۃ کے پابند شیعوں کی وجہ سے تارکینِ زکوٰۃ شیعوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور حج کرنے والے ہمارے شیعوں کی وجہ سے حج نہ کرنے والے شیعوں کا تحفظ کرتا ہے۔ اگر سارے شیعہ ان امور کو ترک کردیتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے''۔

۶۔تفسیر نور الثقلین ج ۴صفحہ ۱۴۶۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔

''ہمارے شیعوں پر گناہوں اور خطاؤں کی مہر ثبت نہیں کی جاتی۔ وہ اللہ کے چُنے ہوئے لوگ ہیں جنہیں اس نے اپنے دین کی خدمت کیلئے منتخب کیا ہے''۔

۷۔القطرۃ من بحار ج ۲صفحہ ۶۶،۷۷۔

امام جعفر صادقؑ نے اپنے شیعوں سے فرمایا۔ ''تمھارے گھر تمھارے لئے جنت ہیں، تمھاری قبریں تمھارے لئے جنت ہیں، تمھیں جنت کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے۔اللہ تعالٰی ہمارے شیعوں کو ان کے گناہوں اور عیوب کے ساتھ قیامت کے دن محشور کرے گا درانحالیکہ ان کے چہرے روشن اور تر و تازہ ہوں گے،ان کی برائیاں پوشیدہ ہوں گی اور وہ ہر طرح کے خوف سے محفوظ ہوں گے۔ان کیلئے دستر خوان بچھایا جائے گا اور وہ کھانا کھانے میں مشغول ہوں گے جبکہ دوسرے لوگ حساب و کتاب میں گرفتار ہوں گے اور ان سے ان کے اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا''۔

۸۔القطرۃ من بحار ج ۲صفحہ ۱۲۸۔

''امام رضاؑ سے ایک منافق نے عرض کیا کہ آپؑ کے شیعوں میں سے کچھ لوگ راستے میں شراب پیتے ہیں۔تو آپؑ نے فرمایا۔ ''الحمد ہے اُس اللہ کیلئے جس نے انہیں راستے پر قرار دیا ہے اور انہیں انحراف و گمراہی میں مبتلا نہیں کیا۔ اگر ہمارے شیعوں سے ایسا کام سرزد ہو بھی جائے تو ان کا مہربان خدا ہے۔اور لطف و احسان کرنے والا نبیؐ ہے اور حوضِ کوثر پر اختیار رکھنے والا امامؑ ہے۔یہ ایسے سردار اور آقا ہیں جو شفاعت

کیلئے کھڑے ہیں، جو اسے پکڑ لیں گے اور بچا لیں گے۔ جبکہ تُو (یعنی وہ بات کرنے والا منافق) اپنی روح کو برہوت میں عذاب اور آگ میں گرفتار پائے گا"۔

قصیدہ

اس بات سے تو آپ واقف ہیں کہ محبت ہمیشہ دو طرفہ ہوا کرتی ہے۔ جو محبوب ہوتا ہے وہ محبّ بھی ہوتا ہے اور جو محبّ ہوتا ہے وہ محبوب بھی ہوتا ہے۔ ایک بار ہمارے دل میں یہ خیال گزرا کہ ہم صبح و شام اپنے محبوب کی شان میں قصیدے پڑھتے ہیں اور اس بات پر ہماری محبت ہمیں مجبور کرتی ہے۔ ہمارا محبوب بھی یقیناً ہم سے محبت کرتا ہے، تو کیا اُس نے کبھی ہمارے لئے کوئی قصیدہ پڑھا ہے؟۔ یہ محض ایک خیال تھا جو آیا اور گزر گیا لیکن ایک روز اچانک ایک حدیث ہماری نظر سے گزری اور ہمارا گوہرِ مراد ہمیں مل گیا۔ اگر یہ حدیث ہمیں نہ ملتی تو ہماری یہ کتاب ادھوری رہ جاتی۔ اس حدیث کو پڑھیئے اور اللہ کا شکر ادا کیجئے اور ہمیشہ اپنی محبتوں اور دعاؤں میں ہمیں شامل رکھیئے۔

تفسیرِ فرات صفحہ ۳۸۹۔

امام جعفر صادقؑ اپنے شیعوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "میں تمھاری خوشبو اور ارواح کو دوست رکھتا ہوں۔ تم آلِ محمدؐ کے شیعہ ہو، تم اللہ کی شرط ہو، تم اللہ کے انصار ہو تم پاک ہو اور تمھاری عورتیں پاک ہیں۔ ہر مومنہ حُور ہے اور ہر مومن صدیق ہے۔ ہر چیز کا شرف ہوتا ہے، دین کا شرف شیعہ ہیں۔ ہر

چیز کی ایک مضبوط رسّی ہوتی ہے، دین کی مضبوط رسّی شیعہ ہیں۔ ہر چیز کا ایک امام ہوتا ہے اور زمین کا امام زمین کا وہ ٹکڑا ہے جس پر شیعہ آباد ہوں۔ ہر چیز کا سردار ہوتا ہے اور مجلس کا سردار مجلسِ شیعہ ہے۔ اگر تم دنیا میں نہ ہوتے تو تمھارے مخالف ذرّہ برابر بھی دنیا کی پاک چیزوں سے فائدہ نہ اٹھاتے۔ آخرت میں انہیں کچھ بھی نہ ملے گا۔ خدا کی قسم اگر تمھارے مصیبت میں پڑنے کا خوف نہ ہوتا اور تمھارے دشمن تمھارا مذاق نہ اُڑاتے تو تم پر فرشتوں کے گروہ سلام کرتے۔ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو جنت نہ سجائی جاتی۔ خدا کی قسم اگر تم لوگ نہ ہوتے تو حُوریں پیدا نہ کی جاتیں۔ خدا کی قسم اگر تم نہ ہوتے تو آسمان سے پانی کی ایک بوند نہ برستی اور زمین سے ایک دانہ نہ اُگتا"۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

یہ کتاب ''کشف المودۃ'' آج بتاریخ ۱۰ دسمبر ۲۰۰۷ء مطابق ۲۹ ذیقعد ۱۴۲۸ھ بروز سوموار بوقت ۵ بجے شام بتوفیقِ خداوندی وبتائید وامدادِ حضرت صاحب الزمانؑ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتمؐ النبیّین و آلہٖؑ الطیّبین الطاھرین المعصومین المظلومین و لعنتہ اللہ علیٰ اعداء ھم اجمعین من یومنا ھٰذا الیٰ یوم الدین۔

تحفۂ یا علیؑ مدد